

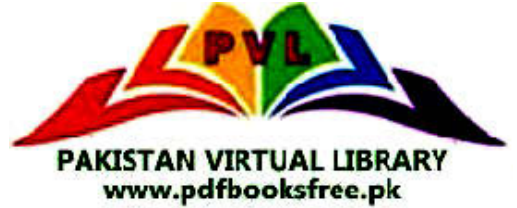
سنہری سانپ

PDFBOOKSFREE.PK

2

اقبال کاظمی

معیاری اور خوبصورت کتابیں
باجہتمام: محمد علی قریشی



جملہ حقوق محفوظ ہیں

مطبع ————— نیر اسد پریس لاہور
سرورق ————— ذاکر
کمپوزنگ ————— نوید بٹ
قیمت ————— 175/- روپے
کھل سیٹ ————— 350/- روپے

اس خبر نے پورے گاؤں میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ بگا اور کرامت پرانی حویلی میں
مرہہ پائے گئے تھے۔

یہ اطلاع اس طرح لی گئی تھی کہ قوم اور الٹی بخش وغیرہ حویلی کے وسیع و عریض صحن
میں پھیلی ہوئی جھاڑیاں صاف کرنے کے لئے کدالیں اور پھاؤڑے لے کر صبح چھ بجے ہی
اس پرانی حویلی میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے حویلی کے پچانک کے قریب سے جھاڑیاں
صاف کرنا شروع کیں۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ پھر وہ دم لینے
کو رکے تھے کہ حویلی کے اندر کوئی دردانہ کھلنے اور دھڑ سے بند ہونے کی آواز سن کر چوک
گئے۔ وہ حویلی کے برآمدے کی طرف دیکھنے لگے۔ برآمدے والا داخلی دردانہ پوری طرح
کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ ان سب کو اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ روز جب وہ حویلی سے باہر نکلے
تھے تو تباہی نے دردانہ بند کر کے اوپر لاکھڑا لگایا تھا۔

”تھوے!“ الٹی بخش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سیرا خیال ہے اندر کوئی
ہے۔ وہ دردانہ بھی کھلا ہوا ہے۔“

”ہاں۔ وہ کھلا ہوا دردانہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اندر کون ہو سکتا ہے؟“
قوم بولا۔

”کھل جب ہم لوگ واپس جا رہے تھے تو بکائین کے درخت کے نیچے ٹکا چھدہری بگا

میں کہا۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

”ایسا کرو..... تم اس طرف جاؤ۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔“ قیوم نے اپنی بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھئی۔ اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“ اپنی بخش نے جواب دیا۔

اور پھر کسی دروازے کی چڑاہٹ کی آواز سن کر وہ دونوں چوہک گئے۔

”آواز ادھر سے آئی تھی۔“ قیوم نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ ”چلو پہلے اسی طرف

چلتے ہیں۔“

وہ دونوں چھاؤڑے سنبھالے، راہداری میں مڑ گئے اور پھر ایک کمرے کا دروازہ کھٹے دیکھ کر رک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھل کر رک گیا ہو۔

”وہ جو کوئی بھی ہے اسی کمرے میں ہے۔“ قیوم نے سرگوشی کی پھر دروازے کی

طرف رخ کر کے اونچی آواز میں بولا۔ ”اندروں کوئی بھی ہے باہر آجاؤ۔ ہمیں پتہ چل گیا

ہے تم یہاں ہو۔“

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ قیوم دروازے کے بالکل قریب رک کر اندر سے کسی حم

کی آہٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کمرے کے اندر گہرا سناٹا تھا۔ قیوم نے ایک بار پھر

آواز دے کر پوچھا کہ کمرے میں کون ہے۔ لیکن اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس

نے مڑ کر اپنی بخش کو اشارہ کیا اور چھاؤڑے کو حملہ آور انداز میں دونوں باتھوں میں پھوکر

اندروں داخل ہو گیا۔ اپنی بخش بھی اس کے پیچھے اسی انداز میں اندر آ گیا تھا۔

کمرے میں نہر کی تھی۔ پچھلے روشتخان سے بہت کم روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ

دونوں ادھر ادھر دیکھتے رہے لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اپنی بخش دو قدم اور آگے بڑھا

تو اس کا پیروں پر کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ لڑکھار کر گرتے گرتے بچا تھا۔

”قیوم۔“ اجس نکال کر تلی جلاؤ۔ یہاں کوئی چیز پڑی ہوئی ہے۔“ اپنی بخش نے

سرگوشی کی۔

قیوم سرگٹ لٹھی کرتا تھا۔ اجس اس کی جیب میں موجود تھی۔ اس نے ایک تلی

جلائی اور پھر اس کی مدد میں روشنی میں جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ کر دونوں چپ اٹھے۔

کمرے کے گرد آلود فرش پر لگا پتہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پٹی پٹی سی تھیں

اور کرامت کھڑے تھے۔“ اپنی بخش نے کہا۔ ”انہوں نے ہمیں حویلی میں جاتے ہوئے اور پھر زندہ سلامت واپس آتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے یقیناً“ یہ سمجھ لیا ہوگا کہ حویلی میں آسیب دیکھو کچھ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہم لوگوں میں سے کسی کو ضرور کوئی نقصان پہنچتا یا ہم لوگ ڈر کر بھاگ رہے ہوتے۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ قیوم نے اسے گھورا۔

”انہوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ حویلی کے آسیب ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تو

انہیں کیا نقصان پہنچائیں گے یا یہ سوچا ہوگا کہ حویلی میں سرے سے کوئی آسیب ہی

نہیں۔ اور ہو سکتا ہے یہی سوچ کر وہ لوگ حویلی میں داخل ہوئے ہوں اور اس وقت بھی

کوئی اندر موجود ہو۔“ اپنی بخش نے کہا۔

”کتے تو تم ٹھیک ہو۔ آؤ۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔“ قیوم نے کہتے ہوئے اپنا چھاؤڑا

اٹھالیا۔

”تم فضل کو ساتھ لے جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے یا را۔“ اپنی بخش بولا۔

”بڑے بددل ہو۔“ قیوم نے اسے گھورا۔ ”کل تو ہم سب اندر گئے تھے۔ کیا تھا

وہاں....؟ کچھ ہوا تھا؟“

”یا رہو ڈھانچے۔“

”وہ انسانی ڈھانچے۔“ قیوم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”وہ ڈھانچہ تو ٹوٹا پھوٹا تھا۔ وہ کسی

کو کیا نقصان پہنچائے گا۔ اس کے علاوہ تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ چلو۔ تم ہی میرے

ساتھ چلو۔“

اپنی بخش نے اپنا چھاؤڑا اٹھالیا اور وہ دونوں جھاڑیوں میں چلتے ہوئے برآمدے میں

آگئے۔ دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اپنی

بخش کے چہرے پر خوف کے پچکے سے تاثرات تھے۔ جبکہ قیوم بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔

اس نے اپنی بخش کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

گزشتہ روز انہوں نے دروازے بند کر دیے تھے اور تمام کمرہ کھلی کھلی چھوڑ گئے تھے۔

لیکن اب وہ کمرہ کھلی بند تھیں جس کی وجہ سے حویلی کے اندر کا ماحول نیم تاریک تھا۔

”کون ہے۔ اندر کون ہے بھئی۔ جواب دو۔ کون ہے اندر۔“ قیوم نے اونچی آواز

دُعاچیجے گئے کے سینے پر کیسے چڑھ لیا۔“

”رب جانے۔“ اتنی بخش لے کہا۔ ”وہ دُعاچیجے اس کمرے میں بھی نہیں تھا جہاں کل ہم نے دیکھا تھا۔ گئے کی لاش دوسرے کمرے میں تھی اور دُعاچیجے بھی وہیں تھا۔“

”میرا خیال ہے اب ہمیں یہ کام چھوڑ کر گاؤں پہنچ جانا چاہیے۔ تاکہ گاؤں والوں کو ان کے بارے میں بتا سکیں۔“ قیوم نے کہا۔

”ہاں چلو۔ یہ کام بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔ ایمان نہ ہو ہم بھی کسی معیبت میں پھنس جائیں۔“ فضل نے کہا اور سب نے اپنے اپنے چھاؤڑے اٹھائے۔

قیوم اور اتنی بخش کے چھاؤڑے حویلی کے اندر ہی رہ گئے تھے۔ قیوم نے مڑ کر برآمدے کی طرف دیکھا تو وہ دروازہ خود بخود آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔ وہ لوگ پھانک سے نکل کر حیرتی سے بچے کی دھڑلان اترنے لگے۔

گاؤں پہنچنے میں انہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ سیدھے ملک صاحب کی حویلی پہنچے تھے۔ سکندر کیتھوں پر گیا ہوا تھا۔ انہوں نے ٹایپ کو سب کچھ بتا دیا۔ ٹایپ چرک گئی۔

تم لوگ قیوم کے گھر جا کر بیٹھو۔ میں وہیں آتی ہوں اور ہاں ابھی کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ وہاں تم لوگوں نے کیا دیکھا تھا۔ واپس آنے کا کوئی اور بہانہ کر دینا سمجھے۔“

ٹایپ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”قیوم تم کسی کو ڈیرے پر بھیج کر سکندر بھائی کو بلا لو۔ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دینی پڑے گی اور سکندر بھائی کا یہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔“

”فیک ہے پھولی بی بی۔“ قیوم بولا۔ ”ٹایپ نے جواب دیا۔ وہ لوگ چلے گئے اور ٹایپ اندر آئی۔“

”کیا ہوا۔ یہ لوگ تو پرانی حویلی میں کام کرنے گئے تھے۔ واپس کیوں آئے؟“ زمرس نے پوچھا۔

”وہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ ٹایپ نے کہا اور سرگوشیاں لہجے میں اسے وہ سب کچھ بتائے لگی جو قیوم سے سنا تھا۔ یکینہ بھی قریب کھڑی حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ ٹایپ آخر میں کہہ رہی تھی۔ ”جب میں نے کمرے میں وہ الماری کھولی تھی تو

اور چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات جیسے نمود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے اوپر ایک انسانی دُعاچیجے اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے کسی نے اپنے حریف کو زمین پر گرا کر دیوبج رکھا ہو۔ دُعاچیجے کے دونوں استخوانی ہاتھ گئے کے گلے پر تھے۔

ماہی کی تیل بچھ گئی۔ وہ دونوں جینے ہوئے کمرے سے باہر آگئے۔ اب درحالی میں راہداری میں غلط سمت میں مڑ گئے۔ اس کا احساس انہیں اس راہداری کے آخر میں پہنچ کر ہوا تھا۔ لیکن وہ واپس آنے کے بجائے دوسری راہداری میں مڑ گئے۔ اور وہاں سے جیسے ہی بیرونی دروازے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑے، ایک بار پھر جینے لگے۔ وہ رک کر پٹی پٹی سی نظروں سے راہداری کے گرد آلود فرش پر کرامت کی لاش کو دیکھنے لگے۔ کرامت کی آنکھیں بھی باہر کو نکلی تھیں اور چہرے پر استغاثی خوف و دہشت کے تاثرات تھے۔ وہ دونوں ایک بار پھر جینے ہوئے باہر کی طرف دوڑے۔

حویلی کے صحن میں کھڑے ہوئے فضل وغیرہ نے ان کی چیخوں کی آوازیں سن لی تھیں اور وہ سب اپنے اپنے چھاؤڑے سنبھالے خوفزدہ سے برآمدے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنی بخش اور قیوم کو اندر سے برآمدہ ہوتے دیکھ کر انہیں کسی قدر اطمینان ہوا کہ وہ زندہ سلامت واپس آگئے تھے۔ لیکن انہیں جینے دیکھ کر وہ بدحواس ضرور ہوئے تھے۔ وہ دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے سانس اس طرح پھولے ہوئے تھے جیسے مٹیوں دور سے بھاگتے ہوئے آ رہے ہوں۔

”کیا ہوا۔ کیوں چل رہے ہو۔“ فضل نے چیخ کر پوچھا۔ ”کیا ہے اندر۔ کوئی بھوت دیکھ لیا ہے کیا؟“

”بھوت نہیں لاشیں۔“ اتنی بخش نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”گئے اور کرامت کی لاشیں۔ وہ اندر مرے پڑے ہیں۔“

”گئے اور کرامت کی لاشیں۔“ فضل چرک گیا۔ ”میں کس نے قتل کیا ہے؟“

”وہ۔ وہ انسانی دُعاچیجے۔“ اتنی بخش بولا۔ ”گئے کے سینے پر چڑھا ہوا تھا کمرے میں اور کرامت کی لاش دوسری طرف راہداری میں پڑی ہے۔“

”وہ دونوں اندر کیا کرنے گئے تھے۔ لیکن وہ دُعاچیجے تو کل ہم سب نے دیکھا تھا۔ وہ لونا پھوٹا تھا۔ کھوپڑی کیس، ہانڈ کی پٹیاں کیس اور ناگوں کی پٹیاں کیس پھر وہ

ہی پوچھا۔

”ابائی تو ٹھیک ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہیں۔“ سیکند بولی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ٹایاب نے اسے بلانے کے لئے کوئی پیغام بھیجا تھا۔

”وہ دراصل میں نے سکندر بھائی کو پیغام بھیج کر بلایا تھا۔“ ٹایاب نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”خیر تو ہے کیا معاملہ ہے۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”سکندر بھائی۔ آپ کو معلوم ہے آج صبح میں نے چند آدمیوں کو حویلی کے صحن میں جمائیاں وغیرہ صاف کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر پہلے واپس آگئے ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”چھوڑی سعادت نے انہیں روکا ہوگا۔“ سکندر بولا۔ ”میں نے تو پہلے ہی جنہیں منع کیا تھا کہ ابھی یہ پہنچے گا ہادی شروخ مت کرو۔ یہ وقت ان باتوں کے لئے مناسب نہیں۔ سعادت کو تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ وہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دے گا۔“

”مسئلہ سعادت کا نہیں ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ اس نے کن انہیوں سے مافی مراں کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”حویلی میں جگے اور کرامت کی لاشیں پڑی ہیں۔ ان کی موت۔“

”کیا۔“ سکندر اچھل پڑا۔ ”جگے اور کرامت کی لاشیں۔ حویلی میں۔۔۔ وہ لوگ وہاں کیا کرتے گئے تھے؟“

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کل جب ہم لوگ حویلی سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں سعادت اور بکا دھڑو لے گئے۔ ہمیں زندہ سلامت واپس آتے دیکھ کر انہوں نے سمجھا ہوگا کہ حویلی میں کچھ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے چھوڑی سعادت نے ان دونوں کو حویلی میں چھپا دیا ہوگا تاکہ مجھے یا میرے آدمیوں کو حویلی میں داخل ہونے سے روک سکیں۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن وہ خود ہی موت کا شکار ہو گئے۔“ سکندر نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

”جی ہاں۔ اور میرا خیال ہے پولیس کو اس کی اطلاع دینی پڑے گی۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“ سکندر بولا۔ ”میں ذرا ابائی سے مل لوں۔ پھر بات

وہ دھانچہ نیچے کر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی اور ہڈیاں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ اور اب ان دونوں کا کتا ہے کہ وہ دھانچہ جگے کے سینے پر سوار اس کا گھلا دوپہا ہوئے تھا۔“

”یہ بگاڑی تو نہیں جس نے شادی میں تمہارے اوپر نمود پھینکا تھا اور تمہارے بھائی نے اسے گاؤں سے نکال دیا تھا۔“ سیکند نے کہا۔

”ہی ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ کیسے جانے کی بجائے سعادت کے ڈپڑے پر پناہ لے ہوئے تھا۔ ان جیسے لوگ آسانی سے برائی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ یہ لوگ اگرچہ اپنے آپ میں کچھ نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی شہ پر ہشتیوں کی ہشتیاں اجاڑ دیتے ہیں اور بھر قدرت ان سے ایسا انتقام لیتی ہے کہ وہ عبرت کا نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔“

”یہ لوگوں کا انجام تو پھر یہی ہوتا ہے۔“ سیکند نے کہا۔

ٹایاب کچھ کتا چاہتی تھی لیکن مافی مراں کو حویلی کے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ملک صلاح الدین جب سے تیار ہوئے تھے، حویلی میں لوگوں کی آمدرفت بدھ گئی تھی۔ ان کی عیادت کو آنے والوں میں گاؤں کے کسی کاری بھی تھے اور کسان زمیندار بھی۔ ملک صاحب نے ایک صاف ستھری زندگی گزار دی تھی۔ وہ ایک باخلاق اور پاکردار آدمی تھے۔ ان کے کردار پر انکی نہیں اٹھائی جاسکتی تھی۔ لوگوں کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ محبت اور ردا داری کا سلوک کیا تھا۔ سکندر اور تخت ان میں ہم کو نہیں تھی۔ ردیوں میں آوی تھے۔ ایک طرف اگر ان کا اٹھنا بیٹنا پڑے لوگوں میں حاد و دوسری طرف وہ گاؤں کے موہنی اور باغی کے ساتھ بھی زمین پر اتنی پائی مارے بیٹھے کپ شپ کرتے نظر آتے تھے۔ یہ ان کا کردار اور حسن اخلاق ہی تھا کہ ان کی بنیادی پر لوگ بے چین ہو گئے تھے اور گاؤں کا ہر شخص ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے چلا آ رہا تھا۔ مافی مراں کچھ دیر کرے میں ملک صاحب کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر باہر آ کر برآمدے میں سیکند کے پاس بیٹھ گئی۔ ٹایاب بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ملک سکندر بھی پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس طرح بلانے جانے پر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے سیکند۔ خیر تو ہے ابائی کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ اس نے اندر آتے

کرتے ہیں۔" وہ ملک صاحب والے کمرے میں چلا گیا۔

"کیا ہوا چھوٹی لی لی؟ یہ کچھ اور کرامت کی کیا بات ہے۔" ماسی مران نے ٹایپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دونوں مرگے ہیں ماسی۔ انکی لاشیں پرانی حویلی میں پڑی ہیں۔" ٹایپ نے کہا اور پھر اسے بھی تفصیل سے بتاتے گئے۔

"ہائے اللہ۔" ماسی مران ہاتھ لے ہوئے بولی۔ "وہ کم بخت حویلی میں کیوں گئے تھے۔ کچھ کتے ہیں لی لی۔ جس کی موت جیسے لکھی ہوئی ہے دیے ہی آئی ہے۔ اچھا سیکڑ بیٹی میں چلتی ہوں۔ مگر کے سارے کام ابھی پڑے ہوئے ہیں۔"

ماسی مران نے آخری الفاظ سیکڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہے اور اٹھ کر کمری ہو گئی۔ سیکڑ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ سب ہی جانتے تھے کہ ماسی مران اپنے گھر نہیں جائے گی۔ جب تک وہ یہ بات پورے گاؤں میں نہیں پھیلا دے گی اسے جین نہیں آئے گا۔

تقریباً "دس منٹ بعد سکندر" ملک صاحب کے کمرے سے نکل آیا۔

"تعموم وغیرہ کہاں ہیں؟" اس نے ٹایپ کی طرف دیکھا۔

"اپنے گھر میں ہے" اتنی بخش وغیرہ بھی وہیں ہیں۔ چلتے۔ وہیں چلتے ہیں۔" ٹایپ

نے کہا۔

سکندر کچھ دیر سیکڑ سے باتیں کرتا رہا پھر ٹایپ کے ساتھ حویلی سے باہر آ گیا۔

ماسی مران کے بارے میں ان کا خیال درست نکلا تھا۔ کچھ اور کرامت کے بارے میں خبر پور گاؤں میں کھیل چکی تھی۔ ایک دو آدمیوں نے راستے میں سکندر کو روک کر پوچھا بھی تھا۔

تعموم کے گھر میں اتنی بخش وغیرہ بھی موجود تھے۔ تعموم کی بہن رابعہ، ٹایپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ رابعہ کو اس نے شادی میں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت ٹایپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تعموم کی بہن ہے۔ رابعہ تعموم سے دو سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی تعموم کی طرح دراز قامت اور سفید جسم کی مالک تھی۔ کھلتی ہوئی رحمت اور چہرے کے نقوش چھپے تھے۔ اس کی عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔ بڑی حسین لڑکی تھی۔

ان کی والدہ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ مگر رابعہ ہی نے سنبھال رکھا تھا۔ ان کا باپ اب بھی گھروں میں پانی بہراتا تھا۔ تعموم سیکڑوں پر کام کرتا تھا۔ شادی والے روز بھی رابعہ ٹایپ سے بڑی گرتجوشی سے ملی تھی اور اس وقت تو ٹایپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر وہ خوشی سے چھوٹی نہیں سا رہی تھی۔

سکندر، تعموم وغیرہ سے حویلی والے واقعہ کے بارے میں تفصیل معلوم کرتا رہا اور ٹایپ رابعہ سے باتیں کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد سکندر اٹھ کر کمرہ ہو گیا۔

"تعموم! اتنی بخش! تم دونوں سڑک پر پتھر۔ میں گاؤں لے کر آتا ہوں۔" اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں سکندر بھائی۔" ٹایپ نے کہا۔

"نہیں۔ تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" سکندر نے جواب دیا۔ "میں پولیس کو لے کر سیدھا پرانی حویلی چلا جاؤں گا۔ تم اگر جاہلو تو کھینچے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں آجاؤں گی۔" ٹایپ نے کہا۔ وہ بھی گھر جانا چاہتی تھی لیکن رابعہ نے اسے روک لیا۔

"آپ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں۔ چائے پیائے بغیر تو نہیں جائے دوں گی۔" رابعہ نے کہا۔

ٹایپ دوبارہ چاہائی کے اوپر بیٹھ گئی۔ رابعہ باورچی خانے میں جا کر چائے بنانے لگی۔ باورچی خانہ کیا تھا سوکھی ہوئی شاخوں اور گھاس پھوس کا ایک بڑا سا سائبان تھا۔ جس کے نیچے چولہا وغیرہ بنایا ہوا تھا اور ایک چھوٹے سے چہوڑے پر کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ جلد ہی چائے بنا کر لے آئی۔

چائے کے دوران رابعہ ٹایپ کو اپنا کشیدہ کاری کا کام دکھاتی رہی۔

کڑھائی کا بڑا خوبصورت کام تھا۔ اس سے ڈبل بیڑے کی چادر اور کچھ کے دو غلافوں پر مشتمل ایک سیٹ ٹایپ کو تحفہ میں دیدیا۔ ٹایپ بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے کڑھائی کا کام دیکھ رہی تھی۔ کپڑوں پر باریک کڑھائی اور کشیدہ کاری بھی ایک ہنر ہے جو شہروں میں تو تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ شرکی لڑکیوں کو اب ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ گاؤں، رساتوں میں یہ فن ابھی زندہ ہے۔ گاؤں کی رہنے والی کوئی لڑکی

لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ اپنے بچوں کو تو وہ تعلیم دلانے کے لئے امریکہ، برطانیہ، روس اور نجانے کہاں کہاں بھیج دیتے ہیں لیکن غریبوں کے لئے ان لوگوں نے تعلیم کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ خاص طور پر جاگیردار، ڈبیرے اور زمیندار نہیں چاہتے کہ ان کے ہاروں اور مزارعوں کے بچے تعلیم حاصل کریں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ بچے تعلیم حاصل کر گئے تو ان کے کھیتوں میں لوں کل چلائے گا۔ زمین کا سینہ چر کر ان کے لئے اناج کون پیدا کرے گا اور صنعت کار یہ سمجھتے ہیں کہ مزدوروں کے بچے پڑھ لکھ گئے تو ان کی مٹھیں کون چلائے گا۔ مزدوروں کے بچوں کے پڑھ لکھ جانے سے مٹھیں کا پیسہ رک گیا تو ان کے گھروں میں دولت کے انبار کیسے لگیں گے۔ اسی لئے یہ لوگ نہیں چاہتے کہ غریبوں کے بچے تعلیم حاصل کریں۔ گاؤں کا ڈبیرہ یا شہر کا صنعت کار۔ ان سب کی ذہنیت ایک ہے۔ غریبوں کا خون چوس کر اپنے گھروں میں دولت کے انبار لگانا۔ برعکس۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں شاید کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی ہوں۔ اب میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی کسی وقت۔ تمہارے پاس بیٹھ کر ڈیڑھ ساری باتیں کروں گی۔"

"میں بھی آپ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب آپ اس حویلی میں منتقل ہو جائیں گی نا تو میں بھی آپ کے پاس آکر رہوں گی۔"

"اس پرانی حویلی میں۔" نایاب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں ڈر نہیں لگے گا وہاں؟"

"کیسا ڈر۔" راجہ بولی۔ "جب آپ کو وہاں جاتے ہوئے کوئی ڈر نہیں لگتا تو مجھے کیوں لگے گا۔"

"نمیک ہے۔ میں اس حویلی میں کام کروا لوں، قیوم اور تمہارے لبا سے کہہ کر تمہیں اپنے پاس لے جاؤں گی۔ اچھا بھئی۔ اب چلوں۔ بہت دیر ہو گئی۔ اس سیٹ کے لئے بہت بہت شہریہ۔" نایاب نے کہتے ہوئے سڑک کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

راجہ نے مسکراتے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

نایاب، راجہ کے گھر سے نکل کر دو تین گھنٹوں میں گھومتی ہوئی ملک صاحب کی حویلی

ایسی نہ ہوگی جسے کڑھائی اور کشیدہ کاری نہ آتی ہو۔

نایاب تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھی رہی۔ اس دوران ہی اس نے اپنے ہارے میں نایاب کو بہت کچھ بتایا تھا۔ دو سال پہلے اس کی معافی ہوئی تھی۔ لڑکا ان کی برادری کا ہی تھا۔ ایک سال بعد شادی کا پروگرام طے ہوا تھا۔ لیکن مگنی کے چار مہینے بعد راجہ کا بھتیجہ پڑوس کی بستی میں رہنے والی ایک لڑکی کو بھگ کر لے گیا۔

"ہارے!" نایاب کے لیے میں حیرت تھی۔ "وہ کونسا تھا تو تمہیں پیاری سی حسین لڑکی کو چھوڑ کر کسی اور لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا۔"

"یہ تو سن کی بات ہے چھوٹی بی بی۔" راجہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اے وہ لڑکی مجھ سے زیادہ اچھی لگی ہوگی۔ چلا گیا اسے کہ سا بے انہوں نے شہر جا کر شادی کر لی تھی۔ اب وہیں رہ رہے ہیں۔"

"اور تمہارا کیا ہوا۔ کس اور رشتہ نہیں ہوا؟" نایاب نے پوچھا۔

"رشتے تو بہت آتے رہتے ہیں لیکن میں نے طے کر لیا ہے کہ اب شادی ہی نہیں کروں گی۔" راجہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے۔ یہ کیا بات ہوئی۔" نایاب نے اسے گھورا۔ "مہاڑ بھی زندگی کا بوجھ کیسے اٹھاؤ گی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح انکی ذمہ دہ سہو گی۔ لوگ تمہیں ذمہ دہ رہنے دیں گے۔ تمہیں قدم قدم پر انسان نما بھیڑیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیسے مقابلہ کرو گی ان کا۔" "آپ بھی تو ذمہ دہ ہیں اور ان بھیڑیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔" راجہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "حقیقت تو یہ ہے چھوٹی بی بی، آپ کی شخصیت اور کردار نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ عورت کمزور نہیں ہے۔ اگر عورت ٹھانے تو بڑی سے بڑی قوت کو بھی اپنے قدموں میں جکھنے پر مجبور کر سکتی ہے۔"

"تمہاری باتیں تو بڑی فلسفیانہ ہیں۔" نایاب نے کہا۔

"میں نے اس قصبے کے بانی اسکول سے میٹرک پاس کیا ہے۔" راجہ مسکرائی۔ "میں تو فوراً رے کارلج میں داخلہ لینا چاہتی تھی لیکن سب نے مخالفت کی اور لبا نے داخلہ نہیں لینے دیا۔ ایک کی لادری کی اولاد اعلیٰ تعلیم کیسے حاصل کر سکتی ہے۔"

"شاید تم نمیک کہتی ہو۔" نایاب گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "تعلیم پر بھی بڑے

آئی۔ اسے راستے میں پتہ چل گیا کہ پولیس کی ایک جپ اور ملک سکندر کی کار پرانی حویلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔ ٹایاب نے راجہ کا دیا ہوا ہسٹر کا سیٹ زمزم کے حوالے کیا اور رکے بغیر حویلی سے باہر آئی۔

گاؤں کے لوگوں کو یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ پرانی حویلی میں بگڑے اور کرامت کی لاشیں لی ہیں اور اب انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ملک سکندر پولیس کو لے کر وہاں پہنچ گیا ہے۔ لیکن لوگوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ گزشتہ روز ٹایاب، قدیم دنیو کے ساتھ تقریباً دو گھنٹے اس حویلی میں رہی تھی۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ حویلی کے ایک کمرے کی الماری سے ایک انسانی ڈھانچہ برآمد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ٹایاب اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن بگڑے اور کرامت اس حویلی میں گئے تو پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے۔

گاؤں والوں میں ایک بار پھر یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ ٹایاب مافوق الفطرت ہے اور حویلی میں رہنے والے آسیب بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن بیشتر لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کے خیال میں چوہدری جیلی کی طرف سے یہ ہم ٹایاب کی کروار کشی کے لئے چلائی گئی تھی۔ ایک بات سے برسر حال سب ہی متفق تھے کہ اس قسم کے پراسرار واقعات ٹایاب کے آنے کے بعد ہی شروع ہوئے تھے اور کسی نہ کسی طور پر ٹایاب کا ان واقعات سے تعلق رہا تھا۔

ٹایاب گاؤں سے نکل کر کیتھن میں پہنچ چکی تھی۔ وہ ابھی پرانی حویلی سے دور ہی تھی کہ دو گھڑ سواروں کو دائیں طرف سے حویلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک تو چوہدری سعادت تھا۔ سفید گھوڑے پر اور دوسرے کو ٹایاب نہیں پہچان سکی تھی۔

وہ دونوں گھوڑے بیٹے پر ایک درخت کے نیچے رک چکے تھے۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے اور انہوں نے گھوڑوں کی لگائیں درخت سے باندھ دیں۔ اس دوران ٹایاب بھی وہاں پہنچ گئی۔ چوہدری سعادت کے ساتھ ملنگی تھا۔ یہ بھی ان چند حرام زادوں میں سے ایک تھا جنہوں نے سعادت کی شہ پر گاؤں کے بعض لوگوں کی زندگی اتار کر رکھی تھی۔

ٹایاب لاہروا سی کا اعداد کرتی ہوئی ان کے قریب سے گزر گئی۔ نہ تو اس نے سعادت کو مخاطب کیا تھا اور نہ ہی سعادت کچھ بولا تھا۔ ٹایاب ذرا سا گھوم کر حویلی کے

گیت کی طرف چلی گئی۔ گیت کے سامنے ایک طرف سکندر کی گاڑی اور اس کے قریب ہی پولیس کی جپ کھڑی تھی۔ ایک کانٹیلین جپ سے نیک لگائے کھڑا سرگت کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے ٹایاب کو دیکھ کر سلام بھی کیا تھا۔

ٹایاب چھانک میں داخل ہو گئی۔ برآمدے کے سامنے سب انسپکٹر اشرف، ملک سکندر اور چار دیگر پولیس اہلکار کھڑے تھے جن میں ایک ہیڈ کانٹیلین تھا اور تین کانٹیلین۔ ٹایاب ان کے قریب پہنچی ہی تھی کہ چوہدری سعادت اور ملنگی بھی اندر آ گئے اور بھائیوں میں چلے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ ٹایاب نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلک رہا تھا۔ اور یہ خوف غالباً ان آبیروں کا تھا۔ جو حویلی میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔

”آپ لوگوں نے دیکھیں وہ لاشیں؟“ ٹایاب نے سب انسپکٹر اشرف سے پوچھا۔
 ”نہیں بھئی۔“ سب انسپکٹر کے بجائے ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ اندر داخل ہوتے ہوئے ڈر رہے ہیں، پتہ نہیں کس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے۔ ویسے بھی اندر سے عجیب سی آوازیں آرہی ہیں۔ کبھی کوئی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی زور سے بند ہونے کی۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی اندر داخل ہونے سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”چلے۔“ میں آگے چلتی ہوں۔ آپ لوگ میرے ساتھ آئیے۔“ ٹایاب کہتے ہوئے برآمدے میں آ گئی۔

سکندر نے سب انسپکٹر کی طرف دیکھا اور سب انسپکٹر مڑ کر سعادت کی طرف دیکھنے لگا۔

”آئیے چوہدری صاحب۔ آپ بھی چلے۔“ وہ بولا۔

”میں میںیں ٹھیک ہوں۔ آپ جا کر معائنہ کر آئیں۔“ سعادت نے جواب دیا۔

”سہان خان۔ چل نازرا آگے۔“ سب انسپکٹر نے ہیڈ کانٹیلین سے کہا۔

ہیڈ کانٹیلین نے دو کانٹیلینوں کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں راغلیں تان کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے عاز پر جا رہے ہوں۔

ٹایاب دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ سکندر نے آگے بڑھ کر دروازے کا اوپر

”مجھے غلط بیانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ٹایاب کے لمبے میں ناگواری تھی۔
 ”مقیم وغیرہ نے حویلی میں لاشیں دیکھی تھیں تو وہ لاشیں حویلی ہی میں موجود ہوں گی۔ میں
 شاید بھول رہی ہوں کہ انہوں نے کس کمرے کا ذکر کیا تھا۔ میرے ساتھ آئیے۔“
 وہ اس کمرے سے نکل کر راہداری میں آئے اور پھر تیسرے کمرے میں انہیں فرش
 پر پڑی ہوئی لاش مل گئی۔ انسانی ڈھانچہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ اور اس کے
 دونوں ہاتھ لگے لگے پر تھے۔ لاش اور ڈھانچے کو دیکھ کر سب انپکڑ کاپ اٹھا۔ سڑی
 کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی چلی گئی۔ ٹایاب کے جسم میں بھی سنسنی کی
 ایک لہر سی دوڑ گئی۔
 ”دیکھا۔ دیکھا آپ نے۔“ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے
 بولی۔

”لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ ڈھانچہ اس کمرے میں گر کر بکھر گیا تھا۔ لیکن یہ۔۔۔۔۔“
 سب انپکڑ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سکندر کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر لاش اور ڈھانچے
 کا محاسبہ کرنے لگے۔

”میں اس کی کوئی تجویز پیش نہیں کر سکتی گی کہ یہ ڈھانچہ جڑا کیسے اور اس نے
 گئے کو کیسے دوچا۔ برصالح یہ دونوں آپ کے سامنے ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ گئے کو قتل کر کے یہ ڈھانچہ اس کے اوپر ڈال دیا گیا ہو تاکہ
 قتل کی واردات کو کوئی اور رنگ دیا جاسکے۔“ سب انپکڑ بولا۔

”یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ
 مارٹم کی رپورٹ سے پتہ چل جائے گا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”بیجان خان۔ یہ ڈھانچہ اٹھاؤ تا ذرا اس لاش کے اوپر سے۔“ سب انپکڑ نے ہیڈ
 کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیجان خان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے یہ حکم کانسٹیبلوں کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں
 کانسٹیبلوں کے چہرے بھی قہقہے ہو گئے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ہنچ رہے تھے۔

”ذرا کیوں رہے ہو۔“ بیجان خان نے کہا۔ ”ہڈیاں ہیں۔ کوئی خوفناک ورنہ نہیں جو
 جنہیں کاٹ لے گا۔ ہماؤ اسے۔“

والا کنڈا کھول کر دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا
 گیا۔

ٹایاب سب سے پہلے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سکندر، پھر ہیڈ کانسٹیبل اور
 دونوں کانسٹیبل اور آخر میں سب انپکڑ اشراف بانی دو کانسٹیبل رانگلیں سنبھالے برآمدے
 میں کھڑے رہ گئے تھے۔ چھوڑی سادہ اور ملنگی برآمدے کے آخری کنارے پر کھڑے
 تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ اگر کوئی معمولی سی بات بھی ہو تو ہماگ کہنے ہوں گے۔

دروازے میں قدم رکھتے ہوئے سب انپکڑ اشراف نے بھی ریو اور نکال لیا تھا۔
 حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی کسی حد تک خوفزدہ تھا۔ وہ پچھلے بارہ سال سے پولیس سروس میں
 دلیر آدمی تھا۔ بڑے بڑے مای گرائی مجرموں سے اس کا ساہتہ پڑا تھا۔ وہ کبھی خوفزدہ
 نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ یہاں مقابلہ انسانوں سے نہیں، پراسرار
 ناہیدہ قوتوں سے تھا۔ سب انپکڑ بھی جانتا تھا اس حویلی میں روحوں کا ایسا تھا۔ اور وہیں
 یا آسیب کسی کو نظر نہیں آتے جو ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔

ٹایاب بے خوفی سے سب سے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ سیدھی اس کمرے میں
 داخل ہو گئی جس کے پچھلی طرف ایک اور کمرہ تھا جہاں پہلے روز اس نے جاہزہ نامی اس
 لڑکی کی لاش دیکھی تھی اور گزشتہ روز الماری سے انسانی ڈھانچہ اس پر گر تھا۔

وہ سب اندر آگئے تھے۔ پولیس والے خاصے سے ہوئے تھے۔ سکندر کے ہاتھ میں
 ٹارچ تھی جسے اس نے روشن کر لیا۔ ٹارچ کی روشنی اندرونی دروازے پر پڑ رہی تھی جو بند
 تھا۔ ٹایاب نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ دروازہ اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر آواز پیدا
 کئے بغیر کھل گیا۔ وہ سب اندر داخل ہو گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ الماری کے دونوں پہن بھی کھلے ہوئے تھے۔ لیکن فرش پر اس انسانی
 ڈھانچے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

”وہ ڈھانچہ اس الماری سے برآمد ہوا تھا اور یہاں فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔“
 ٹایاب نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ سب انپکڑ نے کہا۔ ”سوچ لیں ٹایاب بی بی۔ بات
 اب پولیس تک پہنچ گئی ہے اور۔۔۔۔۔“

وہ لوگ اس کمرے سے نکل آئے اور ایک راہدار میں سے نکل کر دوسری راہداری میں آگئے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اشرف نے رک کر نارنج کی روشنی اندر ڈالی اور پھر چوک گیا۔ دروازے سے چند فٹ آگے کمرے میں ایک آؤٹک راقتل پڑی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں آگیا۔ اور نارنج کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فرش پر ادھر ادھر گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد تیرہ تھی۔ چھت اور دیواروں پر گولیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی نے بدحواسی میں اندھا دھند چاروں طرف فائرنگ کی تھی۔ سب انسپز کے اشارے پر ایک کانسٹیبل کے راقتل کو تال کی طرف سے پکڑ کر اٹھالیا اور دوسرا کانسٹیبل گولیوں کے خول چننے لگا۔

وہ لوگ کمرے سے نکل آئے اور دو راہداروں میں محوم کر اس راہداری میں آگئے جہاں کرامت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس لاش کی حالت بھی بگے کی لاش سے مختلف نہیں تھی۔ لاش سے پانچ فٹ آگے ایک آؤٹک راقتل پڑی تھی اور یہاں بھی گولیوں کے کئی خول بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر گولیوں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ سب انسپز اشرف لاش کا معائنہ کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہو گیا اور سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس لاش کو اٹھا کر باہر برآمدے میں لے جاؤ اور وہ دوسری لاش بھی اٹھاؤ۔ یہ لاش باہر چھوڑ کر اسی کمرے میں آجانا۔"

دونوں پولیس والوں نے جب کہ لاش اٹھالی۔ وہ لاش کلاسی کے تختے کی طرح اکڑ چکی تھی۔ بیرونی دروازے تک وہ سب ان پولیس والوں کے ساتھ آئے تھے۔ پولیس والے تو لاش کو لے کر باہر نکل گئے۔ اور وہ لوگ پائیں طرف کی راہداری میں مڑ گئے۔ اور جب وہ لوگ اس کمرے میں داخل ہوئے، جہاں بگے کی لاش پھوٹی تھی، تو سب ہی الجھل پڑے تھے۔ بگے کی لاش الجھل چکی تھی لیکن وہ ڈھانچہ غائب تھا۔

ٹایاب بھی پہلی پہلی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈھانچہ بگے کی لاش سے مگر کر اس طرح بکھرا تھا کہ اس کی پٹیاں الگ الگ ہو گئی تھیں اور سب انسپز اشرف کے ہاتھ سے مگر کر کوپڑی فرش پر لڑھکتی ہوئی دیوار کے ساتھ جا گئی تھی۔ لیکن اب نہ تو وہاں کوپڑی نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی اور پڑی۔

"یہ حویلی تو واقعی آجیب زدہ ہے۔" سب انسپز اشرف بولا۔ اس کے لیے میں ہکا

دونوں کانسٹیبلوں نے اپنی رائٹیں سیمان خان کے حوالے کر دیں اور ڈھانچے کو ہٹانے کے لئے آہستہ آہستہ لاش پر بھٹنے لگے۔ ان کے ہاتھ ابھی ڈھانچے سے دور ہی تھے کہ پٹیاں بھٹنے کی کڑکڑاہٹ کی بجلی کی آواز کے ساتھ وہ ڈھانچہ بکھر کر بگے کی لاش پر سے نیچے گر گیا۔

دونوں کانسٹیبل چیخ کر چیخے ہٹ گئے۔ سب انسپز اشرف، ٹایاب اور ملک سکندر بھی غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ٹایاب کی آنکھوں میں دھشت سی ابھرنی۔ سب انسپز اشرف بھی دھشت زدہ نظروں سے ڈھانچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریوالور اس طرح تان رکھا تھا کہ اب اگر ڈھانچے نے حرکت کی تو اسے گولی مار دے گا۔ مگر ڈھانچے نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بگے کی لاش پر سے مگر کر بائیں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کی کوپڑی لاش سے تقریباً تین فٹ دور گری تھی۔

"میرا خیال ہے۔ یہ ڈھانچہ ہوا سے نیچے گر گیا ہوگا۔ آپ لاش کو دیکھیں اشرف صاحب۔ ان بکھری ہوئی پٹیاں سے نہ ڈریں۔" ملک سکندر نے سب انسپز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سب انسپز نے جبکہ کر بھٹتے ہوئے فرش پر پڑی ہوئی کوپڑی اٹھالی اور الٹ پلٹ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ جب اس نے کوپڑی اٹھائی تھی تو وہ بہت لمبی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے برف کا گڑھا اٹھالیا ہو۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کوپڑی میں حدت پیدا ہونے لگی۔ حدت بتدریج بڑھ رہی تھی۔ کوپڑی اس حد تک گرم ہو گئی کہ اسے ہاتھ میں پکڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ اشرف کی تعجب اور انکھیں پر جلیں ہونے لگی جیسے اس نے دیکھا ہوا انگارہ ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ اس نے کوپڑی نیچے پھینک دی اور اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ کوپڑی گرد آلود فرش پر لڑھکتی ہوئی دیوار کے ساتھ ٹک کر رک گئی تھی۔

سب انسپز اشرف جبکہ کر نارنج کی روشنی میں لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ بگے کی آنکھیں خوف سے پٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر بھی بے پناہ خوف کے تاثرات جیسے بھجھ ہو کر رہ گئے تھے۔ چند لمحوں بعد سب انسپز کھڑا سا لیتا ہوا سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"دوسری لاش کہاں ہے؟" اس نے ٹایاب سے پوچھا۔ "قوم نے بتایا تھا کہ دوسری لاش کسی راہداری میں پڑی تھی۔ آئیے دیکھتے ہیں، کہاں ہے۔" ٹایاب نے کہا۔

کی ڈراسے بازی ہے اور یہ لڑکی حویلی پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر ہاتھ جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ لوگ کل دو تین گھنٹے حویلی میں رہے تھے۔ کسی کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ اس لڑکی نے حویلی کی صفائی وغیرہ کا پروگرام بنایا ہے۔ میں نے رات ہی کو کچے اور کرامت کو یہاں بھیج دیا تھا کہ اس کے آدمی صبح یہاں آئیں تو انہیں ڈرا دھمکا کر بیٹھا دیا جائے۔"

"آپ نے صبح یہاں آکر معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ لوگ کس حال میں ہیں۔" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں صبح چھ بجے یہاں آیا تھا۔" سعادت نے جواب دیا۔ "میں نے باہر سے آواز سن دی تھی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو میں سمجھا کہ یہ دونوں حویلی چلے گئے ہوں گے۔ پھر آٹھ بجے کے قریب مجھے پتہ چلا کہ انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ردحوں اور آسیب کا ڈرامہ ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ یہ لڑکی زبردستی حویلی پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اس نے گاؤں میں اپنے چند حمایتی بھی پیدا کر لئے ہیں۔"

"چوہدری صاحب۔" سب انسپکٹر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "آپ ایسا کریں کہ حویلی کے اندر کا ایک پتھر لگا کر آئیں۔ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو میں آپ کے کہنے پر ان کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کروں گا۔"

"مجھے ڈر پوک سمجھتے ہو۔" چوہدری سعادت نے اسے گھورا۔ "آؤ ملنگی میرے ساتھ آؤ۔"

چوہدری سعادت کو اگرچہ یقین ہو چکا تھا کہ حویلی میں کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے لیکن اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا اور ملنگی کے چہرے پر خوف کے تاثرات واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے ان دونوں نے بیڑوں سے ہتھول نکال لئے تھے۔

وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ایک منٹ گزر گیا۔ دو منٹ گزر گئے۔ اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب لوگ برآمدے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب انسپکٹر اشرف کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کا مشربھی ہے اور کرامت جیسا ہوا تو اس کے لئے جوابدہی مشکل ہو جائے گی۔

ساخرف تھا۔ "لاش اٹھاؤ اور جلدی نکلو یہاں سے۔"

وہ دونوں پولیس والے باہر ہی رہ گئے تھے۔ غالباً ڈر کے مارے واپس نہیں آئے تھے۔ سیمان خان نے راتنیل سب انسپکٹر اور نایاب کے حوالے کر دیں اور سکندر کے ساتھ مل کر لاش اٹھانے لگا۔

وہ بچے کی لاش کو باہر لے آئے۔ چوہدری سعادت اور ملنگی برآمدے کے فرش پر پڑی ہوئی کرامت کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ بچے کی لاش فرش پر رکھی گئی تو سعادت فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ چند لمحوں لاش کو دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

"اشرف صاحب۔" وہ سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس حویلی میں کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے۔ میرے ان دوستوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے اور اس کی ذمہ داری یہ لڑکی اور ملک سکندر ہیں۔"

"تم ہوش میں تو ہو چوہدری۔" ملک سکندر نے اسے گھورا۔ اس کا لہجہ پر سکون تھا۔ "تم ہم پر قتل کا الزام لگا رہے ہو۔ ایسا نہ ہو یہ الزام تمہارے گلے کا پھندہ بن جائے۔"

"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔" چوہدری سعادت نے جواب دیا۔ "ردحوں کا ڈرامہ تم دونوں نے رچا رکھا ہے حویلی پر قبضہ کرنے کے لئے۔ اگر اس حویلی میں بد روحمیں یا بھوت موجود ہیں تو وہ تمہیں کچھ کیوں نہیں کہتے۔ میرے آدمیوں کو قتل کر کے الزام بد روحوں پر لگا رہے ہو۔ میں تم دونوں کو نہیں سمجھوں گا۔"

"دو صبح چوہدری صاحب دھیرن۔" سب انسپکٹر اشرف بولا۔ "یہ فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ ان دونوں کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ لیکن اس بات کی گواہی میں بھی دوں گا کہ اس حویلی میں آسیب موجود ہیں۔"

"حویلی میں آسیب ہوتے تو تم اور یہ باقی لوگ زندہ کیسے باہر آجاتے۔" چوہدری سعادت نے کہا۔ "یہ ان لوگوں کی کوئی چال ہے اور تم بھی ان کا ساتھ دے رہے ہو۔"

سب انسپکٹر مسکرا کر رہ گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"چوہدری صاحب! پہلے آپ یہ بتائیے کہ یہ دونوں حویلی میں کیوں آئے تھے؟"

"میں نے سمجھا تھا انہیں۔" چوہدری سعادت نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں حویلی میں آتے جاتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ حویلی میں کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے۔ یہ سب ان

”کلیا ہوا چہدری جی۔“ سب انسپکٹر اشرف نے سعادت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”حویلی کے اندر تو کوئی نہیں تھا۔ لیکن آوازوں سے لگ رہا تھا جیسے۔“

”دیکھ لوں گا۔“ حمیس بھی دیکھ لوں گا۔ ”چہدری سعادت اس کی طرف دیکھتا ہوا چیخا اور ایک جھگٹے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔
چہدری سعادت اور ملنگی لوٹھڑاتے اور اپنے جھوسوں کو سلاتے ہوئے حویلی سے باہر چلے گئے۔ سب انسپکٹر اشرف انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”یہ میری زندگی کا لوکا ترین تجربہ ہے۔“ وہ ٹایپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس حویلی میں واقعی کوئی بافوق الفطرت ہستیاں ہیرا کئے ہوئے ہیں اور وہ پراسرار ہستیاں آپ کی دوست بن چکی ہیں۔ کیا آپ بتائیں گی کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”وجہ۔“ ٹایپ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”ساتھ ستر سال پہلے اس حویلی میں ایک قتل ہو گیا تھا۔ میں نے اس لڑکی کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جسے دھوکے سے اس حویلی میں لاکر پہلے بے آہود کیا گیا اور پھر خنجر کے پے در پے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“

”اس لڑکی کو ساتھ ستر سال پہلے قتل کیا گیا تھا اور آپ نے اس کی لاش دیکھی تھی؟“ سب انسپکٹر کے لیے میں بے پناہ حیرت تھی۔

”ہاں۔ اسے بھی آپ ایک پراسرار واقعہ کہہ سکتے ہیں۔“ ٹایپ نے کہا۔ ”آج یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ سب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ پراسرار واقعات دراصل اس ایک خوفناک واقعے کی کڑیاں ہیں جو ساتھ ستر سال پہلے اس حویلی میں رونما ہوا تھا۔“

”آپ کو اس قصے میں آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ساتھ ستر سال پہلے اس حویلی میں کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہوا تھا؟“ سب انسپکٹر نے کہا۔

”اکثرچہ طویل مدت گزر چکی ہے لیکن آج بھی گاؤں کا ہر شخص اس واقعہ کے بارے میں جانتا ہے۔“ ٹایپ نے کہا۔ ”اس قسم کے واقعات بھلائے نہیں جاتے اور جہاں

اور پھر دفعتاً وہ سب اچھل پڑے۔ برآمدے والا دروازہ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ خود بخود بند ہوا تھا۔ ٹایپ حیرتی سے آگے بڑھی مگر دروازہ دھڑک کی آواز سے بند ہو گیا۔ وہ دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔

ان سب کے چروں پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ اور پھر اندر سے فائرنگ کی آوازیں سن کر ٹایپ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

سب انسپکٹر اشرف کے چہرے پر مسمی تشویش کے تاثرات ابھر آئے۔ سبحان خان اور دونوں کانٹیل بھی راتھیں سنبھالے خوفزدہ سی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

فائرنگ بند ہو گئی اور اب اندر سے چہدری سعادت اور ملنگی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے تو یہ آوازیں حویلی کے اندر دھن سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں پھر رفتہ رفتہ قریب آتی گئیں۔

دروازہ اچانک ہی کھل گیا۔ وہ سب اندر کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں کانٹیلوں نے راتھیں تان لیں۔

چہدری سعادت اور ملنگی چیخنے ہوئے اور گرتے پڑتے باہر کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے کسی حملے سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں اور اس طرح پیچ اور ہلہا رہے تھے جیسے کوئی ناویدہ قوت ان کی پٹائی کر رہی ہو۔

وہ دونوں گرتے پڑتے اور چیخنے ہوئے باہر آکر برآمدے میں گر گئے، اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑک کی آواز سے بند ہو گیا تھا۔

سب انسپکٹر اشرف اور سکندر فوراً ہی آگے بڑھ کر سعادت اور ملنگی کو دیکھنے لگے۔ وہ دونوں فرش پر لوٹ رہے تھے اور بری طرح پیچ رہے تھے۔ سکندر چہدری کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سب انسپکٹر اشرف نے ملنگی کو گرفت میں لے لیا تھا۔

وہ بڑی مشکل سے انہیں قابو کر سکے تھے۔ کافی دیر تک وہ دونوں کراہتے رہے۔ دونوں بار بار اپنے جسم کے مختلف حصوں کو سلا رہے تھے۔

پولیس جیب کے روانہ ہونے کے بعد ٹایاب اور سکندر بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہیں سرک کی طرف سے ہوتے ہوئے ایک طویل پتھر کاٹ کر گاڑی کی طرف آنا پڑا تھا۔ چوہدری سعادت اور ملنگی گاڑی پہنچ چکے تھے۔ گاڑی والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ پرانی حویلی میں بعض نابیدہ قوتوں نے ان کی مصالحت کی تھی اور اب وہ چوہدری کی بیٹائی کر رہے تھے۔ گاڑی کے پیسیوں لوگ ان کی حویلی کے سامنے جمع تھے۔



اس واقعہ کو کئی روز گزر گئے۔

پرانی حویلی میں کام ہو رہا تھا۔ قیوم کی سربراہی میں تقریباً ایک درجن آدمی اس حویلی میں کام کر رہے تھے۔ اس دوران وہاں نہ کوئی اور پراسرار واقعہ پیش آیا تھا اور نہ ہی چوہدری فیملی کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت ہوئی تھی۔ ٹایاب بھی دن میں ایک بار حویلی کا پتھر ضرور لگا لیتی تھی۔ کسی روز تو وہ کئی کئی گھنٹے وہاں رک جاتی۔ اس کا اندازہ تھا کہ صرف مصالحتی میں کئی روز لگیں گے۔ حویلی کی راہداریوں اور کمرؤں کے فرش پر ساتھ ستر سال کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اسے بڑی مشکل سے کھج کر صاف کیا جا رہا تھا۔ حویلی کے صحن میں ایک طرف ایک کتواں بھی تھا جس میں اگرچہ گھرائی میں پانی موجود تھا لیکن اس میں درختوں کی خشک شاخیں پڑے اور مٹی بھری ہوئی تھی۔ ٹایاب نے اس کتوئیں کی مصالحت بھی شروع کر دی تھی۔ تاکہ اس کے پانی کو استعمال میں لایا جاسکے۔

ٹایاب کا کبھی کبھار چوہدری سعادت سے بھی آہنا سامنا ہو جاتا تھا۔ اب وہ اس سے کتواں گزر جاتا تھا لیکن ٹایاب جانتی تھی کہ اس کے دل میں بغض ہے اور وہ کسی موقع کی تلاش میں ہے۔

چوہدری سعادت پچھلے دو دن سے نظر نہیں آیا تھا اور پھر اس صبح ہی سے پتہ چلا کہ وہ کسی کام سے شریک ہوا ہے۔ تین چار دن بعد واپس آئے گا۔

اس رات ٹایاب دیر تک نرس اور عذرہ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر نرس اور عذرہ تو سو گئیں مگر ٹایاب دیر تک جاگتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک دو روز میں اسے بھی شریک کا پتھر لگانا چاہیے۔

نک یہ سوال ہے کہ مجھے کیسے پتہ چلا تو میں نے پہلے کہا تھا کہ یہ بھی ایک پراسرار واقعہ ہے۔ ایک روز میں اتفاق سے اس حویلی میں آجھی تھی اور یہاں میں نے اس لڑکی کی لاش دیکھی تھی جسے ساتھ ستر سال پہلے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ لیکن وہ لاش دیکھ کر گھٹا تھا جیسے اس لڑکی کو میرے آنے سے چند منٹ پہلے قتل کیا گیا ہو۔“ ٹایاب چند منٹ کو خاموش ہوئی پھر اس روز کے واقعات کے بارے میں جانتے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔“ عام طور پر اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ نور دین موہی کی بیٹی حارہ کو زمیندار صداقت علی یعنی سعادت کے دادا نے بے آہود کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لیکن گاڑی والوں کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ صداقت علی کا نام اس لئے لیا جا رہا ہے کہ وہ ایک عیاش آدمی تھا۔ گاڑی اور آس پاس کی بیٹیوں کی کسی عورت کی عزت اس سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ لیکن اس لڑکی کی لاش نے بھی مجھے اپنے قاتل کا نام نہیں بتایا تھا اور مجھے معلوم کرنا ہے کہ حارہ کا قاتل کون تھا؟“

”یعنی پولیس کا کام آپ کریں گی۔ اور وہ بھی ایک ایسے کیس پر جواب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ لوگ بھی بھول چکے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔“ سب انسپکٹر اشرف نے کہا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔“ دیکھ ایک بات کہوں..... جب سے آپ یہاں آئی ہیں پراسرار واقعات کا سمجھ میں نہ آنے والا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ پہلے وہ شہرے سانپ والا واقعہ، پھر پراسرار بوڑھا اور اب یہ حویلی۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہیں گی؟“

”میں ان واقعات کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتی۔ بہر حال۔“ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔“ آپ ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرائیے تاکہ ان کی موت کی اصل وجہ معلوم ہو سکے اور مجھ پر قتل کا جو الزام چوہدری سعادت نے لگایا ہے اس کا جواب دیا جاسکے۔“

”اس کا جواب تو میرا خیال ہے چوہدری سعادت کو مل گیا ہے۔“ سب انسپکٹر اشرف نے منکراتے ہوئے کہا اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

وہ لوگ لاشیں اٹھا کر حویلی سے باہر گئے۔ دونوں لاشوں کو جیب کے پچھلے حصے میں سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا گیا۔

نایاب بستر پر لیٹی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ اچانک ہی گاؤں میں شور اٹھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ رات کا پچھلا پھر تھا۔ شور کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ نایاب اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ ملک سکندر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ گاؤں میں ایک طرف بہت تیز روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کسی مکان کو آگ لگ گئی تھی۔ ملک سکندر دوڑتا ہوا حویلی سے باہر چلا گیا۔

اور اس کے آدھے گھنٹے بعد نایاب کو پتہ چلا کہ کچھ لوگوں نے قیوم کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ حملہ آوروں نے اس کے بوڑھے باپ کو قتل کر دیا اور قیوم کی بہن رابعہ کو اٹھا کر لے گئے۔ جاتے جاتے وہ مکان کو آگ لگا گئے تھے۔ قیوم زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں گلی میں پڑا ہوا ملا تھا۔



پورا گاؤں اس گلی میں جمع ہو گیا تھا۔ لوگ اپنے گھروں سے بائیں میں پانی لاکر قیوم کے گھر کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ شعلوں نے پورے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

قیوم کے بوڑھے باپ نواب دین باگھی کی لاش مکان کے آگن میں تھی۔ اسے کھانڈی کے پے وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ کھانڈی کا ایک وار سر پر بھی لگا تھا۔ جس سے کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ کھانڈی بھی لاش کے قریب ہی پڑی ہوئی مل گئی تھی۔ لوگوں نے بوڑھے نواب دین کی لاش اٹھا کر گلی کے ایک اور مکان کے صحن میں پٹپٹا دی تھی۔ ایک آدمی نے کھانڈی بھی اٹھا کر لاش کے قریب ڈال دی تھی۔

پھیلتی ہوئی آگ پر قابو پانا اگرچہ اب ممکن نہیں رہا تھا لیکن لوگ اس خوفناک آگ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لئے بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ملک سکندر بھی گاؤں کے لوگوں کے ساتھ مل کر آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پانی کی پائیاں بھر بھر کر ڈال رہا تھا مگر یہ آگ بائیں سے بجھنے والی نہیں تھی۔

قیوم کا مکان تو مکمل طور پر صیب شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ان شعلوں پر قابو پانا ناممکن نہیں رہا تھا۔ البتہ لوگ پڑوس کے دوسرے مکانوں کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ آگ رات کو تین بجے لگی تھی اور اب صبح کے چھ بجے گئے تھے۔ قیوم کا مکان جل کر مکمل طور پر راکھ ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں سے اب بھی دھواں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔ پڑوس کے دو مکانوں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ انہیں پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آنے سے بچا لیا گیا تھا۔

قیوم کو اسی صحت ہے ہوشی کی حالت میں گلی سے اٹھا کر ماسٹر محمد علی کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور بائیں کندھے پر بھی کسی تیز دھار آلے سے گھاؤ لگا تھا۔ وہ

راہبر بن کو بھی ساتھ لے گئے۔

”وہ لوگ کس طرف گئے تھے؟“ ملک سکندر نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔
 ”کھنڈوں والے نیلے کی طرف۔“ عبدالحمید نے جراب دیا۔ ”مجھے شک ہے وہ لوگ
 کھنڈروں ہی میں کسی جگہ چھپے ہوں گے۔ اگر ہم ان کا پیچھا کریں تو شاید انہیں پکڑ لیں۔“
 ”اب تک تو یہ نہیں وہ کہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن کھنڈروں میں دیکھ لیتے ہیں
 شاید ان کا کمر لے جائے۔ پانچ چھ آؤں تیار ہوجاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں اور قیوم کا خیال
 رکھنا۔ ذمہ زیادہ کمرے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نے پٹی تو ہانڈہ دی ہے پھر بھی اس کا دھیان
 رکھنا۔“ ملک سکندر کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ ماسٹر محمد علی کے مکان سے نکل کر تیز چلا ہوا اپنی حویلی میں آگیا۔ سیکنڈ اور
 ٹایپ جلدی سے اس کے قریب آگئیں۔

”کچھ لوگ راہبر کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے چاہا نواب دین کو بھی قتل کر دیا
 ہے اور مکان کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ قیوم ڈھکی ہے۔“ سکندر نے ٹایپ کے پوچھنے پر
 بتایا۔ ”وہ لوگ کھنڈروں کی طرف گئے ہیں۔ ہم لوگ ان کے پیچھے جارہے ہیں۔ شاید ان کا
 کمر لے جائے۔“

سکندر نے کمرے میں جا کر الماری سے ذذ نالی بدوق نکال کر اس میں کارتوس بھرے،
 کارتوس والا جلیٹ اور بدوق کندھے پر لٹکائی اور صحن میں آکر گھوڑا کھول لیا اور اس پر
 سوار ہو کر حویلی سے باہر نکل گیا۔

دس آؤں تیار ہو چکے تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی اسلحہ موجود تھا۔ چار آدمیوں
 کے پاس بارہ بوری بدوق تھیں۔ کسی کے پاس لاشی خنجر اور کسی کے پاس کھنڈے۔ وہ
 سب گھوڑے لئے تیار کھڑے تھے۔ سکندر کے آتے ہی وہ لوگ کھنڈروں والے نیلے کی
 طرف روانہ ہو گئے۔ سکندر سب سے آگے تھا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نیلے کے
 پاس پہنچ کر رک گئے۔ اس وقت سورج نے بھی مشرقی افق سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔
 سکندر گھوڑے پر بیٹھا کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے تمام آدمیوں کو دو دو
 کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ٹولی میں ایک آؤی بدوق بردار تھا۔

اب ہوش میں آچکا تھا مگر اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ
 اس کا مکان جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا ہے اور راہبر کو حملہ آور
 اٹھا کر لے گئے ہیں۔

ملک سکندر بھی اسی وقت ماسٹر محمد علی کے گھر میں موجود تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو
 تھانے میں اطلاع دینے کے لئے نور پور بھیج دیا تھا۔ وہ خود قیوم کے پاس بیٹھا اسے تسلیاں
 دے رہا تھا اور ابھی بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور اس واقعہ کے بارے میں تبصرے
 کر رہے تھے۔

”راہبر بن کی بیچ کی آواز سن کر میری آنکھ کھلی تھی۔“ عبدالحمید بتا رہا تھا۔ اس کا
 مکان گلی میں قیوم کے مکان کے بالکل سامنے تھا۔ ”میں اٹھ کر کمرے سے نکلا تو قیوم اور
 چاہا نواب دین کے چپٹے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکو چاہا نواب دین کے
 گھر میں گھس گئے ہیں۔ میں اپنے مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور مدد کیلئے شور مچانے لگا۔
 راہبر بن کے چپٹے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میرا خیال ہے وہ چار آؤں تھے
 جن میں سے دو راہبر بن کو پکڑ کر کھینچے ہوئے لے جا رہے تھے اور ایک قیوم سے ہاتھ پائی
 کر رہا تھا۔ چوتھے نے مکان کو آگ لگائی تھی۔ چاہا نواب دین مجھے نظر نہیں آیا تھا اور نہ
 ہی اب اس کے چپٹے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ دو آؤں بھی باہر دوڑے۔ قیوم بھی ان کے پیچھے لگا۔ اس نے گلی میں ایک آؤی کو
 پکڑ لیا۔ دوسرے نے اپنے ساتھی کو چھڑانے کیلئے کسی چیز سے قیوم پر پیچھے سے وار کئے۔
 قیوم چیخ کر گر گیا اور وہ دونوں آؤں بھاگ گئے۔

اس شخص نے شاید کپڑے جی رکے ان میں آگ لگائی تھی جو اب بجھتی جا رہی
 تھی۔ میرا اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ کچھ دور بند لوگ اپنے گھروں سے نکلتا
 شروع ہوئے۔ آگ دیکھ کر وہ قیوم کے مکان کی طرف دوڑے۔ چاہا نواب دین ختم ہو چکا
 تھا۔ اس کی لاش اٹھا کر خیرین کے گھر پہنچا دی گئی اور قیوم کو اٹھا کر میاں لے آئے۔

کچھ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں پانچ چھ آدمیوں کو ساتھ لے کر ان
 ڈاکوؤں کے پیچھے دوڑا۔ گاؤں کے باہر ان کا پانچواں ساتھی گھوڑے لئے کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ
 کر ان میں سے ایک نے فائرنگ شروع کر دی اور گھوڑوں پر سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ وہ

وہ ٹیلے کے ڈھلان سے اترنے لگے۔ اس طرف ٹیلے کے دامن میں برگد کا وہ پرانا درخت اور اس کے نیچے وہ ٹوٹا پھوٹا چوترا تھا جس کے بارے میں رانی شہنا کے حوالے سے عجیب و غریب داستانیں مشہور تھیں۔

برگد کا درخت بہت بڑا تھا۔ اس کا تاج کی میڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین تک لگی بنائیں بھی اس قدر گنجان تھیں کہ ان کے اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔

وہ تمام لوگ درخت سے چند گز دور ہی رک گئے اور مجلس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اللہ بخش گھوڑے کو اوپر سے گھماتا ہوا برگد کے دوسری طرف چلا گیا اور پھر اس کی آواز سن کر سکندر وغیرہ بھی اس طرف آگئے۔

یہاں کچھ زمین پر گھوڑوں کے بیڑوں کے نشان نظر آرہے تھے اور یہ نشان تازہ ہی تھے۔ گلتا چاہیے کچھ دور پہلے ہی چند گمز سوار اس طرف سے گزرے ہوں۔

”دیکھو ملک بڑا کیا ہے؟“ دین محمد نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سکندر اس طرف دیکھنے لگا۔ چند گز دور جھاڑیوں میں شاید کوئی کپڑا اٹکا ہوا تھا۔ سکندر گھوڑا بڑھا کر جھاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ہلکے ہلکے رنگ کا کپڑا تھا۔ سکندر نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے جبکہ کہہ کپڑا اٹھا لیا اور اسے پھیلا کر دیکھنے لگا۔

وہ دہشتہ تھا اور بالکل نیا ہی لگ رہا تھا۔

”وہ لوگ اسی طرف سے گئے ہیں۔“ سکندر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دین محمد حید اور ثار۔۔۔ تم تینوں ریمان آباد چلے جاؤ۔ وہاں جا کر معلوم کرو کہ وہاں کوئی آیا تو نہیں۔ ہوجیک ہے وہ لوگ اس بستی کے کسی گھر میں چھپے ہوئے ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک بڑی۔“ حید نے جواب دیا۔ ”چلو ہمیں جواؤ۔۔۔ ہمارے گاؤں کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو بچ کر نہیں جانا چاہیے۔“

ان تینوں نے اپنے گھوڑے ریمان آباد نامی بستی کی طرف جانے والی پگھنڈی پر ڈال دیئے۔ سکندر نے اپنا گھوڑا واپس موڑ لیا۔

وہ لوگ ٹیلے کے اوپر سے گھوم کر گاؤں کی طرف چلے گئے۔ اس وقت نوح چکے تھے اور دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ ”تقریباً“ آدھے گھنٹے بعد وہ گاؤں پہنچ گئے۔ ان سے چند منٹ پہلے ہی پولیس بھی پہنچی تھی۔ اس پولیس پائی کا اہلکار سب انسپکٹر اشرف ہی تھا۔

”ان کھنڈروں کو گھیرے میں لیکر آئے پڑھتے رہو۔ اگر کہیں کوئی نظر آجائے تو ہوائی فائر کر دینا۔ ہم سب لوگ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر سچ میں کسی سے ملے پھڑتے ہوئی تو ہم کھنڈروں کے دوسری طرف ٹیلے کے آخر میں ملیں گے۔ چلو اپنی اپنی پوزیشنوں پر روانہ ہو جاؤ۔“

وہ سب لوگ مختلف راستوں سے ٹیلے پر چڑھ کر کھنڈروں میں داخل ہو گئے۔ سکندر کے ساتھ اللہ بخش تھا۔ اس کے پاس لیے دستے والی تیز دھار والی کھماڑی تھی۔ وہ دونوں محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ لیکن کھنڈروں میں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

سکندر نے گھوڑا ایک جگہ روک لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے وہ نایاب کے ساتھ تر خانے میں داخل ہو کر خزانے تک پہنچا تھا۔ لیکن پھر کی وہ سل دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے اٹھا کر وہ تر خانے میں اترے تھے۔ سل تو اپنی جگہ پر موجود تھی لیکن اس پر چھوٹے چھوٹے پتھر اور مٹی وغیرہ پڑی ہوئی تھی۔ گلتا چاہیے اس سل کو یہاں سے کبھی ہٹایا ہی نہ گیا ہو۔

اس جگہ کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں کوئی خفیہ راستہ موجود ہے۔ وہ چند لمبے وہاں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔

”ان کھنڈروں میں تو کسی کی موجودگی کے آثار نہیں آتے۔“ اللہ بخش نے بھی گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ اس طرف آئے ضرور ہوں گے لیکن یہاں رکے بغیر آگے کسی اور طرف نکل گئے ہوں گے۔ بہرحال دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی سراغ مل جائے۔“ سکندر نے جواب دیا۔

وہ کھنڈروں کو دیکھتے ہوئے ٹیلے کے دوسری طرف آگئے۔ ان کے دوسرے ساتھی بھی باری باری وہاں پہنچنے لگے۔

ان کھنڈروں میں تو کسی کا نام و نشان تک نہیں ہے ملک بڑی۔“ عبدالحمید نے کہا۔ ”وہ لوگ شاید کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ سکندر بولا۔ ”آؤ۔ آگے دیکھتے ہیں۔“

پولیس والے جلے ہوئے مکان کا سامنا کر رہے تھے جس سے کئی جہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مکان میں کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ صرف دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں۔ مکان کے سامنے لے کے بعد سب انسپکٹر اشرف نے بوڑھے لواب دین کی لاش کا سامنا کیا اور پھر بائیں طرف علی کے مکان میں آگیا جہاں قیوم موجود تھا۔

ملک سکندر بھی اسی کے ساتھ بائیں طرف علی کے مکان میں داخل ہوا تھا۔ قیوم چارہائی پر جیر لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر فیض نہیں تھی۔ سر اور کندھے پر بیٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ٹایپ اور تین چار دیگر عورتیں بھی موجود تھیں۔ دوسری عورتیں تو پولیس کو دیکھ کر باہر نکل گئیں لیکن ٹایپ وہیں کھڑی رہی۔ صرف ایک سیکنڈ بعد ڈاکٹر بھی اندر داخل ہوا تھا۔

”ہاں بھی جوان۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اس وقت بیان دے سکتے ہو یا نہیں۔“ سب انسپکٹر اشرف نے قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک آدمی نے پرانی سی ایک کرسی اٹھا کر آگے رکھ دی۔ اشرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں تھانیدار جی۔ میں بیان دے سکتا ہوں۔“ قیوم نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

”قیوم بڑے حوصلے والا لڑکا ہے اشرف صاحب!“ قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ ”کندھے کا زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ سر پر لگنے والی چوٹ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے ڈریسنگ کمری تھی۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن اگر خون زیادہ بہہ جاتا تو حالت تشویشناک ہو سکتی تھی۔“

”بڑی مہربانی ہے ڈاکٹر صاحب!“ سب انسپکٹر اشرف نے کہا۔ ”اب مجھے ذرا اس جوان کا بیان سن لینے دیں۔“ وہ ایک بار پھر قیوم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں بھائی جوان۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا تھا؟“

”ہم سب گھر والے سو رہے تھے جی۔“ قیوم بتانے لگا۔ ”ابا ایک کمرے میں تھا اور رابعہ دوسرے کمرے میں اور میں چھپرے کے نیچے سویا ہوا تھا۔ دھب کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ دو آدمی دیوار سے صحن میں کودے تھے۔ میں انہیں لٹکاتا ہوا چارہائی سے اٹھ گیا۔ اسی دوران دو اور آدمی دیوار سے کود کر اندر آگئے۔ دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

ان چاروں کے چروں پر ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔ میری چیخوں کی آواز سن کر رابعہ اور ابا بھی کمرے سے نکل آئے اور انہوں نے بھی شور مچا دیا۔ دو آدمی رابعہ کو پکڑ کر تھمپنے لگے۔ ابا نے اسے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک آدمی نے کھانڈی سے ابا پر حملہ کر دیا۔ میں بھی اپنے آپ کو چھڑا کر اس طرف لپکا۔ ایک آدمی نے مجھے اڑکھ دے کر گرا دیا اور لاٹوں اور گھوسوں سے میری پٹائی کرنے لگا۔

ایک آدمی رابعہ کو تھمپتا ہوا لے جا رہا تھا۔ رابعہ بھی چیخ رہی تھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک آدمی رابعہ والے کمرے میں گھس گیا اس نے بسزاور کپڑے وغیرہ جمع کر کے انہیں آگ لگا دی۔

ابا چیختا ہوا زمین پر گر گیا تھا۔ وہ آدمی مسلسل اس پر کھانڈی سے وار کر رہا تھا۔ میں ابا کی مدد کیلئے اس کی طرف دوڑا اور اس آدمی سے کھانڈی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ چھینا چھینی میں کھانڈی اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ کر رو پار گئی۔

اس شخص نے مجھے دھکا دیکر گرا دیا اور باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اٹھ کر ابا کی طرف دھکا۔ وہ زمین پر پڑا رہا۔ اس کے سر اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرے میں آگ بجڑ اٹھی تھی۔ میں باہر والے دروازے کی طرف دوڑا۔ وہ لوگ رابعہ کو تھمپتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

گلی میں پہنچ کر میں نے ان دو آدمیوں پر چھلانگ لگا دی جنہوں نے رابعہ کو دیوچ رکھا تھا۔ میں رابعہ کو ان سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایک آدمی نے کسی چیز سے حملہ کیا۔ میرے کندھے پر چوٹ لگی۔ دوسرا دار اس نے میرے سر پر کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھرا چھا گیا۔ مجھے صرف رابعہ کی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں تورا کر کر اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔“ قیوم خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ مردہ سے لمبے میں پڑا۔ ”یہ لوگ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مجھے پتہ چل گیا ہے کہ ابا زندہ نہیں ہے اور رابعہ۔۔۔ وہ لوگ رابعہ کو لے گئے ہیں۔ وہ بھانے کس حال میں ہو گئی؟“

”بندے ان لوگوں کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رابعہ کا جلد ہی پتہ چل جائے گا۔“ قریب کھڑے ہوئے ملک سکندر نے کہا۔

کریں گے۔ مجرموں کو کبھی صاف نہیں کیا جائے گا۔“ وہ کچھ دیر مزید اس سے سوال کرتا رہا پھر کرسی سے اٹھ گیا اور ملک سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ملک جی آپ لوگ نواب دین کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروانا چاہیں تو وہ بندے ساتھ بھیج دیجئے۔ شام سے پہلے پہلے لاش ان کے حوالے کردی جائے گی۔“

”یہ تو قتل کی مکمل واردات ہے جی اور میرا خیال ہے پوسٹ مارٹم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی رپورٹ میں جو لکھنا چاہتے ہیں لکھ لیں۔ ہم تفتیش کا بندوبست کرتے ہیں۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔

”نیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ سب انسپکٹر اشرف بولا۔ ”ملکی کون ہے؟“
 ”وہ جو اس روز چودھری سعادت کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوا تھا اور پھر وہ دونوں ہوائی جہازوں سے مار کھا کر آئے تھے۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔“ سب انسپکٹر بولا پھر اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”وہ آدمی جاؤ اور ملکی اور ان دونوں کو پکڑ کر لاؤ۔ کیا نام بتائے تھے ان کے۔۔۔ جڑا اور بوٹا پکڑ کر لاؤ انہیں۔“

”دو کانشیل اسی وقت مکان سے باہر نکل گئے۔ سب انسپکٹر اور سکندر وغیرہ بھی باہر آگئے تھے۔ وہ لوگ ایک باہر پھر قیوم کے مکان پر آکر راکھ کے ڈھیر کا معائنہ کرنے لگے۔
 ”تقریباً“ آدھے گھنٹے بعد دونوں کانشیل جڑا اور بوٹا کو پکڑ لائے۔ وہ دونوں خوف سے قہر قہر کانپ رہے تھے۔ جڑا پینتیس چھتیس سال کا قد سے بھاری بھر کم آدمی تھا اور بوٹا کی عمر چالیس کے گنگ بھگ دہی ہوگی۔ وہ درمیانے جسم اور قد و قامت کا مالک تھا۔ بوٹا کے نوکدار داڑھی تھی اور جڑا کلین شیو تھا۔ وہ دونوں آتے ہی ملک سکندر کے پیروں پر گر گئے۔

”ملک جی ہم کو بھالو۔۔۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ دونوں گڑگڑا رہے تھے۔ ”رب جانتا ہے، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں جی۔ ہم تو اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔“

”تم دونوں قیوم کو دھکیلا دیتے رہے ہو تاکہ چھوٹی لی لی کے ساتھ کام چھوڑ دو ورنہ پچھتاؤ گے۔“ سب انسپکٹر اشرف نے باری باری دونوں کو گھورا۔

”تم نے بتایا تھا کہ وہ چار آدمی تھے۔“ سب انسپکٹر اشرف نے قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کسی کو پچھانتے ہو؟“

”انہوں نے چروں پر ڈھالے ہاتھ رکھے تھے۔“ قیوم نے جواب دیا۔ ”مجھ سے ہاتھا پائی کے دوران ایک آدمی کے چہرے سے ڈھانکا اتر گیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنا چہرہ دوبارہ پکڑنے میں چھپا لیا تھا۔ اس دوران میں اس کے چہرے کی ایک بلی سی جھک دیکھ سکا تھا۔ اس کی چھوٹی گول داڑھی تھی اور ناک پر دائیں طرف مٹر کے دانے کے برابر سر تھا۔“

”اس گاؤں میں ایسا کوئی آدمی ہے جس کی ناک پر سر ہو۔“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔
 ”نہیں جی۔“ قیوم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں گاؤں کے سب ہی آدمیوں کو جانتا ہوں۔ یہاں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔“

”ایک اور بات بتاؤ قیوم۔“ سب انسپکٹر اشرف بولا۔ ”تمہاری کسی سے دشمنی بھی تھی؟“

”دشمنی تو کسی سے نہیں تھی جی لیکن۔۔۔“ وہ خاموش ہو کر کن انہیوں سے غائب کی طرف دیکھنے لگا۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ سب انسپکٹر اشرف نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”جب سے میں نے چھوٹی لی لی کے لئے پرانی حویلی میں کام شروع کیا ہے اس دن سے چودھروں کے دو تین آدمی مجھے اور میرے ساتھ کام کرنے والوں کو دھکیلا دیتے رہے ہیں۔“

”کون۔۔۔ کون ہیں وہ آدمی؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”ملکی۔۔۔ جڑا اور بوٹا جی۔“ قیوم نے جواب دیا۔ ”جڑا اور بوٹا تو مجھ سے یہی کہتے تھے کہ چھوٹی لی لی کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ پچھتاؤ گے لیکن ملکی نے تو برسوں ہی مجھے کھیتوں میں روک کر دھکی دیا تھی کہ وہ چند روز میں میرا بندوبست کرنے والا ہے۔ اس نے میرا یہ بندوبست کیا ہے جی۔ میرا گھر جلا دیا۔ میرے ابا کو قتل کر دیا اور میری بہن کو اٹھا کر لے گئے۔“ قیوم کی آواز بھراؤنی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”حوصلہ رکھو جوان۔“ سب انسپکٹر اسے تسلی دینے لگا۔ ”ہم تمہاری بہن کو برآمد

دو دنوں اب بھی گومرا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سکندر نے سب انسپکٹر اشرف کو بتایا تو وہ بولا۔

”آپ جانتے ہیں ملک جی، دریا پار دوسرا ضلع شروع ہو جاتا ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ قتلے پہنچ کر میں وائزس پر اس ضلع کی پولیس کو خبردار کر دیتا ہوں اور ایک پارٹی بھی ان کے تعاقب میں بھیج دیتا ہوں۔ وہ لوگ پیچ کر نہیں جائیں گے ملک جی! بس یہ دعا کریں کہ وہ جھگ کی طرف نہ نکل جائیں۔ اگر وہ جھگ میں داخل ہوئے تو ان کی تلاش مشکل ہو جائے گی۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی سراغ ملا میں اطلاع کر دوں گا۔“

”ہم اپنے طور پر بھی تلاش جاری رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تو ہم آپ کو خبر کریں گے۔“ سکندر نے کہا۔

”فیک ہے۔“ سب انسپکٹر اشرف نے جپ کا انجی ٹاٹ کرتے ہوئے کہا۔

پولیس چلی گئی۔ سکندر ماسٹر علی کے گھر آگیا۔ ٹایپ وہیں تھی۔ قیوم دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ دو تین آدمی اسے دلاس دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ سنبھل نہیں سنبھل رہا تھا۔ یہ صدمہ ایسا تو نہیں تھا جو آسانی سے برداشت ہو جاتا۔ اس کا گھر جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ باپ کو اس کی آنکھوں کے سامنے بید روی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور جوان بن کر اٹھا کر لئے گئے۔

دوپہر ہو گئی۔ نواب دین مانگی کی جینز و عینین کی تیاری شروع ہو گئی اور جب جنازہ اٹھا تو پورا گاؤں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ نواب دین اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ساٹھ سال تک گاؤں والوں کی خدمت کی تھی۔ ان کے گھروں میں پانی بھرا تھا۔ اس سے پہلے اس کے باپ دادا یہ خدمت انجام دیتے رہے تھے۔ نواب دین نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ اس کا کسی کے ساتھ کبھی جھڑا نہیں ہوا تھا۔ گھروں میں پانی بھرنے کے علاوہ گاؤں والوں کے دوسرے کام بھی وہ ہنس کر کر دیتا تھا۔ اسی لئے آج اس کی موت پر سارا گاؤں اداس تھا۔

ٹایپ ابھی سوگوار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قیوم پر یہ قیامت اسی کی وجہ سے فونی تھی۔ نہ تو قیوم کو اپنے لئے استعمال کرنی اور نہ یہ سنگین ترین صورتحال پیدا ہوئی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے سر جھٹک دیا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قیوم کو مجبور

”ہم نے تو اسے مشورہ دیا تھا جی کہ پرانے مالک کو چھوڑ کر نئے آدمیوں کے پیچھے بھاگنا کوئی فکندہ نہیں ہے۔ ہم نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔“ مہر پوتانے کہا۔

”انہیں لے جا کر جیپ میں بٹھا دو۔ قتلے جا کر پوچھیں گے ان سے۔“ سب انسپکٹر اشرف نے کہا۔ مہر پوتانے بولا۔ ”اور وہ ملکی کہاں ہے؟“

”وہ صبح چھ بجے تک اپنے گھر میں تھا جی۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔“ ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ سب انسپکٹر بولا۔ ”تلاش کر لیں گے اسے بھی۔ کہاں جائے گا؟“

سب انسپکٹر اشرف نے مختلف لوگوں کے بیانات قلبند کئے اور کارروائی ختم کر دی۔ اس دوران حمید، شاد اور دین مہر بھی واپس آ گئے۔

”کچھ پتہ چلا ان کا۔ کس طرف گئے ہیں وہ لوگ؟“ سکندر نے پوچھا۔

”ہم نے رحمان آباد کے ایک ایک گھر میں دیکھ لیا ہے۔ ہستی کے ہر شخص سے معلوم کیا لیکن ان لوگوں کے بارے میں پتہ نہیں چلا۔ البتہ واپسی پر کھیتوں میں کام کرنے والے ایک بندے سے کچھ سراغ ملا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”وہ کیا؟“ سکندر نے پوچھا۔

”عبداللہ ثانی وہ شخص رحمان آباد کے چودھری کرم دین کا مزارع ہے۔ ان کے کھیتوں میں آج پانی کی باری تھی۔ عبداللہ کے کہنے کے مطابق وہ صبح چار بجے کھیتوں کی طرف آ رہا تھا تو اس نے چند گھڑسواروں کو دریا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر کھیتوں میں چھپ گیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہو سکتے تھے جو اس طرح رات کے پچھلے پہر کہیں جا رہے ہوں۔“

”کتنے گھڑسوار تھے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”چار۔“ اس مرتبہ شاد نے جواب دیا۔

”تو پھر وہی ہوں گے۔“ سکندر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ راجہ کو لے کر دریا پار چلے گئے ہوں گے۔ یہ سب انسپکٹر کو بتا دو۔“

سب انسپکٹر اشرف اس وقت جیپ میں بیٹھ رہا تھا۔ چار پولیس والے بھی جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ جیسے اور بولنے کو بھی انہوں نے اپنے درمیان سینڈویچ بنا رکھا تھا۔ وہ

”سب لوگ جانتے ہیں۔“ سکندر بولا۔ ”لیکن جب تک کوئی ثبوت نہ ہو اس کے خلاف قانونی طور پر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ ملنگی پکڑا جائے تو اس کا بیان سعادت کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کیلئے کافی ہوگا۔“

”لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس سلسلے میں آج تک جتنے بھی آدمی پکڑے گئے، سب کے سب کسی نہ کسی طرح ختم ہو گئے۔ پہلے ایک آدمی کو ریلوے پوائس میں قتل کے شے میں پکڑا گیا۔ وہ تھانے سے فرار ہو گیا اور اس کی لاش ریلوے سٹیشن کے بیت الخلاء سے ملی۔ پھر پھل پر حملہ ہوا میں نے گلو کی نشاندہی کی تھی، وہ پولیس کے ہاتھ مارا گیا۔ اگر پولیس چاہتی تو گھوڑے سے مطلوب کیا جاسکتا تھا کہ تھانے سے فرار ہونے والے شخص کو اس نے کس کے کتنے پر قتل کیا تھا اور مجھ پر گویاں کس کے کتنے پر برساتی گئی تھیں۔ ان معاملات میں پولیس کا کردار بھی قابل تعریف نہیں ہے لیکن۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”پولیس جیسے اور بونے کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ کیا ان دونوں سے مطلوب نہیں ہو سکتا کہ وہ کون لوگ تھے اور یہ سب کچھ کس کے کتنے پر کیا کیا تھا؟“

”بیرا خیال ہے نہیں۔“ سکندر بولا۔ ”اگر ان دونوں کو اس سلسلے میں کچھ مطلوب ہوتا تو وہ بھی یہاں نہ رکھتے اور ملنگی کے ساتھ ہی گاؤں سے بھاگ جاتے۔“

”ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ یہ پروگرام اچانک ہی نہیں بنا ہوگا۔ سب کچھ سوہی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے اور غالباً اس کی پلاننگ کئی روز پہلے کی گئی تھی۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ظاہر ہے انہوں نے کوئی منصوبہ تو بنایا ہوگا۔“ سکندر بولا۔

”منصوبہ تو بنایا ہوگا لیکن میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ یہ منصوبہ چودھری سعادت ہی نے بنایا تھا۔ وہ خود شہر چلا گیا تھا کہ اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے۔ یہ واردات کرنے کے لئے آدمیوں کا بددوست کسی دوسرے علاقے میں کیا گیا ہوگا۔ ملنگی اس وقت تک گاؤں میں رہا جب تک واردات پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ گئی۔ اپنا اطمینان کرنے کے بعد وہ بھی بھاگ گیا۔“

”ہو سکتا ہے جہازا خیال درست ہو۔“ سکندر بولا۔ ”لیکن بات پھر وہیں آکر اٹک

نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے ٹایاب کا ساتھ دیا تھا۔ صرف قیوم ہی نہیں۔ ہر اس شخص کو برے نتائج کی دھمکیاں دی جارہی تھیں جو ٹایاب کا ساتھ دینے کی بات کرتا تھا اور گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ یہ دھمکیاں کس طرف سے مل رہی تھیں۔

چودھری نے پرانی حویلی پر ٹایاب کا قبضہ روکنے کیلئے خود تو کوئی مداخلت نہیں کی تھی لیکن اپنے آدمیوں کے ذریعے حویلی میں کام کرنے والوں کو دھمکیاں دی جارہی تھیں تاکہ وہ کام چھوڑ کر بھاگ جائیں اور ٹایاب حویلی پر قابض نہ ہو سکے۔ لیکن ٹایاب کا ساتھ دینے والے پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ انہیں باز رکھنے کیلئے دوسرا راستہ اختیار کیا گیا۔ قیوم کا گھر جلا دیا گیا۔ اس کے باپ کو قتل کر دیا اور اس کی جوان بہن کو اغوا کر لے گئے۔ وہ قیوم کو بھی شاید مرہہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے لیکن قیوم بچ گیا تھا۔

رابعہ سے ٹایاب کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ نرمس اور عذرہ کے علاوہ شاید رابعہ ہی گاؤں کی واحد لڑکی تھی جو ٹایاب کو سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ رابعہ اس سے ملنے کے لئے تقریباً روزانہ ہی ملک صاحب کی حویلی آ جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے روز ٹایاب بھی اس کے ہاں چلی جاتی تھی اور یہ ٹایاب سے تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کا گھر برباد کر کے رابعہ کو اغوا کر لیا گیا تھا اور ٹایاب نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک رابعہ کا سراغ لگا کر ان لوگوں کو عبرتناک سزا نہیں دے گی، جین سے نہیں بیٹھے گی۔ پولیس سے اسے کچھ زیادہ توقع نہیں تھی۔ پہلے پولیس نے کون سا تہہ دار لیا تھا جو اب کچھ کر کے دکھائے گی۔

ٹایاب کی بے چینی کو سکندر کے گھروالے بھی سمجھ رہے تھے۔ سکندر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو بھی شبہ تھا کہ اس واردات میں ملنگی کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ وہ صبح چھ بجے گھر سے غائب ہو گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اگر براہ راست نہیں تو کسی اور طرح سے وہ اس واردات میں ملوث ضرور تھا اور پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ گیا تھا۔

”ملنگی کا پتہ لگانے کے لئے ہندہ تمام چھوٹی بڑی بستیوں میں پھیل گئے ہیں۔“ سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ قابو آجائے تا تو پھر پتہ چل جائے گا کہ یہ واردات کس نے کی ہے اور اس کے پیچھے اصل آدمی کون ہے۔“

”اصل آدمی۔“ ٹایاب بولی۔ ”چودھری سعادت کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ آگ تو اسی کے کیچ میں لگی ہوئی ہے۔“

اور وہ خود کچھ نہیں کر پاری تھی۔ وہ اب تک پولیس پر تکیہ کئے ہوئے تھی لیکن پولیس یا تو جانبداری سے کام لے رہی تھی یا کچھ اور چھپے گیال ان کی راہ میں حائل تھیں جو ابھی تک چودھریوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

آج کا واقعہ تو بہت ہی سنگین تھا۔ قیوم کا گھر جل کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی جوان بہن کو اغوا کر لیا گیا۔ یہ ظلم کی انتہا تھی اور نایاب سوچ رہی تھی کہ اب اسے پولیس پر تکیہ کرنے کے بجائے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ قیوم پر یہ اندازہ ہی کی وجہ سے نازل ہوئی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتی تھی۔ رابعہ بہت معصوم لڑکی تھی۔ وہ ظالم اس کا جو مشر کریں گے اس کا تصور کر کے ہی نایاب کانپ اٹھتی تھی۔

رابعہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں اچانک ہی حاجرہ کا خیال ابھر آیا۔ پرانی حویلی آسپ زہہ مشور تھی۔ کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا مگر نایاب وہاں گئی تھی تو حاجرہ کی لاش نظر آئی۔ نایاب کو کچھ نہیں ہوا تھا بلکہ وہ پراسرار سرگوشیاں سناتی وہی تھیں۔

حاجرہ کی روح شاید اس سے کوئی کام لینا چاہتی تھی۔ صرف نایاب اور اس کے بیک نیت ساتھی تھے جو اس حویلی میں آڑاوی سے آ جا سکتے تھے۔ ان کے علاوہ جس نے بھی حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اس کا انجام برا ہوا تھا۔

نایاب یہ سب کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ حاجرہ کی روح اس سے کیا کام لینا چاہتی تھی۔ حاجرہ کے بعد بھی اس علاقے میں ظلم اور بربریت کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو بے آہود کرنا علاقے کے دولت مندوں کا دلیوہ بن گیا تھا۔ لیکن انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جس نے روکنے کی کوشش کی اسے برباد کر دیا گیا۔ شیخن باشر عبدالغنی کی بیوی راشدہ کی مثال اس کے سامنے تھی۔ راشدہ کو چودھری سعادت اور اس کے ساتھیوں نے بے آہود کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مزاحمت کرنے پر راشدہ کو کھولے ہوئے کڑھاؤں میں ڈال دیا گیا۔ وہ پانچ سال تک کرب و اذیت میں جٹا رہی اور جب نایاب نے اس کی داستان سن کر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے کاروڑ کو ٹلگ لگا کر دونوں میاں بیوی کو زندہ جلا دیا گیا تھا اور

جاتی ہے۔ چودھری سعادت یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ البتہ ملٹی ایک ایسا آدمی ہے جو اصل بات بتا سکتا ہے۔ اس کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل پرسون تک اس کا پتہ چل جائے گا۔
”اور اس وقت تک پچاری رابعہ کا جو مشر ہوگا اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“
نایاب نے کہا۔

”میں سب کچھ سمجھتا ہوں لیکن ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔ سوائے اس کے کہ ان کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے رہیں اور وہ ہم کر رہے ہیں۔ دعا کرو ان میں سے کسی ایک کا پتہ چل جائے۔“ پندر نے کہا۔

”قیوم نے حملہ آوردوں میں سے ایک کا حلیہ بتایا تھا۔“ نایاب بولی۔ ”گول چھوٹی واڑھی اور ناک پر داہیں طرف مڑ کے دانے کے برابر سیاہ۔۔۔ کیا اس ملے کی بنا پر آس پاس کی بستیوں میں اس آدمی کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا؟“
”جتنے بھی آدمی ان لوگوں کی تلاش میں گئے ہیں“ ان سب کو یہ حلیہ بتا دیا گیا ہے۔“
سکندر نے کہا۔ ”وہی مجھے نہیں یاد پڑتا کہ اپنے علاقے کی کسی بستی میں اس ملے کے کسی آدمی کو میں نے دیکھا ہو۔“

نایاب نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اس نے بہرحال یہ ملے کر لیا تھا کہ جب تک ان لوگوں کو تلاش کر کے رابعہ کا پتہ نہیں چلائے گی اسے بھی چھین نہیں آئے گا۔

اس رات بھی نایاب کو نیند نہیں آئی۔ گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ زمرس اور عذرا بھی گہری نیند میں تھیں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نایاب کی آنکھوں میں دور دور تک تیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے اسے چھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گاؤں میں ہر طرف سناٹا تھا اور اس سناٹے میں بھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی یا پھر کسی لہو چکیدار کی۔ ”چاگتے رہتا۔“ کی آواز کان میں پڑ جاتی اور اس کے بعد پھر سناٹا طاری ہو جاتا۔

نایاب کرسی پر بیٹھی تاریکی میں گھور رہی تھی۔ اس کا ذہن ملے جلے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ صورتحال سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ چودھری سعادت پچیتا جا رہا تھا

بندھے ہوئے تھے۔ ملک صاحب کا گھوڑا کستنی تھا اور سکندر کی گھوڑی سفید تھی۔ ٹایاب جب شروع میں یہاں آئی تھی تو اس نے ایک آہستہ مرتبہ گھوڑے کی سواری کی تھی۔ لیکن اسے برا ڈر لگا تھا۔ ایک مرتبہ تو وہ گھوڑے سے گرتے پڑے تھے۔ اس کے بعد اس نے توبہ کر لی تھی کہ گھوڑے پر نہیں بیٹھے گی لیکن اب وہ بڑی بے خوفی سے سکندر کی گھوڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ روکی اور پھر دیوار میں لگے ہوئے آہنی کنڈے سے گھوڑی کی رسی کھولنے لگی۔ گھوڑی ایک دو مرتبہ ہنسنی پھر خاموش ہو گئی۔

ٹایاب گھوڑی کی رسی پکڑے، حویلی کے پھاٹک کی طرف چلے گئی۔ وہ پھاٹک کے قریب پہنچی ہی تھی کہ گھوڑی ایک مرتبہ پھر زور سے ہنسنی۔ ٹایاب پھاٹک کا کنڈا کھولنے لگی۔

فیک اسی لمحہ سکندر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور سکندر باہر آ گیا۔ وہ گھوڑی کے ہنسنے کی آواز سن کر جاگ گیا تھا۔ سکندر برآمدے میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں ٹایاب کو نہیں پہچان سکا تھا لیکن گھوڑی کو پھاٹک کے قریب دیکھ کر چونک گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی چور گھوڑی کھول کر لے جا رہا ہے۔

”اے۔۔۔ رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ سکندر لٹکارتا ہوا پھاٹک کی طرف لپکا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ گولی مار دینے کی محض دھمکی دی تھی۔

ٹایاب نے پھاٹک کا کنڈا کھول لیا اور ایک پتہ کو باہر کی طرف دیکھ لیا تھا۔ پھاٹک آہستہ آہستہ کھلا چلا گیا۔ سکندر کی آواز سن کر ٹایاب نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اپناٹک کر گھوڑی پر سوار ہو گئی۔

سکندر ایک جھگٹے سے رک گیا۔ اس نے ٹایاب کو پہچان لیا تھا۔ اسے حیرت کا ہوا شدید جھٹکا تھا۔ گھوڑی پر نہ تو زمین تھی اور نہ ہی لگام۔ اس کے گلے میں وہ رسی تھی جس سے اسے کچھ نہنے سے بازو رکھا گیا تھا۔ ٹایاب بڑی بے خوفی سے ایک کر گھوڑی پر سوار ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں گھوڑی کے گلے میں پڑی رسی ہی تھی۔

”ٹایاب! رک جاؤ! کہاں جا رہی ہو؟“ سکندر چیخا۔

ٹایاب نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سیدھا پیروں سے گھوڑی کے پیٹ پر

اب راہبر۔۔۔

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔“ ٹایاب بڑبڑائی۔ ”بوڑھے نواب دین کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور میں راہبر کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔“ دفتنا ٹایاب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا دماغ سمجھنا اٹھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے بائی پاور کرنت اس کے جسم میں دوڑ گیا ہو۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دھب سے دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

ٹایاب کرسی پر بیٹھے بیٹھے کانپ رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے برف کی دیواریں اس کے چاروں طرف چن دی گئی ہوں۔ دماغ میں دھماکے سے ہوسے تھے۔ پورے بدن پر چودھیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے قلم لیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ دھدھکیلے کسی کو پکارنا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ جیسے سل گئے تھے اور قوت گمواپی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس کا جسم پتھر کی طرح بھاری ہو گیا تھا۔

ٹایاب اپنے اندر ججب سے کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ جیسے کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہو۔ اس کی سوچیں سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ اس کا جسم پتھر کی طرح بھاری اور دماغ ذل ہو رہا تھا اور پھر دفتنا اس کے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا اور اس کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود کا بھاری پان کم ہو رہا تھا۔

بو جھلن میں بتدریج کم ہو رہا تھا۔ پورے جسم میں سنسنی الٹہ برقرار تھی اور پھر چند سیکنڈ بعد وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگی۔ اس قدر ہلکا پھلکا کہ اگر وہ چاہتی تو ہوا میں بھی اڑ سکتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے سب کچھ بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے سے نکل کر آگن میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کمرے کے دروازے بند تھے۔ جس کمرے سے وہ خود نکلی تھی اس کا دروازہ ایک انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور ٹائٹ لہب کی نیل دھن سی روشنی جھلک رہی تھی۔

ٹایاب مڑ کر آگن میں اس کی طرف چلے گئی جہاں سکندر اور ملک صاحب کے گھوڑے

مارا۔ گھوڑی ایک مرتبہ بھر ہنٹائی اور چھانک سے باہر نکل گئی۔

”ٹایاب! رک جاؤ۔ یہ گھوڑی بدی سرکش ہے۔ مگر جاؤ گی۔“ سکندر چپٹا ہوا چھانک کی طرف دوڑا۔

لیکن ٹایاب نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ گھوڑی گلی میں آکر دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ ٹایاب نے ایک بار پھر اس کے پیٹ میں ہولے سے ٹانگ مار دی۔

”ٹایاب رک جاؤ۔ کہاں جا رہی ہو اس وقت۔“ سکندر چپٹا ہوا اس کے پیچھے دوڑا اور پھر گلی میں پہنچ کر ایک جھنگے سے رک کیا اور اسے گلی میں جاتے ہوئے دیکھا رہا۔

گھوڑی دوسری گلی میں مڑ گئی تھی۔ سکندر دوڑتا ہوا حویلی میں واپس آ گیا۔ گھوڑی کے ہنٹانے اور سکندر کے پیچ پیچ کر بولنے کی آوازیوں سے سکیڑ اور نرمس بھی جاگ گئی تھیں اور وہ دونوں برآمدے میں کھڑی تھیں۔

”کھیا ہوا بھائی جان۔ ٹایاب کہاں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“ نرمس نے سکندر کو دیکھتے ہی کہا۔

”وہ گھوڑی پر بیٹھ کر باہر نکل گئی ہے۔ گھوڑی پر زین بھی نہیں ڈالی۔ اگر وہ گر گئی تو ہاتھ پیر تڑوا بیٹھے گی۔“ سکندر نے کہا۔

”آپ نے اسے روکا نہیں؟“ سکیڑ بولی۔

”میں تو اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس نے تو جیسے میری آواز ہی نہیں سنی۔

گنا ہے جیسے وہ نیند میں تھی۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”نیند میں!“ سکیڑ کے لیے میں حیرت تھی۔

”ہاں بعض لوگوں کو یہ بیماری ہوتی ہے۔“ سکندر بولا۔ ”وہ نیند میں اٹھ کر چلنے پھرنے ہیں اور کوئی نہ کوئی کام بھی کر ڈالتے ہیں لیکن انہیں پتہ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ کسی حادثے کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔“

سکندر نے ملک صاحب والا گھوڑا کھولا اور ایک کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کے گلے میں پکڑی ہوئی دسی سنبھالی اور اسے چھانک کی طرف لے آیا۔

تم لوگ یہ چھانک بند کرلو۔ میں اسے پکڑ کر لانا ہوں۔“ اس نے مڑ کر کہا اور

گھوڑے کو گلی میں دائیں طرف موڑ دیا۔

ٹایاب تیسری گلی میں پہنچ گئی تھی۔ ”جانتے رہتا“ کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی تھی اور پھر اسے وہ بوڑھا چوکیدار بھی نظر آ گیا جو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں لالٹنی پکڑے سامنے سے آ رہا تھا۔ ٹایاب کی گھوڑی اس کے قریب سے گزر گئی اور بوڑھا چوکیدار اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

ٹایاب گلیوں سے ہوتی ہوئی گاؤں سے باہر چلی۔ گھوڑے کی دسی اس نے دائیں ہاتھ میں بست ڈھیلی سی پکڑی ہوئی تھی۔ گھوڑا اپنی مرضی سے آرام سے چل رہا تھا۔ نہری پلایا کے قریب آ کر گھوڑا رک گیا۔ ٹایاب تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ٹانے میں حشرات الارض کی آوازیں عجیب پر اسرار آواز دے رہی تھیں۔

دھنسا“ گاؤں کی طرف سے ایک آواز سن کر وہ چونک گئی۔ کوئی اس کا نام لیکر پکار رہا تھا۔ وہ چونکی اپنے نام پر نہیں آواز پر تھی۔ وہ اس کیلئے بھٹس ایک آواز تھی۔ ایک اجنبی آواز۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار تھا اور وہ آدمی اس کے ساتھ پیدل چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ گھوڑے پر سوار وہ آدمی پیچ پیچ کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔

”ٹایاب۔“ کہاں جا رہی ہو۔ رک جاؤ ٹایاب۔ یہ گھوڑی بدی سرکش ہے۔ تم گر جاؤ گی۔ رک جاؤ ٹایاب۔“

وہ آواز ٹایاب کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹایاب نے مڑ کر گھوڑی کی دسی کو ہلکا سا جھکا دیا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑی کے پیٹ پر ہلکی سی لات مار دی۔ گھوڑی ہنٹائی ہوئی اچھلا اور پچھلے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ ٹایاب نے دسی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔ گھوڑی کے اگلے پیر جیسے ہی زمین پر گئے، ٹایاب نے اس کے پیٹ پر ایک لات مار دی۔ اس مرتبہ لات زیادہ زور سے لگی تھی۔ گھوڑی ایک بار پھر اچھلا اور دوسرے ہی لمحہ نہری پلایا پار کر کے کھیتوں کی طرف دوڑنے لگی۔

ٹایاب گھڑ سواری نہیں جانتی تھی۔ اس سے پہلے وہ صرف ایک یا دو مرتبہ گھوڑے پر بیٹھی تھی۔ وہ جتنی دیر گھوڑے کی پیٹ پر دسی تھی اس کے دل میں خوف رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں خوف نہیں تھا۔ وہ بغیر زین کے گھوڑی پر سوار تھی۔ گھوڑی کے منہ

طرف سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگتی۔

سکندر کشتی ہی دیر تک وہاں کھڑا تاریکی میں محسوس رہا پھر اس نے گھوڑے کو واپس موڑ لیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ٹایپ کس طرف گئی تھی۔ اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارنے کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ وہ گاؤں کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ٹایپ کی گھوڑی کھیتوں میں سرہٹ دوڑ رہی تھی اور ٹایپ گھوڑی کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے کوئی اور اک ہی نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ وہ ٹایپ۔۔۔ ٹایپ نہیں تھی۔ وہ تو اپنے آپ سے بھی اجنبی تھی۔ کوئی غلطی تو تھی جو اسے کسی بات پر اکسا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک گھوڑی کھیتوں میں دوڑتی رہی۔ پھر اس کی رفتار سست ہو گئی۔ ٹایپ بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے دریا تھا۔ اس نے گھوڑی کو واپس طرف موڑ دیا۔ وہ بالکل رفتار سے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہی۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک نہر کی پہنچ پر چلتی رہی پھر اس نے گھوڑی روک لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نہر کی کشادہ پہنچ زمین کی سطح سے تقریباً پندرہ فٹ اونچی تھی۔ ٹیپ میں بھی کچھ غلطی تھی اور اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ٹایپ گھوڑی پر بیٹھی تاریکی میں گھور رہی تھی اور پھر دفعتاً اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

دائیں طرف ٹیپ میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ کوئی چھوٹی سی عمارت تھی جس کی کونکریں بے ہم ی روشنی جھلک رہی تھی۔ ٹایپ کے خیال میں وہاں سے اس عمارت کا فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے کم نہیں تھا۔

گھڑی چلنے پر اسی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے گھوڑی کو نہر کی پہنچ سے نیچے اتار لیا اور کھیتوں کے کنارے کنارے اس عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر وہ گھوڑی روک کر نیچے اتر آئی۔ ایک بار ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گھوڑی کھیت کے کنارے دن کی ایک جھاڑی سے پانچ دی اور عمارت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس عمارت کے علاوہ دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹایپ چند لمبے اس عمارت کی طرف دیکھتی رہی پھر کھیت کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ اس طرف

میں لگام بھی نہیں تھی جس سے اسے کنٹرول کیا جاسکتا۔ صرف وہ رسی تھی جو اس کے گلے میں بندھی ہوئی تھی اور ٹایپ اس رسی کو پکڑے کسی ماہر گھڑ سوار کی طرح گھوڑی کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔

سکندر نے جب گھوڑی کو اچھلتے اور پھر جھپٹے دونوں پیروں پر کھڑے ہوتے دیکھا تو بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ٹایپ گھوڑی سے گر جائے گی اور اس کی ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ اس نے اپنے گھوڑے کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ٹایپ نے گھوڑی کو منہمال لیا تھا اور پھر اس نے شاید گھوڑی کو اڑی گئی تھی کیونکہ گھوڑی دوسرے ہی لمحہ سرہٹ دوڑنے لگی تھی یا پھر وہ بے قابو ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ مگر نہیں۔ سکندر نے یہ دوسرا خیال ذہن سے نکال دیا۔ اگر گھوڑی بے قابو ہو کر بھاگ ہوئی تو ٹایپ یا تو گر بیگی ہوئی یا خوف سے چیخنے لگتی۔ جبکہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ نہ تو وہ گری تھی اور نہ ہی چیختی تھی۔ اس کے برعکس وہ کسی ماہر گھڑ سوار کی طرح گھوڑی کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی تھی اور لگتا تھا گھوڑی پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھی۔ لیکن سکندر اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے جوبلی سے نکلنے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ ٹایپ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ یا تو تینہ میں تھی اور یا اپنے حواس کو بیٹھی تھی۔ سکندر کو یقین تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے گی۔ اس نے بھی اپنا گھوڑا اس کے پیچھے سرہٹ دوڑا دیا۔

جیسے جیسے فاصلہ طے ہو رہا تھا گھوڑی کی رفتار بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ٹیپ نے اس کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پھر وہ آگے کو لٹ کر گھوڑی کی گردن سے لپٹ گئی اور دونوں پیر مسلسل اس کے پیٹ پر مارتی رہی۔

سکندر بھی اپنے گھوڑے کو بار بار ایز لگا رہا تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اور ٹایپ کے درمیان فاصلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اور پھر ٹایپ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ سکندر نے گھوڑا بڑھک لیا اور تاریکی میں گھومنے لگا۔ ٹایپ کو جیسے تاریکی نے نگل لیا تھا۔ وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی البتہ وقفہ وقفہ سے گھوڑی کے ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس آواز سے سب کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ کبھی لگتا ٹاپوں کی آواز دائیں طرف سے آ رہی ہو اور کبھی بائیں طرف سے اور کبھی یہ آواز چاروں

چلے گی۔

یہ عمارت غالباً تین چار کمروں پر مشتمل تھی اور سامنے کے رخ پر دو کمروں کی کمرکھن میں مدہم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ٹایاب آہستہ آہستہ آگے چلتی رہی، پھر عمارت سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی اور کسی قسم کی آہستہ لینے کی کوشش کرنے لگی۔

یہ عمارت دراصل عمارت اری گیش کا رست ہاؤس تھا۔ عمارت کے انفرجیب اس علاقے کے دورے پر آتے تو ہمیں گھبراتے تھے۔ لیکن یہ رست ہاؤس بہت عرصہ سے ویران پڑا تھا۔ تقریباً دو میل دور بنا رست ہاؤس بن جانے کی وجہ سے یہ رست ہاؤس حُرک ہو گیا تھا۔ پہلے تو کچھ عرصہ تک یہاں ایک چوکیدار رہتا تھا لیکن پھر وہ چوکیدار بھی یہاں سے ہٹا لیا گیا تھا۔ جب تک چوکیدار رہا تھا رست ہاؤس کی حالت قدرے بہتر رہی تھی۔ لیکن چوکیدار کے جانے کے بعد یہ عمارت ویران ہوئی چلی گئی۔ تقریباً نصف میل دور ایک چھوٹی سی ہستی تھی۔ اس ہستی کے لڑکے اس دریا پر نہانے کیلئے آجاتے تو تھوڑی دیر کیلئے یہ رست ہاؤس بھی آباد ہو جاتا تھا۔ کمرکھن کی چوکنیں وغیرہ اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

دو سال پہلے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے اس رست ہاؤس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک رات پولیس ایک ڈاکو کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئی۔ مقابلے میں دو ڈاکو ہلاک ہو گئے اور باقی تین بھاگ نکلے تھے۔ اس کے بعد سے ہستی کے بچوں نے بھی اس طرف آنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ رست ہاؤس گاؤں سے میلوں دور تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی اس طرف کبھی نہیں آتے تھے۔ ٹایاب تو اس علاقے اور اس رست ہاؤس کے بارے میں کچھ جانتی بھی نہیں تھی۔ کوئی تابیدہ قوت تھی جو اسے یہاں لے آئی تھی۔

وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی عمارت کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ایک کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی اور اندر جھانکنے لگی۔ کمرے کے فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لائین رکھی ہوئی تھی۔ ٹایاب نے چوکنٹ پر ہاتھ رکھ کر مزید اندر جھانکا۔ چٹائی پر ایک طرف درمی بھی بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے بھی رکھا ہوا تھا۔

ٹایاب اس کھڑکی سے ہٹ کر دوسرے کمرے کی کھڑکی کی طرف آگئی۔ یہاں بھی ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ کچھ کے قریب ایک رانفل بھی پڑی ہوئی تھی۔ کمرے کے کونے میں لائین بیل رہی تھی اور اس کے قریب ہی پانی کی ایک صراحی رکھی ہوئی تھی جس پر شیشے کا ایک گلاس اوندھا پڑا تھا۔

یہ اس عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ ٹایاب محووم کر دوسری طرف آگئی۔ عمارت کے سامنے والے رخ پر چار گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ٹایاب جیسے ہی آگے بڑھی، ایک گھوڑا زمین پر زور زور سے پیارنے لگا اور دوسرا گھوڑا ہنستا اٹھا۔

”اوئے جابی۔“ فضا میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ”دیکھو باہر کوئی ہے تو نہیں۔“

”اس وقت یہاں کون آئے گا ملنگی بادشاہ۔“ دوسری آواز سنائی دی۔

”اوئے دیکھ تو لے۔“ پہلی آواز نے کہا۔ ”گھوڑے باوجود تو شور نہیں مچا رہے۔“

”دیکھ لیت ہوں ملنگی بادشاہ۔“ دوسری آواز نے کہا۔

اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی ایک آوی برآمدے میں نظر آیا۔ اس کے کندھے پر رانفل بکھی ہوئی تھی۔ ٹایاب بڑی بھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی اور آہستہ آہستہ سرکنے لگی اور ایک آؤ میں رک کر دوسری طرف جھانکنے لگی۔

وہ آوی برآمدے سے نکل کر اسی طرف آگیا جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑے اب بھی زمین پر زور زور سے پیار رہے تھے۔ وہ شخص باری باری گھوڑوں کو تھپتھپاتا رہا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے ملنگی بادشاہ۔“ اس شخص نے برآمدے کی طرف رخ کر کے کہا، ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور برآمدے کی طرف واپس چلا گیا۔

ٹایاب اپنی جگہ پر کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر بائیں طرف والی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ کھڑکی کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔

اس کمرے کے فرش پر بچھی ہوئی درمی پر رابو بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ دائیں طرف والی دیوار کے قریب دو آوی بٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ملنگی تھا اور دوسرا ٹایاب کے لئے بٹھن۔ اسی دوران وہ تیسرا آوی اندر آگیا جو باہر گھوڑوں کی طرف گیا تھا۔ ”اسے ہوش میں لاؤ ملنگی بادشاہ۔“ باہر سے آنے والے نے کہا۔ ”وہ اڑھائی گھنٹے

سوچ رہا ہوں کہ ابھی نکل جاؤں۔ اگر حمیس اس لڑکی کو سنبھالنے میں کوئی دشواری ہو تو میر کو اپنے پاس رکھ لو۔ میں امین اور مقصود کو لے کر چلا جاتا ہوں۔ کوٹ اعظم کے چودھری امام اللہ نے بھی ایک کام کہا ہوا ہے اور کل وہ کام ہر صورت میں کرنا ہوگا ورنہ مجھے پھانسی کے رقم واپس کرنی پڑ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے حاکم بھائی۔“ ملنگی نے کہا۔ ”میر کو چھوڑ جاؤ اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کل یا پرہن سنہاری رقم پہنچ جائے گی۔“

”اگر رقم کی فکر نہیں یار۔“ حاکم نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم چلے ہیں اور یہ لڑکی۔“ اس نے دری پر پڑی ہوئی راہب کی طرف دیکھا۔ ”کوئی بات نہیں پھر بھی سی۔“ اس نے امین اور مقصود کو اشارہ کیا۔

وہ دونوں بھی اٹھ گئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں کمرے سے باہر چلے گئے۔ ٹایپ چند سیکنڈ اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر کھڑکی کی چوکت پر چڑھ کر پڑی آہستگی سے کمرے میں کود گئی اور دپے قدموں چلتی ہوئی راہب کے قریب پہنچ گئی۔

”راہب۔۔۔ راہب۔۔۔“ وہ اس کے گل تپتپاتے ہوئے سرگوشیاں بولے میں بولی۔ ”ہوش میں آؤ راہب۔ میں ٹایپ ہوں۔“

وہ راہب کے گل تپتپاتی رہی لیکن راہب ہوش میں نہیں آئی۔ ٹایپ اٹھ کر دروازے کے قریب آگئی اور جھانک کر باہر دیکھنے لگی۔ وہ چاروں گھونڈوں کے پاس کھڑے ہاتھیں کر رہے تھے۔ ٹایپ واپس آگئی۔ اس نے ایک بار پھر راہب کو ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی تو اس نے راہب کی بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اوپر اٹھایا اور کندھے پر لاڈ کر کھڑی ہو گئی۔

کھڑکی کے قریب آکر اس نے راہب کو چوکت پر نکاڑا اور خود چوکت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ راہب کو کھینچ کر اپنے کندھے پر لاڈا اور تیزی سے کھیتوں کی طرف چلنے لگی۔

ٹایپ دھان پان سی لڑکی تھی اور راہب اس سے زیادہ قد آور اور صحت مند۔ اس کا وزن بھی ٹایپ سے زیادہ تھا لیکن ٹایپ اسے کندھے پر لاڈے جس طرح تیزی سے چل رہی تھی اس پر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی قریبی کھیت میں گھس گئی

ہو چکے ہیں۔ کیا یہ رات بھر بے ہوش رہے گی۔“

”بے ہوش ہے بھی یا اپنے آپ کو بچانے کے لئے کمر کر رہی ہے۔“ ملنگی کے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے کہا۔

”مگر کب تک کرے گی۔“ ملنگی نے جواب دیا۔ ”آج سارا دن تو ہوش میں رہی ہے۔ رات کو اگر امین اس کے ساتھ نہ مار دیتا تو بے ہوش ہی میں رہتی۔“

”اگر میں اس کے ہاتھ نہ مارا تو یہ میرا ہاتھ چاہتا چلی ملنگی بادشاہ۔“ امین غای غصہ نے اپنے ہاتھیں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ کٹائی سے ذرا اوپر کپڑا بندھا ہوا تھا جو خون سے تر ہو رہا تھا۔ ”میں نے اسے ہاتھ ہی تو لگایا تھا۔ حرام زادی ایک دم بوک اٹھی۔ ہوش میں آجائے تو اسے ایسا سبق سکھائوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“

ان کی باتوں سے ٹایپ کو اندازہ ہو گیا کہ راہب پر اگرچہ قہر تھا بہت تشدد ہوا تھا مگر اس کی عزت ابھی تک محفوظ تھی۔ ملنگی کو یہاں دیکھ کر ٹایپ نے بھی سمجھ گئی تھی کہ قہر کے گھر پر حملہ ملنگی کے اشارے پر ہی ہوا تھا۔ وہ اگرچہ خود اس کارروائی میں شریک نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔ ٹایپ کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ حملہ کرنے والے پھر آدمی تھے اور باہر گھوڑے بھی چار ہی تھے۔ ملنگی بعد میں آیا تھا۔ اس حساب سے وہاں پانچ آدمی اور گھوڑے ہونے چاہئیں تھے لیکن ملنگی سمیت تین آدمی تھے۔ ہوسکتا ہے ایک آدمی کہیں چلا گیا ہو لیکن چار گھوڑوں کی موجودگی کے حوالے سے یہاں آدمیوں کی تعداد بھی چار ہی ہونی چاہئے تھی جبکہ یہاں تین آدمی تھے۔ ہوسکتا ہے چوتھا آدمی کسی دوسرے کمرے میں سورا ہو۔

ٹایپ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ چوتھا آدمی بھی دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ٹایپ چوک گئی۔ یہ وہی آدمی تھا جس کا طبع قہر لے بتایا تھا۔ لمبا قد، گول چوخی داڑھی اور ناک پر دائیں طرف مڑکے دانے کے برابر سیاہ سر۔

”کیا پردگرم ہے ملنگی بادشاہ۔“ اس غصہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔ ”چودھری تو آیا نہیں۔ ہمارے لئے کیا حکم ہے۔“

”کل کا دن اور انتظار کرلو۔“ ملنگی نے جواب دیا۔ ”نہیں ملنگی بادشاہ۔“ اس غصہ نے کہا۔ ”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ میں تو

وہ ملنگی تھا جو گھوڑے پر سوار کیتوں کی طرف آتا تھا۔ ٹایا اب اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھی گھوڑے کی آواز سن رہی تھی۔ کتوں کے پودے غاصے اونچے تھے۔ وہ ملنگی کو دیکھ کر نہیں سکتی تھی لیکن گھوڑے کے پیروں میں پودوں کے پکڑے جانے سے وہ اپنے اور ملنگی کے درمیان فاصلے کا اندازہ لگا رہی تھی جو لمبہ پر لمبہ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر ملنگی کا گھوڑا تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر پگھلنے لگی پر رک گیا۔ چند لمبے خاموشی رہی پھر ملنگی کی گونجی ہوئی آواز سنائی دی۔

”راہب! مجھے معلوم ہے تم کیمپوں میں کیسں چھپی ہوئی ہو۔ یہ جگہ آزادی سے بہت دور ہے۔ تم جانتی ہو کہ فوج کر نہیں پاسکو گی۔ یہاں کوئی ہمساری مدد کو بھی نہیں آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تمہیں ایک منٹ دے ہا ہوں جہاں بھی چھپی ہوئی ہو فوج کر سامنے آجائے۔ بصورت دیگر اگر میں نے خود تمہیں تلاش کر لیا تو بہت برا حشر کروں گا تمہارا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔“

فضا میں خاموشی چھا گئی۔ لمحات دیربرے دیربرے بیت رہے تھے۔ ٹایم سانس روکے پے حس و حرکت جینی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو پھولوں کی سرسراہٹ سے ملتی اس طرف متوجہ ہو جائے گا اور پھر اسے اور رابہ کو اس کے قمرے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس نے رابہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت رابہ کا ہوش میں آنا بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

ٹھیک ایک منٹ بعد ملنگی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔
 ”ٹھیک ہے رابع۔ اب ہمیں میں خود ہی تلاش کروں گا اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ بھی تم کو ملے گی۔“

پودوں کے پکلے جانے کی آواز سے نایاب سمجھ گئی کہ مھوڑا آگے جا رہا تھا۔ نایاب نے اطمینان کا سانس لیا اور رابعہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”رابعہ۔۔۔ رابعہ۔۔۔ ہوٹل میں آؤ۔ میں ہوں نایاب۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے

اور پھر ٹھیک اسی لمحہ ایک چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔
 ”ملنگی بادشاہ۔ غضب ہو گیا۔ وہ لڑکی بھاگ گئی۔“ یہ آواز بہر کی تھی۔
 ”بھاگ کھینچتے ہو۔“ ملنگی کی دھڑائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”بے ہوش لڑکی کیسے بھاگ
 سکتی ہے۔“
 ”وہ بھاگ گئی ملنگی بادشاہ۔“ بہر نے چیخ کر کہا۔ ”امین ٹھیک ہی کہتا تھا وہ بے ہوش
 نہیں ہوئی تھی، مگر کربہ تھی۔“

نایاب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں کمرے میں کھڑے تھے اور پھر ان میں سے ایک آدمی جیسے ہی کھڑکی کی طرف 'پکا' نایاب بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گئی اور اس نے راہبر کو بھی احتیاط سے نیچے لٹا دیا۔ کئی کی فصل تھی۔ پودے خالص اودھنے تھے۔ باہر سے انہیں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

نایاب راہجہ کے پاس سانس روکے بیٹھی تھی۔ فضا میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حاکم اور اس کے ساتھی وہاں سے جا چکے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

”باہر نکل کر تلاش کرو اے۔“ ملنگی کی گونجتی ہوئی آواز نایاب کی سماعت سے کھرائی۔ ”وہ دور نہیں جاسکتی۔ اے تلاش کرو۔ اگر وہ بچ کر کھل جی تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ تلاش کرو اے۔“

”پہلے رست ہاؤس کی تلاش تو لے لو ملنگی بادشاہ۔“ ہر کی آواز سنائی دی۔ ”ہو سکتا ہے ہوش میں آنے کے بعد وہ رست ہاؤس کے اندر ہی کہیں چھپ گئی ہو۔“

”دیکھو۔۔۔ دھڑوڑاے اور گولی مار دو۔ اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے۔“ ملنگی دھاڑا۔

نایاب، رائیہ کے پاس بیٹھی رہی۔ رست ہاؤس کی جانب سے بھاگ دوڑ کی آوازیں

سنائی دے رہی تھیں اور پھر وہ آوازیں رست ہاؤس کے باہر سے سنائی دینے لگیں۔

”وہ رست ہاؤس میں نہیں ہے۔“ ملنگی کی چیخیں ہوئی آواز سنا کی دی۔ ”وہ زیادہ دور نہیں مگنی ہوگی۔ تلاش کر اے۔ یہیں کہیں ہوگی۔ تم دریا کی طرف جاؤ۔ میں کیتھوں کی طرف دیکھتا ہوں جلدی کرو۔“

چند لمحے خاموشی رہی پھر گھوڑوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ٹاپوں کی آواز سے

”ملنگی بادشاہ۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ اور ایک گھوڑی دن کے درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میں اسے کھول کر لے آیا ہوں۔“

ملنگی گھوڑے کو بھاگتا ہوا رست ہاؤس کی طرف لے گیا اور پھر اس کی آواز سنائی دی۔

”او! یہ تو ملک سکندر کی گھوڑی ہے۔ اس وقت میرا شک ٹھیک تھا کہ اس طرف کوئی آیا ہے۔ وہ یقیناً ملک سکندر ہوگا۔ ڈھونڈو۔۔۔ تلاش کرو۔۔۔ جو بھی نظر آئے گولی سے اڑا دو۔“

”پانی سر سے گزر چکا ہے ملنگی بادشاہ۔“ میرے جواب دیا۔ ”اب کسی کو تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اس گھوڑی پر ملک سکندر آیا تھا تو اس لڑکی کو بھی دی لے گیا ہوگا اور اب وہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ اپنی خیر متاؤ۔ بہتر ہے کہ یہاں اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارنے کے بجائے بھاگ نکلے یہاں سے۔“

”اگر ملک سکندر اور وہ لڑکی بچ کر نکل گئے تو سمجھ لو دنیا کے کسی کونے میں ہمیں پناہ نہیں ملے گی۔ ان کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ تلاش کرو انہیں۔ وہ یقیناً اسی طرف گئے ہوں گے۔ جہاں گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرف کھیتوں میں ہوں گے۔ چلو میرے ساتھ۔“

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر ٹایاب نے اطمینان کا سانس لیا۔

”وہ لوگ اس طرف گئے ہیں۔“ ٹایاب نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ ہمارے لئے بہترین موقع ہے۔ اگر ہم ان کی طرف نکل چلیں تو ان کے اور ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ سکتا ہے۔ اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔

وہ دونوں جھک کر کھیتوں میں چلتی رہیں۔ پردوں کے کچلے جانے کی آواز ابھر رہی تھی۔ لیکن ٹایاب کو یقین تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ملنگی یا میری آواز نہیں سن سکیں گے۔

وہ اس کھیت سے نکل کر دوسرے اور پھر تیسرے کھیت میں پہنچ گئیں اور پھر درختوں“

فضا تاریکی کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ دونوں ٹھٹھک کر رک گئیں۔ آواز اگرچہ دور کی تھی لیکن ان دونوں کے چروں پر ہلکا سا خوف ابھر آیا تھا۔

رابرہ کے گال چھتپاتے ہوئے ہوئی۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھیں۔

اس مرتبہ ٹایاب کو بالواسطہ نہیں ہوئی۔ رابرہ کسکائی اور پھر اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہونے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر ایک جھنگے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید جتنا چاہتی تھی لیکن ٹایاب نے بڑی بھرتی سے ایک ہاتھ سے اسے دبوچ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا۔ رابرہ اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اسے قابو میں رکھنے کیلئے ٹایاب کو خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ ان کے نیچے پردوں کے دھبے سے بھی اچھی خاصی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

”رابرہ ہوش میں آؤ۔“ ٹایاب نے اسے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ہوش میں آؤ رابرہ۔ میں ہوں ٹایاب۔“

رابرہ کی مزاحمت ماند پڑ گئی۔ وہ ٹایاب کی ہانپوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ٹایاب کی طرف دیکھنے لگی۔

”نا۔۔۔ یا۔۔۔ ب۔۔۔“

رابرہ کچھ کتنا چاہتی تھی مگر ٹایاب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خاموش رہو اور آرام سے بیٹھی رہو۔“ ٹایاب نے سرگوشی کی۔ ”ملنگی اور اس کا ایک ساتھی ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔“ رابرہ اب بھی اس کی ہانپوں میں تھی۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اسی لحد فضا میں ملنگی کی آواز گونجی۔

”رابرہ! تم جہاں کبھی بھی چھپی ہوئی ہو، سامنے آ جاؤ۔ تم بچ کر نہیں جاسکو گی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ آواز سن کر رابرہ کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ ٹایاب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ملنگی کی ٹھپے میں بھری ہوئی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ وہ ان کے قریب سے گزرتی رہی۔ کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر بھرپور چیتنی ہوئی آواز سنائی دی۔

تو باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ ٹایاب اس کا بازو پکڑے اسے کہنے لے جاری تھی۔
فائزنگ کی آواز ایک مرتبہ اور سنائی دی تھی۔ لیکن وہ آواز بہت دور کی تھی جس کا
مطلب تھا کہ ان کے اور ملنگی وغیرہ کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ حاصل ہو گیا تھا لیکن
ٹایاب کے خیال میں وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں تھیں۔ ملنگی اور میر کے پاس گھوڑے
تھے۔ وہ ان کی تلاش میں کسی بھی وقت اوھر آسکتے تھے۔ اس لئے کہیں رکنا ٹایاب کے
خیال میں خطرے سے خالی نہیں تھا۔

وہ دونوں کمپوں میں پکڑے ہوئے رہے۔ ٹایاب بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔
لیکن فی الحال تعاقب کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔
وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتی رہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا
کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرف جاری ہیں۔ رات کا پچھلا تھا۔ دور دور تک کسی بستی
کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ دونوں صحرائے عرب میں چل رہی تھیں۔ ان کے لئے چلنا اب بہت مشکل ہو گیا تھا۔
اوپر نیچے پکڑے ہوئے رہے۔ ان دونوں کو بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔
”اب تو بالکل نہیں چلا جاتا ٹایاب!“ رابعہ نے رک کر کہا۔ ”اب تو ہم ان لوگوں
سے بہتر دور آچکے ہیں۔ تھوڑی دیر کیلئے کہیں رک جاؤ۔“
”ہاں۔ اب مجھ سے بھی نہیں چلا جاتا۔“ ٹایاب بولی۔ ”تھوڑا سا اور چلو۔ کوئی مناسب
جگہ نظر آئے تو تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔“

وہ ایک بار پھر چلے گئیں۔ ٹایاب کی ٹانگیں بھی شل ہو گئی تھیں۔ اگر راستہ سیدھا اور
ہموار ہوتا تو وہ میلوں کا فاصلہ بغیر تھکان کے طے کر سکتی تھیں۔ لیکن اوپر نیچے پکڑے ہوئے
کہیں کچھ کہیں پانی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی ابھی اللہ رہی تھیں۔

تقریباً دو گھنٹوں کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک جگہ رک گئیں۔ آگے آگے کھیت کے
برابر جگہ خالی تھی۔ ایک طرف گھاس پھوس کا ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا اور اس سے ذرا
فاصلے پر بھوسے کے بڑے بڑے ڈمیر تھے جن پر پٹے گارے سے لپائی کی ہوئی تھی۔ گاؤں
درساتوں میں بھوسے کو محفوظ رکھنے کے لئے اسی قسم کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

وہ جھونپڑے سے کچھ دور رک گئیں۔ ٹایاب جھونپڑے کے اندر کسی کی موجودگی کا

”دور نہیں۔“ ٹایاب بولی۔ ”شاید انہیں کسی جڑ پر شبہ ہوا ہوگا جس پر انہوں نے
گولیاں چلا دیں۔ تم چلتی رہو۔“

وہ ایک بار پھر جگہ کرکھٹوں میں چلتی رہیں۔ اگرچہ اندھیرا تھا لیکن سیدھی ہو کر
ہوئے وہ کوئی خطہ مائل نہیں لینا چاہتی تھیں۔ ملنگی اور میر شکاری کتوں کی طرح انہیں
تلاش کر رہے تھے اور اب تو انہوں نے راکفل کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ انہیں
جگہ بھی شبہ ہوتا وہ گولیاں چلا دیتے۔ گولیاں کی آواز اب بار بار انہیں گونج رہی تھی۔
آگے ایک جھوٹا سا کھل (ندی) تھا۔ اندھیرے میں وہ اس کھل کو نہیں دیکھ سکتے
رابعہ شراب سے کھل میں گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔

”اے کیا ہوا؟“ ٹایاب اس کی چیخ سن کر بدحواس سی ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ
بھی پھسل کر ندی میں گر گئی۔

”اب پتہ چل گیا“ مجھے کیا ہوا تھا۔“ رابعہ ہنس پڑی۔

”آواز کا ولیم کم رکھو۔“ ٹایاب بولی۔ ”سنائے میں ہلکی سی آواز بھی دور تک نہ
دیتی ہے اور وہ دونوں بھڑپے ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اب اس ندی سے ٹھکرا
سانے والے کھیت میں گھس جاؤ۔“

ندی کے کنارے کی مٹی چٹنی تھی۔ پہلے ٹایاب نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو وہ
مرتبہ پھسل کر گری۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تمام کر ندی سے باہر آ گئیں۔

وہ دونوں سرٹاپا شرابور ہو گئی تھیں اور پانی ان کے کہڑوں سے ٹپک رہا تھا۔ ٹایاب
ریسٹ ہاؤس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ وہاں سے خاصی دور آگئی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس کی
کھڑکی کے بستہ درے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کے آس پاس کوئی اور سرگرمی
نہیں ہوئی۔ ملنگی اور میر غالباً رابعہ کو اس طرف ڈھونڈ رہے تھے جہاں انہیں گھو
بندھی ہوئی لی تھی۔ ملنگی نے ملک سکندر کی گھوڑی پچکان لی تھی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ
سکندر یہاں پہنچ گیا تھا اور وہی رابعہ کو ریسٹ ہاؤس سے نکال لے گیا ہے۔ انہیں
سکندر کی ہی تلاش رہی ہوگی۔

کیلے کہڑوں کی وجہ سے ان کیلئے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر
فہشتی ہوا چل رہی تھی۔ کہڑے بیک جانے کی وجہ سے انہیں سرودی لگنے لگی تھی۔

بھی میرا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ بلکہ میرا حوصلہ کچھ اور بڑھا ہے۔“

”آفرین ہے رابعہ۔“ ثایاب نے اس کی پیشانی پر ہوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر عورتوں میں تم جیسا عزم اور حوصلہ پیدا ہو جائے تو یقین کرو کوئی عورت کسی کے ظلم کا شکار نہ ہو۔ ظلم کا نام دشمن تک مٹ جائے۔“

رابعہ اس کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ روٹی تو نہیں لیکن ثایاب نے محسوس کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر ہچکچاہٹیں لے رہی تھیں۔ ثایاب نے اسے کچھ اور بھیج لیا اور اس کے بالوں میں اٹھکلیاں پھیرنے لگی۔ رابعہ واقعی بہت حوصلہ مند لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ بہت دیر بعد رابعہ کی حالت سنبھل سکی تھی۔ وہ سر اٹھا کر ثایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے بتایا نہیں کہ وہاں کیسے پہنچی تھیں۔ کیا گاؤں کے مرد ان کے تعاقب میں نہیں نکلے تھے؟“

”گاؤں کے مرد تو اسی وقت ان کے تعاقب میں نکل گئے تھے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”وہ کل شام تک ان درندوں کو تلاش کرتے رہے لیکن ان کا یا تمہارا کوئی سرخ نہیں ملا۔“

”پھر۔۔۔ تم کیسے وہاں پہنچ گئیں؟“ رابعہ نے پوچھا۔

”اس بات پر مجھے خود حیرت ہے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”میں آدھی رات تک زرخس وغیرہ سے بائیں کرتی رہی۔ پھر وہ تو سو گئیں لیکن مجھے نیند نہیں آسکی۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی کہ دفعتاً میرے پورے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دماغ میں تیز سنسناہٹ ہونے لگی اور پھر میں جیسے اپنے آپ کو بھول گئی۔ میں ثایاب نہیں رہی تھی۔ میرے اندر کوئی پراسرار اور افق انظرت ہستی طویل گرمی تھی۔ اب مجھے وہ سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ اس ناپید اور پراسرار ہستی نے جیسے مجھے کرسی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے اٹھ کر سکندر بھائی کی گھوڑی کھولی اور جب گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو سکندر بھائی گھوڑی کے ہنسنے کی آواز سن کر جاگ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش لیکن میں نے جیسے ان کی آواز ہی نہ سنی ہو۔“

اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی پھر رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ جموٹنڈا خالی تھا۔ زمین پر پیال بھیجی ہوئی تھی۔ وہ اس پیال پر مگرسی گئیں اور دیر تک لیے لیے سانس لیتی رہیں۔

”میرا خیال یہ ہے جبکہ ہمارے لئے محفوظ ہے۔“ ثایاب بولی۔ ”ہم صبح کی روشنی ظہور ہونے تک بیٹھیں رہیں گی۔ اس دوران اگر کوئی آگیا تو ہم آسانی سے کھیت میں چھپ سکتی ہیں۔“

”خدا کرے کوئی اس طرف نہ آئے۔“ رابعہ بولی۔ ”تم یہاں تک کیسے پہنچ گئی تھیں ثایاب۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ میرا لایا اور بھائی کیسے ہیں۔ ان درندوں نے ان پر لاشیوں اور کھانڈیوں سے دار کئے تھے۔ خدا عافیت کرے ان لوگوں کو۔“

”رابعہ۔“ ثایاب نے کہتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ”یہ لوگ واقعی درندے ہیں۔ انسانیت ان لوگوں کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ تم حوصلہ رکھو رابعہ۔ خدا ظالموں کی رسی دراز ضرور کھینچتا ہے لیکن اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہوتی ہے۔ انہیں اس کے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔“

”کیا کتنا چاہتی ہو ثایاب؟“ رابعہ نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر آئی تھی۔

”رابعہ میری بہن۔“ ثایاب نے اسے بھیج لیا۔ ”تمہارے ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان ظالموں نے مار ڈالا انہیں۔ اور تمہارے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا۔“ بات کرتے ہوئے ثایاب کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”اور میرا کیا؟“ رابعہ بولی۔ اس کا لبہ قہر قہر رہا تھا۔

”وہ معمولی زخمی ہوا ہے اور ٹھیک ہے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”دیکھو رابعہ! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں تم پر ظلم ہوا ہے۔ ان درندوں نے۔۔۔“

”میرے اندر بڑا حوصلہ ہے ثایاب۔“ رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تمہیں یاد ہے کہ ایک روز میں نے کہا تھا کہ میں ظلم کے خلاف اس جنگ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ میرا حوصلہ بہت بلند ہے۔ اپنے گھر کے راکھ ہو جائے اور اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر

گاؤں کے کئی گھروں کو برباد کر ڈالا ہے۔

”ہاں راہبہ۔“ غایاب ہوئی۔ ”اب میرا عزم یہی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ یہاں مجھے چند عرصے دوست مل گئے ہیں۔ کل کے المونٹاک واقعہ کے بعد قیوم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مورد الزام ٹھہرائے گا اور مجھ سے نفرت کرے گا۔ مجھ پر حقو کے کا ٹکڑا۔ اس نے مجھ سے نفرت نہیں کی۔ میرے منہ پر حقو کا نہیں۔ وہ تو مجھ سے زیادہ پر عزم نکلا۔ جانتی ہو اس نے کیا کیا تھا؟“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے ہوئی۔ ”اس نے کہا تھا“ غایاب بن اگر میرے پاس کچھ اور بھی ہوتا تو میں وہ بھی قربان کر دیتا۔“

”اس نے ٹھیک کہا تھا غایاب!“ راہبہ نے کہا۔ ”مہم فریوں کے پاس صرف غلوس اور محبت ہی ہوتی ہے جو ہم دوسروں پر نچھاور کرنے میں بھلی سے کام نہیں لیتے۔ ہمارا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ باپ کو مار دیا گیا لیکن تمہارے لئے ہمارے غلوس اور محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ تم نے میری عزت بچائی ہے۔ آج اگر تم وہاں نہ پہنچتیں تو میں برباد ہو جاتی۔ میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھول سکوں گی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وقت آنے پر دیکھ لو گی کہ میں اپنی جان بھی تم پر نچھاور کر دوں گی۔“

”مجھے تمہاری جان کی نہیں“ تمہاری ضرورت ہے۔“ غایاب اس کا گلہ چھپتا ہے ہوئے ہوئی۔ ”اچھا اب ایسا کہ رات اپنے آخری لمحوں پر ہے اور یہ بجلی ہمارے لئے محفوظ بھی ہے، تم ہیام لیٹ کر تھوڑی سی نیند لو۔ میرے کھنچے پر سر رکھ لو اور لیٹ جاؤ۔“

”نہیں غایاب! تم سو جاؤ۔ میں جانتی ہوں۔“ راہبہ ہوئی۔

”مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تم سو جاؤ تھوڑی دیر کے لئے۔ شاباش۔ اچھی لڑکی!“ غایاب نے کہا۔

راہبہ نے اس کی طرف دیکھا اور پال پر ٹانگیں پہار کر سراس کی گود میں رکھ دیا۔ غایاب اس کے بالوں میں اٹھیاں پھیرنے لگی۔ چند منٹ بعد ہی راہبہ سو چکی تھی۔

غایاب جھکی کی کھڑکی سے نیک لگائے بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر اب بھی تاریکی تھی اور سناٹا تھا۔ ملنگی اور اس کا سامنے بھی شاید اب مایوس ہو کر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔

گھوڑی پر زین نہیں تھی۔ منہ میں لگام بھی نہیں تھی۔ گلے میں دسی بندھی ہوئی تھی۔ تم جانتی ہو میں گھڑ سواری سے ڈرتی ہوں لیکن میں اچھل کر گھوڑی کی بچی بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ سکندر بھائی کھیتوں میں بہت دور تک میرے پیچھے آئے تھے۔ وہ مجھے آواز میں دے دے کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں مڑ کر دیکھنے بغیر گھوڑی کو سہٹ دوڑاتی رہی۔ رات کی تاریکی! اجنبی راستے مجھے بالکل ڈر نہیں لگا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ وہ گھوڑی خود ہی مجھے لے کر اڑی جا رہی ہے لیکن اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں خود ہی اسے گردن پر ہاتھ مار مار کر مختلف سمتوں میں موڑتی رہی ہوں۔ میں اس علاقے میں کبھی نہیں آئی لیکن وہ راستے میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا جانا ہے۔ یا بالفاظ دیگر میرے اندر سائی ہوئی اس پر اسرار قوت کو معلوم تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہے۔ دراصل وہی پر اسرار قوت مجھے لے جا رہی تھی۔

وہ عمارت دیکھ کر میں نے گھوڑی روک لی۔ اب وقت میں جیسے کسی مدد تک ہوش میں آ رہی تھی۔ میرے خیال میں گھوڑی کو آگے لے جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے گھوڑی کو کچھ دور دن کے ایک پورے سے پانچہ دیا اور خود مختار انداز میں چلتی ہوئی اس عمارت تک آگئی اور پھر میں نے جن میں ایک کمرے میں بے ہوش پڑے ہوئے دیکھ لیا۔ ملنگی اور اس کے ساتھی بھی وہاں موجود تھے اور پھر وہ لوگ جیسے ہی کمرے سے نکل کر باہر گئے، میں کھڑکی سے کود کر اندر داخل ہوئی اور جن میں اٹھا کر کھڑکی ہی کے راستے باہر لے آئی اور اس کھیت میں چھپ گئی۔ انہیں جلد ہی تمہاری گمشدگی کا پتہ چل گیا۔ وہ لوگ سمجھے کہ شاید تم ہوش میں آ کر کمرے سے بھاگ گئی ہو۔ وہ پہلے تو صرف جن میں تلاش کرتے رہے پھر انہیں سکندر بھائی کی گھوڑی مل گئی اور وہ تمہارے ساتھ سکندر بھائی کو بھی تلاش کرنے لگے۔ اس کے بعد اب تک جو کچھ جیتی ہے وہ تم جانتی ہی ہو۔“

”تم بہت عظیم ہو غایاب!“ راہبہ اس کے گل پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ہوئی۔

خوشی میں میں یہی سمجھتی رہی کہ تم صرف اپنی جائیداد کا حصہ لینے کیلئے یہاں آئی ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ پتہ چلا گیا۔ اس روز تم نے اپنے گھر میں پہلی مرتبہ تلے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جن میں دولت کی ہوس نہیں ہے۔ تم نے جائیداد میں جسے کی تو محض آڑ لے لی ہے اور تم دراصل اس ظلم کا خاتمہ کرنا چاہتی ہو جس نے اس

تائے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی خوف ابھر آیا۔
 ”کون ہو تم لوگ۔ باہر نکلو۔“ اس شخص نے گھور کر کہا۔
 نایاب نے رابعہ کی طرف دیکھا اور پھر اپنی جگہ سے سرک کر اس کے سامنے آگئی اور
 اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ہم۔ جو تم نہیں ہیں۔ رات کو گاؤں جاتے ہوئے راستہ بھٹک گئی تھیں۔ یہ بجلی
 دیکھی تو رات گزارنے کیلئے یہاں پناہ لے لی۔“
 ”باہر تو آؤ۔“ دیکھتا ہو تم لوگ کون ہو۔“ اس شخص نے کہا۔

نایاب نے رابعہ کو کہنی سے ہٹا سا شوک دیا اور پیال پر سرکئی ہوئی باہر آگئی۔ رابعہ
 بھی اس کے پیچھے کی باہر آئی تھی۔ اگرچہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا لیکن دن کی روشنی پھیلی
 ہوئی تھی۔ وہ دونوں جموہڑی سے باہر آکر اس شخص کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس شخص کے
 قریب ہی گارے میں تھمرا ہوا ایک چھاؤں بھی پڑا تھا۔ یہ تو رابعہ نے بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ
 آدھی ملنگی کے ساتھیوں میں سے نہیں تھا اور اس چھاؤں کو دیکھ کر نایاب بھی یہ سمجھ گئی
 تھی کہ وہ کوئی کاشنکار ہے اور شاید یہ زمین اور یہ بجلی اسی کی تھی۔

”کون ہو تم لوگ اور یہ بتاؤ یہاں کیوں چھپی ہوئی تھیں۔ کہاں سے آئی ہو؟“ اس
 شخص نے پوچھا۔ بندوق اب بھی اس نے تان رکھی تھی۔
 ”میں نے کہا تاکہ ہم گاؤں جاتے ہوئے راستہ بھٹک گئی تھیں اور یہ جموہڑی دیکھ کر
 یہاں رک گئی تھیں۔“ نایاب نے جواب دیا۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر بڑی حد تک قابو
 پا چکی تھی۔

”راستہ بھٹک گئی تھیں یا کوئی اور معاملہ ہے۔“ اس شخص نے باری باری دونوں کو
 گھورا۔ ”تم دونوں کی حالت کسی گریز کا پتہ دے رہی ہے۔ لگتا ہے گھر سے بھاگی ہوئی ہو۔“
 کہاں کی رہنے والی ہو۔“

”پیر آبادی۔“ نایاب کے بجائے رابعہ نے جواب دیا۔ ”میں نواب دین مالشی کی بیٹی
 ہوں اور۔۔۔“

”نواب دین مالشی۔“ وہ شخص چونک گیا۔ ”وہ شخص کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس
 کا گھر بھی جلا دیا ہے۔ ہمارے پڑ کے تین چار بندے پیر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مگر ہم نے تو

اس صورتحال سے نایاب کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اس ساری کارروائی میں چودھری
 سعادت کا ہاتھ تھا۔ اس نے اس رست ہاؤس میں ملنگی اور اس کے ساتھیوں کو ہاتھیں
 کرتے سنا تھا۔ حاکم خان نے کہا تھا کہ چودھری تو کیا نہیں اور وہ اس کے انتظار میں زیادہ
 دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ اس کی اس بات سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے
 شدہ پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ جانتے تھے کہ چودھری سعادت شرمگیا ہوا
 تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شرمی چلا گیا ہو لیکن پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے آج
 یہاں آنا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے نہیں آسکا تھا اور اس کے نہ آنے سے ہی رابعہ کی عزت
 بھی بچ گئی تھی۔ یہاں ملنگی کی موجودگی بھی یہ ثابت کرتی تھی کہ یہ سب کچھ چودھری
 سعادت کے اشارے پر ہوا تھا۔ وہ صبح چوبیس بجے تک تو گاؤں ہی میں رہا تھا لیکن صورتحال کا
 اندازہ لگانے کے بعد گاؤں سے بھاگ کر اسی دیران رست ہاؤس میں گیا تھا۔ اس ٹھکانے
 کا بندوبست بھی انہوں نے پہلے سے کر رکھا ہوگا۔ انہیں یقین ہوگا کہ وہ یہاں محفوظ رہیں
 گے۔ یہ رست ہاؤس ان کے گاؤں سے اتار دوڑ تھا کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر
 چودھری سکندر کی گھوڑی دیکھ کر وہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ خود ان کی تلاش میں یہاں پہنچ گیا
 ہے۔ وہ لوگ یہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نایاب انہیں تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچ جائے
 گی۔

نایاب یہی سب کچھ سوچتے ہوئے بجلی سے باہر دیکھتی رہی۔ رات کی تاریکی اب دن
 کے پتلے ابلے میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ نایاب کے تونی دھیلے پر رہے تھے۔ اسے داغ
 پر بو بھل پن سا محسوس ہونے لگا۔ اس پر فینڈ کا ظہور ہوا تھا۔ وہ بار بار سر کو جھٹکتے ہوئے
 جانتے رہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی آنکھیں
 بند ہو گئیں اور سر پٹے پر جھٹکا چلا گیا۔ وہ سو گئی تھی۔

نایاب کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہوئی لیکن ایک فراغت سن کر اس کی آنکھ
 کھل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جموہڑی کے دوداڑے
 کے سامنے ایک آدھی بندوق تائے کھڑا تھا۔

مارے خوف کے نایاب کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے
 سیدھی ہو کر بیٹھنا چاہا تو رابعہ بھی جاگ گئی اور پھر جموہڑی کے سامنے ایک آدھی بندوق

”پتہ نہیں پڑا میں تو سیرے چار بجے پنڈ سے نکل آیا تھا۔ دن چڑھے کوئی آگیا تو پتہ نہیں۔ تم لوگ مسموم پانی دیکھ کر آؤں تو چلے ہیں۔ پنڈ میں داخل ہونے سے پہلے تم لوگ کسی جگہ رک جانا۔ میں آگے جا کر دیکھ آؤں گا۔“

اس کسان کا نام احمد دین تھا۔ اس نے ہندوئ کدھے پر ٹانگ لی اور پھاؤڑا اٹھا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے پھاؤڑا جھگی کے اندر رکھ دیا اور ان دونوں کو ساتھ لیکر کھیتوں میں گھنڈیڑی پر چلے لگا۔

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ صبح کی نرم دھوپ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ٹایاب اور راہبہ احمد دین کے پیچھے پیچھے چلتی گاڑی وہاں سے تقریباً نصف میل دور تھا۔ راہبہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ اگر ملکی اور اس کا ساتھی انہیں تلاش کرتے ہوئے اس گاؤں میں پہنچ گئے تو کیا ہوگا۔ یہ خوف ٹایاب کے دل میں بھی تھا لیکن وہ زیادہ پریشان نہیں تھی۔

کھیتوں میں کسان اور مزارع اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ احمد دین ان کے ساتھ کھیتوں میں ایسی گھنڈیڑیوں پر چل رہا تھا کہ دوسرے لوگوں سے دور ہی رہے۔ ویسے بھی ان کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی تھی۔

گاؤں تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ گاؤں کے باہر سکول تھا۔ اس پرائمری سکول کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کے سامنے کی طرف چار دیواری میں کھرا ہوا میدان بہت بڑا تھا۔ عمارت کے پچھلی طرف بھی کھلی جگہ تھی جو چار دیواری میں گھری ہوئی تھی۔ چار دیواری کے ساتھ چاروں طرف ٹالی کے درخت تھے۔

احمد دین نے انہیں سکول سے دور ہی روک لیا تھا۔ یہاں بھی ٹالی کے چند درخت تھے جن کے نیچے زمین میں جگہ جگہ کونے کڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دو کھولیاں بھی تھیں اور زمین پر چاروں طرف گوبر کھرا ہوا تھا۔ اس جگہ یقیناً مویشی پانڈھے جاتے ہوں گے۔ لیکن اس وقت وہاں نہ کوئی مویشی تھا اور نہ ہی کوئی انسان۔

”تم لوگ یہاں روکو۔ میں چودھری فرمان کے گھر پہنچ کر آؤں گا۔“ احمد دین نے کہا اور اس نے اپنی گلی میں سے ان کا گھر۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ احمد دین نے کہا اور انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

ادھر سے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ سکول کی دیوار کے قریب سے ہو کر گزرتا

سنا تھا کہ ڈاکو نواب دین کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔“

”ٹھیک سنا تھا تم نے۔۔۔“ اس مرتبہ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”یہ نواب دین کی بیٹی ہے۔ راہبہ۔۔۔ مجھے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ ڈاکوؤں نے اسے کہاں چھپایا ہے۔ میں اسے چھڑا کر لاری تھی، ان لوگوں کو پتہ چل گیا۔ وہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ ان سے بچنے کیلئے ہم یہاں چھپ گئی تھیں۔“

”وہ!“ اس شخص نے ہندوئ پیچھے جھکا۔ ”راہبہ بیٹی! تمہارے باپ کی موت کا بڑا افسوس ہوا۔ میں اس سے کبھی ملا تو نہیں مگر سنا ہے بڑا ٹیک بندہ تھا۔ اور پتر تم کوں ہو؟“

”اس کا نام ٹایاب ہے۔“ راہبہ ٹایاب سے پہلے بول پڑی۔ ”یہ ہمارے پنڈ کے چودھری امانت علی کی بیوی ہے۔ اس کا بندہ بھی پانچ سال پہلے قتل ہو گیا تھا۔ ان میں جائیداد کا جھگڑا چل رہا ہے اور یہ اسی سلسلے میں گاؤں لٹی ہوئی ہے۔“

”وہ۔۔۔ وہ شخص ایک بار پھر چوک گیا۔“ چودھری کے اس بھڑکے کا تو بڑا چرچا ہے۔ خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ تم لوگ گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تم کون ہو چاہا؟“ راہبہ نے پوچھا۔

”میں اس پنڈ کے چودھری فرمان کا کارندہ ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”آج صبح چار بجے ہمارے کھیتوں میں پانی کی بادی تھی۔ میں صبح چار بجے کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا۔ ابھی ادھر کے کھیت میں پانی لگا کر آیا ہوں۔“

”مگر یہ ہندوئ؟“ ٹایاب نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس علاقے میں سور بہت ہوتے ہیں۔ اکاڑا آدمی کو دیکھ کر حملہ کر دیتے ہیں اور رات کو تو یہ اور بھی خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے رات کو جب زمینوں پر پانی کی بادی ہوتی ہے تو میں ہندوئ ساتھ لے کر آتا ہوں۔“

”یہ کونسا پنڈ ہے چاہا؟“ راہبہ نے پوچھا۔ ”یہ خان کوٹ ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”وہ سامنے نظر آ رہا ہے پنڈ۔ اگر تم لوگ کو تو میں تمہیں چودھری فرمان کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ تمہیں پیر آباد پناہ دے گا۔“

”پنڈ میں کوئی گزیر تو نہیں ہوگی چاہا؟“ راہبہ بولی۔ ”میرا مطلب ہے وہ ڈاکو ہمیں تلاش کرتے ہوئے وہاں تو نہیں پہنچ گئے ہوں گے۔“

ہوئی کھیت سے باہر آگئیں۔

احمد دین کے ساتھ ایک اوجیز عمر بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس کے سر کے سفید بال قریب سے تراشے ہوئے تھے اور مونچیں بھی سفید تھیں۔ اس نے لاپہ اور بوسکی کی قبض پٹن رکھی تھی۔ وہ چودھری فرمان تھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم لوگ ذکر کسیں چلی گئی ہو۔“ احمد دین نے کہا۔ ”یہ چودھری فرمان علی ہیں۔ یہ کسیں جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں تم دونوں کے بارے میں بتا دیا ہے اور چودھری جی۔۔۔ یہ راجہ ہے۔ نواب دین باغلی کی بیٹی اور یہ چودھری امانت علی کی بہو ہے۔“

”ان دونوں نے سلام کیا۔

”جیتتی رہو بیٹی۔“ چودھری فرمان نے کہا اور ان دونوں کو نیچے سے اوپر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”گھبراؤ نہیں بیٹی۔ احمد دین نے مجھے بتا دیا ہے۔ میں تمہاری چاہی کے ساتھ نور پور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تم دونوں کو راستے میں بچر آباد چھوڑ دوں گا۔“ چلو۔ گھر چلو۔ پسے اپنے طے دست کرو۔“ پھر چلیں گے۔“

”شکریہ چودھری جی!“ نایاب بولی۔ ”ہمارے تلاش میں اس طرف کوئی آیا تو نہیں؟“ ”ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ لیکن ڈرو نہیں۔ اب جہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوئی آہی گیا تو ہم دیکھ لیں گے۔“ چودھری فرمان نے کہا۔

چودھری فرمان انہیں اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی نور فاطمہ بھی زرق برق کپڑے پہنے تیار بیٹھی تھی۔ جبکہ جوان بیٹی عام گھریلو کپڑوں میں تھی۔

”یہ لڑکیاں کون ہیں چودھری جی۔ ان کو گھر کیوں لے آئے ہو۔“ چودھرانے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بچر آباد کے چودھری امانت علی کی بہو ہے اور یہ نواب دین باغلی کی بیٹی راجہ“ جس کے بارے میں کل سے چرچا ہو رہا ہے۔ ڈاکو اس کے باپ کو قتل کر کے اسے اغوا کر لے گئے تھے اور یہ لڑکی اسے چھڑا کر لائی ہے۔ ڈاکوؤں کے خوف سے یہ دونوں کھیتوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ احمد دین نے انہیں دیکھا تو لے آیا۔ ہم بھی تو نور پور جارہے ہیں۔ بچر آباد کی طرف سے ہوتے ہوئے چلیں گے اور انہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔“

تھا۔ نایاب اور راجہ اسے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہیں اور پھر نایاب تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”نایاب۔“ وہ راجہ کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ راجہ کہہ رہی تھی۔ ”اگر ملنگی وغیرہ گاؤں میں موجود ہوئے اور انہیں ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”یہی میں بھی سوچ رہی ہو۔“ نایاب نے کہا۔ ”اس لئے میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہی ہوں جہاں چھپا جاسکے۔“

”اس کمیت کی طرف چلیں۔ پٹ سن کے پودے ہمیں اپنے اندر چھپا سکتے ہیں۔“ راجہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

نایاب اس طرف دیکھنے لگی۔ تقریباً دو کھیتوں کے برابر رستے پر پٹ سن گئی ہوئی تھی۔ پتلے پتلے پودے بالکل سیدھے اور سات آٹھ فٹ بلند تھے۔ وہ پودے اس قدر ٹھکان تھے کہ ان کے اندر چھپے ہوئے آدمی کو تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا۔

”ہاں۔ میرا خیال ہے یہی جگہ مناسب ہوگی۔“ نایاب نے کہا۔ اس نے مختار نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر دونوں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پٹ سن کے کمیت میں گھس گئیں۔ ان کے پیر ٹخنوں تک کچھڑ میں دھنسل گئے تھے۔ وہ دس بارہ فٹ سے زیادہ اندر نہیں گئیں۔ کچھڑ میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا اس لئے مجبوراً کمرے ہی رہنا پڑا۔

تقریباً ”تو اٹھنا گزیر کر۔“ اس دوران اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا اور پھر اچانک ہی باتوں کی آواز سنائی دی۔ نایاب نے پودوں میں سے جھانکنا چاہا لیکن پودے اور ان کی جڑیاں اس قدر ٹھکان تھیں کہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ البتہ ایک بھاری آواز ان کی سماعت سے نکلا رہی تھی۔

”کہاں ہیں وہ لڑکیاں احمد دین۔ مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

”میں انہیں یہی چھوڑ کر گیا تھا چودھری جی۔“ یہ احمد دین کی آواز تھی۔ ”وہ بہت ڈری ہوئی تھیں۔ شاید کبیں چھپ گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں جی۔“

ایک لمحہ کو خاموشی چھا گئی پھر احمد دین کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ راجہ کا نام لیکر آوازیں دے رہا تھا۔ نایاب نے راجہ کی طرف دیکھا اور پھر وہ ہاتھوں سے پودوں کو ہٹاتی

گوڑا۔ چودھری فرماں اور چوہدرانی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور رابعہ بچھلی سیٹ پر۔ ان دونوں نے بھی سفید چادریں اوڑھ لی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے چہرے بھی چادروں میں چھپا لئے تھے۔

ایک کے ساتھ تین گھڑ سوار تھے۔ ایک یکے کے آگے اور دو پیچھے۔ تینوں نے کندھوں پر بندوقیں لٹکا رکھی تھیں جبکہ چودھری فرماں نے بھی گلے میں پتول کا بیٹ سجا رکھا تھا۔ رابعہ یا رابعہ میں سے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ چودھری نے تینوں مسلح گھڑ سوار صرف ان کی حفاظت کے خیال سے ساتھ لئے تھے۔

ایک کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر دوڑتا رہا۔ خان کوٹ نامی اس گاؤں سے نورپور تک جانے کا راستہ اگرچہ دوسرا تھا اور قریب بھی تھا جبکہ پیر آباد کی طرف سے جانیوالا راستہ تقریباً دو میل زیادہ تھا۔ لیکن ان دونوں کی وجہ سے چودھری کو یہ طویل راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔

تقریباً ”بڑھ گھٹنے تک یکہ کھیتوں کے درمیان اس کچے کچے راستے پر دوڑتا رہا۔ کہیں تو یہ راستہ کچی سڑک کی طرح ہموار تھا اور کہیں اس طرح ٹوٹا پھوٹا کہ یکہ بری طرح اچھل پڑتا۔

ایک ایک جگہ رک گیا۔ رابعہ نے مڑ کر دیکھا۔ بائیں طرف برگد کا وہ درخت تھا جس کے نیچے ٹوٹا پھوٹا چوڑا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جسے رانی شبا کے قہے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس درخت سے چند گز آگے گھڑوں والا ٹیلہ شروع ہو جاتا تھا۔

”ایک بات ہے فرماں چاہا۔ یکہ کیوں روک لیا؟“ رابعہ نے پوچھا۔
”کھیتوں کی طرف سے تین چار آدمی آرہے ہیں۔ انہیں دیکھ لیں تو پھر چلیں۔“ چودھری فرماں نے جواب دیا۔

رابعہ نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ چار آدمی تھے جو کھیتوں میں میڈنڈے پر چلتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے ان میں سے ایک کو دیکھ کر رابعہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ جبر تھا جسے گزشتہ رات اس نے ملٹکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ رابعہ نے رابعہ کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ ان دونوں نے اپنے چہرے کچھ اور بھی چھپا لئے۔ چودھری فرماں کے تینوں گھڑ سوار بندے بھی حلقہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے بندوقیں

”آپ نے بہت اچھا کیا چودھری جی کہ انہیں گھر لے آئے۔“ چودھری نے کہا۔ پھر بچی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شواں! انہیں اندر لے جا۔ ان کے گلے درست کر۔ اپنے کپڑے دے انہیں پہننے کے لئے اور کچھ کھانے کو بھی دے انہیں۔ پتہ نہیں کب سے انہوں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ جا۔ اندر لے جا انہیں۔ ہم ذرا گھر کر چلے جائیں گے۔“ رابعہ اور رابعہ شواں کے ساتھ حویلی کے اندر دینی میں چلی گئیں۔

”اؤئے احمد دین۔“ چودھری فرماں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم جاؤ اور مراد کو یہاں بھیج دو۔ اس سے کہہ دو بندے اور بھی تیار کر لے۔ وہ تینوں گھوڑوں پر ہمارے ساتھ نورپور جائیں گے اور ان سے کہنا اسلحہ وغیرہ ساتھ لیکر چلیں۔“

”اچھا جی۔“ احمد دین کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

حویلی کا اندر دینی حصہ بھی کافی کشادہ تھا۔ شواں نے اپنے کپڑوں کے دو جوڑے نکال دیئے۔ ان دونوں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لئے اور بال وغیرہ سونارنے لگیں۔ اس دوران شواں ان کے پاس ہی رہی تھی۔ اس نے برا شرتا ہوئے رابعہ اور رابعہ کو بتایا کہ اس کے ماں باپ اس لڑکے کو دیکھنے کیلئے نورپور جا رہے ہیں جس کا اس کیلئے رشتہ آیا ہوا ہے۔

”بھرتو تم بڑے غلط وقت پر یہاں آ گئی ہیں۔“ رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تمہارے والدین کو تو نورپور کا آدھا راستہ طے کر لینا چاہئے تھا۔ ہماری وجہ سے انہیں رکنا پڑا۔ تمہیں برا لگ رہا ہوگا۔“

”کیوں جی۔ برا کیوں لگے گا۔“ شواں نے کہا۔ ”اچھا ہوا آپ دونوں یہاں آ گئیں۔ ورنہ پتہ نہیں کیا کیا مصیبتیں جھیلنا پڑتیں آپ کو۔“

رابعہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ نوزائی نے آ کر بتایا کہ ان دونوں کے لئے ناشتہ تیار ہو چکا ہے۔ شواں انہیں باورچی خانے سے ملحق کمرے میں لے آئی اور یہاں بیٹھ کر وہ دونوں ناشتہ کرنے لگیں۔ پراٹھوں کے ساتھ کھن اور رات کا پکا ہوا ساگ تھا۔ رابعہ نے خوب جی بھر کر ناشتہ کیا۔

ناشتہ کرنے کے دس منٹ بعد وہ لوگ روانگی کیلئے تیار ہو گئے۔ حویلی کے سامنے چودھری فرماں کا یکہ تیار کھڑا تھا۔ سیٹوں پر سفید پوش، چمکا ہوا یکہ اور سفید سمدرست

”یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔“ چودھری نے جواب دیا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ گھر سے بھاگی ہوئی وہ لڑکی میرے ساتھ ہوگی۔“

”نہیں چودھری جی۔“ ہیر نے کہا۔ ”لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم اپنی تسلی کے لئے ان کے چہرے دیکھ لیں۔“

”اگر دوسری مرتبہ تمہارے منہ سے یہ بات نکلی تو گولی سے اڑا دوں گا۔“ چودھری نے ہوسلر سے ہسپتال نکال لیا۔ ”تمہیں یہ کہنے کی جرات کیسے ہوئی۔ جانتے نہیں میں کون ہوں؟“

”آپ تو مگر یہ کھا گئے چودھری جی۔“ ہیر نے کہا۔ ”میں نے یہ بات کسی بری نیت سے نہیں کہی۔ میں تو صرف اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نہیں مانیں گے تو پھر۔۔۔“

”تو پھر کیا۔۔۔؟“ چودھری فرمایا۔ اس کے آدمیوں نے بھی ہندوقیں تان لی تھیں۔

”ہم اپنی تسلی کے بغیر آپ کو آگے نہیں جانے دیں گے چودھری جی۔“ ہیر نے اس دفعہ اکڑ لیجے میں جواب دیا۔ ”یہ ہمارے گاؤں کی عزت کا سوال ہے۔ ہم تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ یہ لڑکیاں کون ہیں۔“ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ان سب نے رائفلیں تان لیں۔

نایاب نے دیکھا کہ صورتحال بگڑ رہی ہے تو وہ ایک جھنجکے سے سیٹ سے اٹھی اور چھلانگ لگا کر یکے سے نیچے کود گئی۔

”فصحو۔“ وہ چہرے سے چادر ہٹا کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم لوگ کون ہو اور تمہیں کس کی تلاش ہے۔ لیکن تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی سے واپس چلے جاؤ ورنہ کوئی بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔“

”اوہ۔“ ہیر کی آنکھوں میں ہنس سی اٹھ اٹئی۔ ”تو یہ تم ہو۔“ ہیر آباد کے چودھری کی دھکاری ہوئی ہوس۔ فساد کی اصل جڑ تو تم ہی ہو۔ اس بات کی بیٹی کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے لیکن تم ابھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔“

”میں کہتی ہوں تم لوگ شرافت سے واپس چلے جاؤ۔ ورنہ تم میں نے کوئی بھی زندہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔“ نایاب نے کہتے ہوئے چادر اتار کر ایک طرف پھینک دی اور تن کر

اپنے کندھوں سے اتار لی تھیں۔

نایاب نے ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان چاروں کے پاس ہندوقیں تھیں۔ چودھری فرمان کے تین آدمی بھی مسلح تھے۔ چودھری کے پاس بھی ہسپتال تھا۔ لیکن وہ سوچ یہ رہی تھی کہ اگر فائرنگ شروع ہو گئی تو اچھا خاصا خون خرابہ ہوگا۔ گاؤں اس ٹیلے کے دوسری طرف تھا۔ وہاں تک فائرنگ کی آوازیں تو جاسکتی تھیں لیکن جب تک گاؤں والے یہاں پہنچیں گے اس وقت تک بہت کچھ ہو چکا ہوگا۔

نایاب نے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ خوف سے قہر قہر کانپ رہی تھیں۔

”ڈرو مت راہب۔ کچھ نہیں ہوگا۔“ نایاب نے سرگوشی کی۔ ”گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کوئی گزبہ ہوئی تو گاؤں والے فوراً پہنچ جائیں گے اور ویسے بھی تم دیکھ رہی ہو ہمارے ساتھ بھی تین مسلح آدمی موجود ہیں۔“

ان دونوں نے چاروں اس طرح آدھ رکھی تھیں کہ چہرے تو چھپ گئے تھے، صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔ نایاب نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ چاروں یکے کے قریب راستے کے کنارے پر رک گئے تھے۔ ان چاروں نے ہندوقیں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ نایاب نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑوں پر سوار چودھری فرمان کے آدمی بھی ہندوقیں کندھوں سے اتار چکے تھے۔

”نیا بات ہے جوان۔“ چودھری فرمان نے ہیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں آگے تھا۔ ”تم لوگ اس طرح گھات لگائے کیوں بیٹھے ہو اور ہمیں رکنے کا اشارہ کیوں کیا تھا؟“

”معاف کرنا چودھری جی۔“ ہیر نے جواب دیا۔ ”ہمارے پنڈ کی ایک کڑی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ہم اس کی تلاش میں ہیں۔“

”تمہارا خیال ہے میں اس لڑکی کو بھاگ کر لے جا رہا ہوں۔“ چودھری فرمان نے اسے گھورا۔ ”کس پنڈ سے تعلق ہے تمہارا؟“

”ہم محمد پور سے آئے ہیں جی۔“ ہیر نے جواب دیا۔ ”وہ لڑکی گھر سے زہور اور نندی وغیرہ لیکر بھاگی ہے۔ ہم نے اس کی تلاش کے لئے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ آپ کے ساتھ یہ بیٹیاں کون ہیں۔“

کھڑی ہو گئی۔

”تم تو بڑی ہمار ہو۔“ ہر مسکرایا۔ ”لیکن ہمیں بھی چودھری نے یہ اجازت دے رکھ ہے کہ اگر تم ہمارے ہاتھ آجاؤ تو ہم تمہارے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ انہیں کوا اعتراض نہیں ہوگا۔“

نایاب کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس کے کان میں ایک سرگوشی سنائی دی۔

”ڈرو نہیں نایاب۔ میں آ رہا ہوں۔“

نایاب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آتی چاہئے۔“ چودھری فرمان نے ہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر یہ ہے کہ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ میرے یہ آدمی تم لوگوں کو بھونک رہ دیں گے۔“

”مقابلہ برابر کا ہوگا چودھری۔“ ہیر نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ بھی تیرے کوئی ہیں اور تمہارے ساتھ بھی۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے سے الگ رہو۔ ہمیں تلاش تو کسی اور لڑکی کی تھی لیکن اتفاق سے یہ ہمیں مل گئی۔ اسے ہمارے حوالے کرے تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں جیر آباد کے چودھری کی طرح بے حیا اور بے غیرت نہیں ہوں جو اپنی عزت خود اپنے پیروں میں روند رہے ہیں۔ اس لڑکی کو میں نے بیٹی کہا ہے اور اگر تم نے اس کا طرف ہاتھ بڑھایا تو کوئی سے اڑا دوں گا۔“ وہ پھلانگ لگا کر کیے سے اتر آیا۔ اس نے ہیر پھوٹل تان لیا تھا۔

کیے میں بیٹھی ہوئی چودھرائی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولی لیکن سیٹ پر بے چینی سے ہلہو ہلتے ہوئے کبھی چودھری کی طرف دیکھتی اور کبھی ہیر اور اس کے ساتھیوں کی طرف جو رائفیں تانے کھڑے تھے۔ پھر چودھرائی نے مڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ ہوئی رابعہ سے کچھ کہا۔ رابعہ اگلی سیٹ پر آ گئی۔ چودھرائی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ ”دیکھو چودھری۔“ ہیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم ایک عزت دار آدمی ہو ہمارا یا جیر آباد کے چودھریوں کا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر کے چلے جاؤ۔ بات ختم۔“

”موت تمہارے قریب آ رہی ہے۔“ نایاب نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”مجھے موت کے قدموں کے چاپ سنائی دے رہی ہے۔ اگر تم مرنا نہیں چاہتے تو چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ موت تمہاری طرف آ رہی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہیر نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس طرف دیکھا۔ ایک بوڑھا کھیتوں سے نکل کر اسی طرف آ رہا تھا۔ ان کے درمیان فاصلہ بیس یا بیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ بوڑھے کی عمر ستر سے اوپر رہی ہوگی۔ جھروں بھرا چہرہ، بہت میلہ سالیاں، آنکھوں پر ٹوٹے ہوئے فریم والی عینک، ہاتھ میں لٹاخی اور سر پر میلی سی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی ناتواں اور کمزور ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت بھی نہ ہو۔

”ہماری موت۔۔۔ یہ بوڑھا!“ ہیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ تو خود اپنی موت کی تلاش میں پھر رہا ہے۔ اس کی اپنی جان تو ہونٹوں پر اٹکی ہوئی ہے۔ یہ کسی دوسرے کو کیا نقصان پہنچائے گا۔“

چودھری فرمان بھی حیرت سے اس بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بوڑھے کو دیکھ کر تو واقعی یہ کہا جاسکتا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ گڑبڑے گا اور پھر دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا۔ چودھری کو اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ نایاب نے اس کمزور اور ناتواں بوڑھے کو ان لوگوں کی موت کیوں کہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسی خوف سے نایاب کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

وہ بوڑھا قریب آ گیا تھا اور پھر وہ ہیر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ہیر کو بوڑھے کے اس طرح کھڑے ہونے پر حیرت ہوئی تھی۔

”بابا۔۔۔ کیوں میرے ہاتھوں خرچ ہونا چاہتے ہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔“ ہیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزی لہجے میں کہا۔

”میں تمہاری موت ہوں۔“

ہیر کے کانوں میں سرگوشی گونجی۔ وہ ایک دم خوفزدہ سا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بوڑھے کے ہونٹوں کو حرکت نہیں ہوئی تھی لیکن وہ آواز ہیر کی سماعت سے نکلا رہی تھی۔ بوڑھے نے لٹاخی دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ اس طرح آگے بڑھا رہا تھا جیسے ہیر کو گلے سے پکڑنا چاہتا ہو۔ ہیر دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نظریں بوڑھے کے

اسے سر سے اوپر اٹھایا اور ایک طرف پٹخ دیا۔

بہرہمد کی آواز سے زمین پر گرا۔ اس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکلی تھی۔ وہ چند لمحوں کے بعد جس و حرکت اپنی جگہ پر پڑا رہا پھر اٹھ کر ایک طرف بھاگا مگر اس مرتبہ بھی بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ اس مرتبہ بہرہمد کے بل گرا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔ وہ زمین پر بڑی طرح تڑپ رہا تھا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔

بہرہمد کے باقی ساتھی دوڑتے ہوئے کھیتوں میں غائب ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی مڑ کر بہرہمد کا انجام دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بوڑھے نے مڑ کر غائب کی طرف دیکھا۔ اس کے بہنوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے لاشی کو پھر دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور مڑ کر کھیتوں کے درمیان پگھلنے والی بے چلنے لگے۔ اب وہ پہلے جیسا لگ رہا تھا۔ خفیف و نزار بوڑھا جو لاشی کے سارے مشکل سے چل رہا تھا اور پھر تقریباً "پچاس گز دور نکلا کے درخت کے قریب پہنچ کر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔

چودھری فرمان اور اس کے آدمی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت سی تھی۔ چودھری کی حالت تو بہت فیر ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا خوف تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے راجہ کو دو گونے بانوں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔

چودھری فرمان پھونٹے پھونٹے قدم اٹھاتا ہوا بہرہمد کے قریب پہنچ گیا۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ چودھری فرمان نے اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ پھر اس کی نبض اور سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ تو مرچکا ہے۔" چودھری فرمان غائب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جب وہ بہرہمد کے ہاتھوں پر ہاتھ پڑا تو اس کی آواز میں کڑک تھی۔ لیکن اس وقت اس کے لیےج میں بھی کسی قدر تھکاوٹ تھی۔ "اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"اس کا انجام بھی ہوتا تھا۔" غائب نے جواب دیا۔ "مگر یہ آپ کی بات مان لیتا تو

چہرے پر مرکوز تھیں اور پھر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی گئی۔ بوڑھے کے چہرے کے نقوش بگڑنے لگے تھے۔ اس کی صورت بڑی خوفناک ہو گئی تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کی غائب کو قلعہ تھی۔ بہرہمد نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی آٹونیک رائفل کا ٹانگہ دیا۔ فضا فائزنگ کی آواز سے گونجی اٹھی۔ رائفل سے نکلنے والی گولیاں بوڑھے کے جسم میں بیوت ہو گئیں۔

چودھری اور اس کے آدمیوں نے بہرہمد اس کے ساتھیوں پر فائز کھولنے کیلئے اپنی اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں مگر غائب نے چیخ کر انہیں فائزنگ کرنے سے روک دیا۔ "آپ لوگ فائزنگ مت کریں۔" وہ چیخا۔ "یہ بابا ان لوگوں کیلئے کافی ہے۔" سب لوگ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ گولیاں نکلنے کے باوجود بوڑھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بہرہمد کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس جیسے بوڑھے کو موت کے منہ میں پہنچانے کیلئے ایک ہلکا سا دھکا ہی کافی تھا لیکن کئی گولیاں نکلنے کے باوجود اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ بہرہمدی قدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر چیخا۔

"گولی چلاؤ۔ دیکھ کر رہے ہو۔ ختم کرو اس بابے کو۔"

اور پھر ان سب کی رائفلوں کا رخ اسی بوڑھے کی طرف ہو گیا۔ ان چاروں کی رائفلیں گولیاں اگل رہی تھیں اور رائفلوں سے نکلنے والی وہ گولیاں بوڑھے کے جسم سے ٹکرا رہی تھیں لیکن بوڑھے پر ان گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

بہرہمدی رائفل خالی ہو گئی۔ وہ دشت زدہ سی نظروں سے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ خوف و وحشت سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ اس نے خائف رائفل بوڑھے پر کھینچ ماری اور چیخا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے تین آدمی بھی بھاگ رہے تھے۔

بہرہمدی بوڑھے سے تقریباً "میں گز دور چاچکا تھا۔ بوڑھے نے لاشی بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور سیدھا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا پنجہ پھیلا ہوا تھا اور پھر حیرت انگیز طور پر اس بوڑھے کا بازو لمبا ہوتا چلا گیا۔ بہرہمد تقریباً "میں گز دور چاچکا تھا لیکن اسے مزید آگے جانے کا موقع نہیں ملا۔ بوڑھے کے استخوانی پنجے نے اس کی گردن دوچ لٹی۔

بوڑھا اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس کا بازو سینے کے برابر تک کہ وہ ٹارنل پوزیشن میں آیا۔ بہرہمد کی گردن اس کے پنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑی طرح چیخ رہا تھا۔ بوڑھے نے

شاید اس کی جان بچ جاتی۔“

”لیکن۔۔۔ وہ کون تھا۔۔۔ وہ بوڑھا۔“ چودھری فرمان نے کہا۔

”وہ بابا۔“ نایاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُٹھی۔ ”میرا محافظ۔“ اس نے کہا۔
 ”چودھری انگل“ بات دراصل یہ ہے کہ جب انسان کسی سچائی کے لئے لڑ رہا ہو تو اس کے پیسوں دشمن تو ہوتے ہیں لیکن ایک آدھ ایسی قوت بھی ہوتی ہے جو سچائی کی سرپندی کیلئے اس کا ساتھ دیتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ بابا کون ہے۔ اس کی شخصیت پر اسرار ضرور ہے لیکن میں جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہوں، یہ بابا رحمت کا فرش بن کر میری مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ بہرحال آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم بہر کی موت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم میں سے کسی نے تو اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اب چلئے۔ دیر ہو رہی ہے اور چودھری انگل مجھے السوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کو بھی پریشان ہونا پڑا۔“

”نہیں بیٹی۔“ چودھری فرمان نے کہا۔ ”میں پر اسرار بابا تو نہیں لیکن ان لوگوں میں سے ضرور ہوں جو سچائی کا ساتھ دیتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں خوفزدہ نہیں کر سکتی۔“

”وہ میں دیکھ چکی ہوں چودھری انگل۔“ نایاب مسکرائی۔ ”آپ نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے جس طرح بہر اور اس کے آدمیوں کی رانٹوں کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ آپ سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ اب آپ کیسے میں پیٹھیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”لیکن لااش! کیا یہ یہیں پڑی رہے گی؟“ چودھری فرمان نے بہر کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم گاؤں پہنچ کر بتا دیں گے۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی فورپور جا کر تھانے اطلاع دے دے گا۔“ نایاب نے کہا۔

وہ دونوں یکے پر بیٹھ گئے۔ چودھری فرمان نے گھوڑے کی نگام تمام لی۔ رابعہ پھیل سیٹ پر آگئی۔ چودھری فرمان گھوڑے کو ہانکتا ہی تھا تھا کہ سامنے سے چھ سات گھڑسوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

”کچھ اور لوگ آرہے ہیں نایاب بیٹی۔“ چودھری فرمان بولا۔

”ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ نایاب بولی۔ ”یہ ہمارے گاؤں کے آدمی ہیں اور شاید فائرنگ کی آواز سن کر اسی طرف آرہے ہیں۔“
 وہ گھڑسوار جلد ہی ان کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں سب سے آگے والے گھوڑے پر ملک سکندر تھا اور اس کے ساتھ والے گھوڑے پر قیوم۔ اس کے سر پر پٹا بندھی ہوئی تھی۔ نایاب انہیں دیکھ کر بچنے اتر آئی۔

”نایاب! تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ تمہیں ڈھونڈنے کیلئے تو آدمی چاروں طرف گئے ہوئے ہیں۔“ سکندر نے نایاب کو دیکھ کر کہا۔

”میں بھی کسی کو ڈھونڈنے نکلی تھی۔“ نایاب نے کہنے ہوئے یکے پر بیٹھی ہوئی رابعہ کی طرف دیکھا جو چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا رخ پھیل طرف تھا اس لئے وہ سکندر یا قیوم کو نہیں دیکھ سکی تھی لیکن ملک سکندر کی آواز پہچان کر اس نے چادر اتار دی اور یکے سے بچنے اتر آئی۔ سکندر کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر قیوم بیٹھا تھا۔ ابھر کو دیکھ کر وہ پھاٹک لگا کر گھوڑے سے اتر آیا رابعہ نے قیوم کو دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف اڑے۔

اور پھر وہ منظر بہت ہی رقت آمیز تھا۔ رابعہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اب تک اس نے بہت ضبط سے کام لیا تھا لیکن ماں جانے کو دیکھ کر ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ نایاب نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا ہے دل کا غبار نکل جائے دیا جائے۔ چودھری فرمان اور چودھرائی بھی اس منظر کو دیکھ کر افرارہ ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ملک سکندر اور چودھری فرمان کسی حد تک ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ دونوں بڑی دلجوئی سے ملے۔

”چودھری صاحب۔“ ملک سکندر بولا۔ ”یہ آپ کے ساتھ کیسے۔۔۔؟“

”بس اسے اتفاق سمجھ لو۔“ چودھری فرمان نے کہا۔ ”یہ لڑکیاں رات کو ان ڈاکوؤں نے پانچل سے بھاگی تھیں اور کیتھن میں چھپ گئی تھیں۔ صبح سویرے میرے ایک کارندے نے انہیں دیکھ لیا اور مجھے اطلاع دی۔ میں انہیں اپنے گھر لے آیا۔ انہیں تسلی دی۔ ہم ان میاں بیوی فورپور جانے والے تھے۔ انہیں بھی ساتھ لے لیا کہ راستے میں انہیں

ڈاکو ہی تھے لیکن یہ سب کچھ چودھری سعادت اور ملنگی کا کیا دھرا تھا۔ چودھری سعادت اگرچہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن وہاں ملنگی کی سوچو گی نے سب کچھ ثابت کر دیا تھا۔ ملنگی ہی نے گاؤں کے راستوں کی ناکہ بندی کروا رکھی تھی۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ رست باؤس سے فرار ہونے کے بعد راجہ گاؤں کی طرف ہی آئے گی اس لئے اس نے گاؤں کے راستوں کی گمرانی شروع کر دی تھی۔ ہرادر اس کے راستوں نے انہیں روکا تھا لیکن اس پر اسرار بوڑھے کی وجہ سے ملنگی کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا تھا۔ ہر اپنے انعام کو چھین گیا تھا اور اس کے دوسرے ساتھی خوفزدہ ہو کر ہماگ نکلے تھے اور شاید اب تک ملنگی کو صورت حال کا پتہ چل گیا ہوگا۔

ملک سکندر نے ایک آدمی کو فوراً ہی نور پور تھانے بھیج دیا تھا۔ چودھری فران اور اس کی بیوی بھی اسی وقت جانا چاہتے تھے مگر سکندر اور یکینہ نے انہیں دھمکے کھانے پر روک لیا تھا۔

”چودھری صاحب!“ ملک سکندر نے چودھری فران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت ملک صاحب کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ”نور پور میں کہاں رشتہ ہوا ہے آپ کی بیٹی کا؟“

”ابھی تو بات کچھ بیچ میں ہی ہے۔“ چودھری فران نے کہا۔ ”وہ لوگ چند روز پہلے آئے تھے۔ لڑکی کو دیکھ گئے ہیں۔ ان کی طرف سے تو ہاں ہو گئی ہے۔ اب ہم ذرا لڑکے کو دیکھ لیں تو بات کچھ آگے بڑھے۔ سنا ہے لاکھا شریں انجیر ہے اور آج کل آیا ہوا ہے۔“

”کیون ہیں وہ لوگ؟“ سکندر نے پوچھا۔ ”لڑکے کے باپ کا کیا نام ہے۔ کیا کرتا ہے وہ؟“

”فضل دین نام ہے اس کا۔ آؤ مت کی دکان ہے۔ کبھی کبھی وہ ہم سے بھی اناج کا سودا کر لیتا ہے۔“ چودھری نے جواب دیا۔

”تو پھر یہ رشتہ کیا سمجھیں چودھری جی۔“ سکندر بولا۔

”میں سمجھا نہیں چڑ۔“ چودھری نے انجی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کمال کی بات کر رہے ہیں؟“ سکندر نے پوچھا۔

”ہاں چڑ۔ یہی نام ہے اس لڑکے کا۔ تم جانتے ہو اسے؟“ چودھری بولا۔

گاؤں چھوڑتے جائیں گے لیکن یہاں پہنچ کر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ”وہ خاموش ہو کر، کی لاش کی طرف دیکھنے لگا تب تین چار آدمیوں نے گھیر رکھا تھا۔“ کچھ آدمیوں نے ہمیں یہاں روکا تھا اور یہ شخص۔“ چودھری فران نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے بتایا کہ وہ ایک مفروز لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کے چہرے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اپنی تسلی کر لے۔ لیکن میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اسی دوران ٹایپ کیے سے:“

آئی۔ اس شخص نے ٹایپ کو پہچان لیا اور پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک بت بوڑھا با کس سے نمودار ہوا۔ ان لوگوں نے اس پر گولیوں کی بارش کر دی لیکن بابا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سب بجٹ کھڑے ہوئے لیکن یہ بندہ اس بابا کے قابو آگیا۔ بابا نے اسے اٹھا پھینک دیا۔ اس کی حرکت کی بڑی ٹوٹ گئی۔ یہ مرچکا ہے۔“

”اس کی لاش بیس پڑی رہے گی۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ہم تھانے اطلاع سمجھا دو ہیں۔ پولیس آکر اٹھا لے گی اس لاش کو۔ آپ ہمارے ساتھ پنڈ چلیں۔ بڑی زحمت ہو آپ لوگوں کو۔“

”نہیں بیٹا زحمت کسی۔“ اس مرتبہ چودھری بولی۔ ”اپنی ہی تو بیٹیاں ہیں۔ اللہ انہیں محفوظ رکھا۔ عزت رہ گئی۔ اللہ سب کی شرماں رکھے۔“

”آپ کیے پر بیٹھیں جی۔“ ملک سکندر نے کہا اور اپنے ایک آدمی کو ہیر کی لاش پاس رکھنے کا اشارہ کر کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

ٹایپ نے راجہ کو سارا دے رکھا تھا۔ راجہ کے دل کا غبار نکل گیا تھا اور اس بڑی حد تک اپنے آپ کو مستحصال لیا تھا۔ وہ اسے لے کر یکے پر بیٹھ گئی اور پھر وہ ا گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان کے گاؤں پہنچتے ہی یہ خبر بھی پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ راجہ آگئی ہے۔ کی ساری عورتیں ملک صاحب کی حویلی میں جمع ہونے لگیں اور پھر گاؤں والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ راجہ کو ٹایپ چھڑا کر لائی تھی۔

لوگ ٹایپ کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس نے گاؤں کی عزت بچائی تھی اور یہ پہلی ایسا ہوا تھا کہ کسی لڑکی کو اٹھا لے جانے کے بعد وہ صحیح سلامت واپس آگئی تھی۔ والوں کو ٹایپ اور راجہ سے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ راجہ کو اٹھا لے جانے والے

نورپور کیلئے روانہ ہو گئے۔

گاؤں کی عورتوں کی آمدورفت اب بھی جاری تھی۔ رابعہ کا کوئی گھر نہیں رہا تھا۔ ملک سکندر نے اسے اپنی حویلی ہی میں روک لیا تھا۔ جبکہ قیوم، باشر علی محمد کے گھر میں رہ رہا تھا۔

اس رات کھانے کے بعد رابعہ انہیں بتا رہی تھی کہ کس طرح ڈاکو اسے اغوا کر کے گھوڑے پر لا کر لے گئے تھے۔ وہ پہلے نیلے والے کھنڈروں میں تھوڑی دیر کو رکے تھے پھر آگے روانہ ہو گئے اور تقریباً دو گھنٹے بعد دیر والے سرکاری اور دیران ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔

”رست ہاؤس پہنچ کر انہوں نے میرے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیا۔“ رابعہ بتا رہی تھی۔ ”صبح نو بجے کے قریب ملنگی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے آکر ان ڈاکوؤں کو بتایا تھا کہ ہمارا مکان چل کر راکھ ہو گیا ہے۔“

”ملنگی نے میرے ہاتھ پیر کھول دیئے تھے۔ اس کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ چودھری سعادت بھی وہاں آنے والا ہے اور میرے بارے میں فیصلہ وہی کرے گا۔ دہرے کے قریب وہ سب لوگ رست ہاؤس کے باہر درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ امین ناٹی ایک آدمی میری گھرانی کیلئے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے موقع پا کر مجھ پر دست درازی کی کوشش کی تو میں نے اس کے بازو پر کٹ لیا۔ اس کے بازو سے خون بہنے لگا۔ اس نے فحش میں آکر میری پٹائی شروع کر دی۔ ملنگی وغیرہ بھی اندر آ گئے۔ امین نے ان سے جموت بولا کہ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ملنگی اور حاکم علی بھی مجھے پینے لگے اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔“

میں شام کے قریب ہوش میں آئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد میں نے واقعی بھاگنے کی کوشش کی۔ میں کھڑی سے کود کر باہر آ گئی تھی لیکن انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور میری دھناتی شروع کر دی۔ میں پھر بے ہوش ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو آدھی رات بیت چکی تھی۔ ملنگی میرے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پانی ساغی شاید دوسرے کمرے میں تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی اس کمرے میں آیا اور اس نے ملنگی کو بتایا کہ ان کا ایک ساتھی فتح

”ایسا دیا۔“ سکندر مسکرایا۔ ”کمال تو کالج تک میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ فرق صرف شے کا تھا۔ وہ پری انجینئرنگ میں تھا اور میں آئرس میں۔ پھر وہ انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے شہر چلا گیا اور میں نے گاؤں میں آکر کیتی ہاؤس سنہال لی اور آپ کو جان کر حیرت ہوئی کہ ابائی اور چاچا فضل بھی کلاس فیلو رہے ہیں۔“

”ہاں بھائی صاحب!“ ملک صلاح الدین نے کہا۔ ”میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہت شریف اور خاندانی لوگ ہیں۔ کمال کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں پلا ہوا ہے۔ بہت شریف لڑکا ہے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اللہ کا نام لیکر ہاں کر دیں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ کی ابن سے واقفیت نکل آئی اور ہماری آپ سے ملاقات ہو گئی۔“ چودھری فرمان بولا۔

”بھائی صاحب! اگر آپ کہیں تو میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔“ ملک صاحب بولے۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ چودھری فرمان نے کہا۔

”بہت آرام کر لیا ہے میں نے۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”بٹی کے رشتے کیلئے جانا ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سکندر بیٹے! سکندر سے کو میرے پکڑے نکال دے۔ بھائی صاحب!“ وہ پھر چودھری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”میں تو ان لڑکیوں کو بھی ساتھ لے جاتا مگر یہاں کے حالات آپ جان چکے ہیں۔ رابعہ بیٹی کو دیکھ کر تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔“

”رب کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں ملے گی۔“ چودھری فرمان نے کہا۔ ”خدا ان بچوں کو صبر دے اور جیاتی دے۔“

”اوئے سکندر۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”کسی بندے کو کو ملک صاحب کا یکہ کھول دے اور گھوڑے کو دانے پانی ڈالے اور رسول بخش سے کو گاڑی نکالے۔ وہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ ڈرائیونگ وہی کرے گا۔“

”چھا ابائی۔“ ملک سکندر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تقریباً“ آگے گھٹنے بعد چودھری فرمان اس کی پیروی اور ملک صلاح الدین گاڑی پر

لوگوں سے ہمدردی کی جس کی وجہ سے چودھری تمسارا دشمن ہو گیا۔ گاؤں والے جنہیں اکیلا تو نہیں چھوڑیں گے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

”اس سے میرا حوصلہ بھی بڑھا ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب چودھری یا اس کا کوئی آدمی گاؤں کی کسی عورت کی طرف آگے اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اب انہیں کسی پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”ایک بات تو بتاؤ ٹایاب۔“ سیکند نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جنہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ راجہ کہاں ہے اور پھر کل رات جب تم یہاں سے نکل رہی تھیں تو تمہارے بھائی نے جنہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ میں خود جنہیں دیکھ رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے تم نیند میں ہو۔“

”مجھے خود کچھ معلوم نہیں بھائی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں باہر برآمدے میں آکر بیٹھ گئی اور راجہ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ان دیکھی ہستی میرے اندر حلول کر رہی ہو۔“ ٹایاب چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور پھر انہیں اپنی اس کیفیت کے بارے میں بتانے لگی جس سے وہ کزشتہ رات دوچار ہوئی تھی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے ہوش تو اس وقت آیا تھا جب میں گھوڑی کو ایک درخت سے بانہہ کر اس دیران عمارت کی طرف جاری تھی اور پھر مجھے خود بھی حیرت ہے کہ میں نے راجہ کو وہاں سے کیسے نکالا تھا۔“

وہ لوگ دیر تک باہیں کھڑے رہے اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ٹایاب کو اس رات بھی نیند نہیں آئی۔ وہ رات کا آخری پر تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آکر بیٹھ گئی اور پھر اچانک ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر حویلی سے باہر آگئی۔ گلی میں بوڑھے چوکیدار کے قریب سے وہ اس طرح گزر گئی جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ چوکیدار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے ملک صاحب کی حویلی کی طرف چلے لگا۔

ٹایاب کیمپوں میں پہنچ گئی۔ وہ غالباً اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے کشاں کشاں لئے جا رہی ہو۔ اس کا رخ پرانی حویلی کی طرف تھا۔



گڑھ چلا گیا ہے تاکہ چودھری سعادت کے بارے میں معلوم کر سکے کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

نذر نای آدمی لپٹائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ملنگی سے کوئی سرگوشی کی اور پھر میرے قریب آگیا۔ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کے منہ پر زور سے لات مار دی اور اٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر ملنگی نے مجھے دروازے میں پکڑ لیا۔ ان دونوں نے ایک بار پھر میری پٹائی خرد کر دی اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔

آخری مرتبہ جب مجھے ہوش آیا تو میں کھیت میں پڑی تھی اور ٹایاب میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ وہاں کس طرح پہنچی تھی اور مجھے کس طرح وہاں سے نکال کر لائی تھی۔ وہ رات کا پچھلا پھر تھا اور ملنگی اور اس کے ساتھی مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ بار بار فانگ بھی کر رہے تھے۔ ہم کیمپوں میں پیچھے ہوئے وہاں سے دور نکل گئے اور پھر ایک خالی جھونپڑی میں چھپ گئے۔ دن چڑھے ہمیں ایک آدمی جھونپڑی سے نکال کر چودھری فرمان کے پاس لے آیا۔ وہ آدمی ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

”اس دنیا میں خدا کے ٹیک بندوں کی بھی کمی نہیں ہے۔“ اس کے خاموش ہونے پر سیکند نے کہا۔ ”رہب کا شکر ادا کرو راجہ۔ جنہاں تمہاری عزت بچ گئی۔ یہ لوگ تو واقعی دوندے ہیں۔ اگر ٹایاب وہاں نہ پہنچتے تو یہ نہیں وہ تمہارا کیا شکر کرتے۔“

”میں ٹایاب بہن کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔“ راجہ نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ وہاں نہ پہنچتے تو میں واقعی رہا ہوا جاتی۔“

”تم لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ میری ہی وجہ سے ٹوٹے ہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”نہ تم لوگ میرا ساتھ دیتے اور نہ یہ مصیبت آئی۔ تمہارا مکان جل گیا۔ پھر بہن جانے لگا۔ لیکن مجھے چاہا تو اب دین کی موت کا افسوس رہے گا۔ میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتی۔“

”مقدور کا لکھا تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے ٹایاب بہن!“ راجہ نے کہا۔ ”اور تم یہ مت سمجھنا کہ اس کے بعد ہم تم سے دور ہٹ جائیں گے۔ ہم اب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ چودھریوں سے تمہارا جائیداد کا جھگڑا تھا۔ وہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا لیکن دشمنی میں یہ شدت ہم گاؤں والوں کی وجہ سے آئی ہے۔ تم نے گاؤں کے مظلوم

”نہیں ملک جی۔“ چوکیدار بولا۔ ”میں نے خود اسے گلی میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے تو اسے سلام بھی کیا تھا اور پوچھا بھی تھا کہ اس وقت اکیلی کہاں جا رہی ہے مگر نہ تو اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور نہ ہی میری طرف دیکھا۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ بس میرے قریب سے گزر گئی۔“

”کس طرف گئی ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”اس طرف کوئی۔“ چوکیدار نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا۔ میں دیکھتا ہوں۔“

سکندر واپس آگیا۔ سیکندر آدھے میں کھڑی تھی۔ سکندر اس کی طرف توجہ دیے بغیر نرمس والے کمرے کی طرف آگیا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ سکندر نے اندر جھانک کر دیکھا، مسمری پر نرمس اور عذرا سو رہی تھیں۔ ٹایپ نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا۔

”کیا ہوا جی۔ کیا بات ہے؟“ سیکندر نے پوچھا۔

”ٹایپ کہیں چلی گئی ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”مجھ سے بتائے آیا تھا۔ وہ کہتا ہے ٹایپ

اس کے قریب سے گزر گئی۔ نہ تو اس کی بات کا جواب دیا اور نہ اس کی طرف دیکھا۔“

”رب خیر کرے۔“ سیکندر بولی۔ ”یہ لڑکی اپنے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ اس

طرح آدمی رات کو اکیس گھر سے نکل جاتا۔“

”وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔“ سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیا تو اسے واقعی

نیزم میں چلنے کی عادت ہے اور یا پھر۔۔۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔ تم باہر والا چھانک اندر سے بند

کرو۔“

سکندر نے بندوں کندھے پر ٹھکانی اور شیڈ میں بندھا ہوا ملک صاحب والا گھوڑا کھول

کر باہر آگیا۔ اس کی اپنی گھوڑی گزشتہ رات ٹایپ نے گئی تھی جو بعد میں شاید ملنگی

ونیرہ کے ہاتھ لگ گئی تھی۔

”کس طرف گئی تھی چھوٹی بی بی۔ آؤ ذرا بتاؤ مجھے۔“ سکندر نے چوکیدار گارے کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گھوڑے کی نگاہ پکڑ کر پیڈل اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چوکیدار

اس کے ساتھ ساتھ چلا رہا۔ وہ زمین گلیوں سے گزر کر آخری گلی کے موڑ پر چوکیدار رک

چھانک دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سن کر سکندر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر سامنے والی دیوار پر لگے ہوئے کھاک کی طرف دیکھا تین بجر پتلیں منٹ ہوئے تھے۔ اسی دوران چھانک پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ سیکندر بھی جاگ گئی۔

”کون ہے۔ دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟“ وہ بولی۔ اس کی آواز میں خیر کا غماز تھا۔

”پتہ نہیں کون ہے۔ دیکھتا ہوں۔ ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ اس وقت کون ہو سکتا

ہے۔“ سکندر بیڑا تے ہوئے مسمری سے اتر آیا۔

”ذرا پوچھ کر دروازہ کھولنا۔ پتہ نہیں کون ہو۔“ سیکندر بولی۔

”دیکھ لیتا ہوں کون ہے۔“ سکندر نے مسمری کے قریب ہی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی

ڈٹل ہیل بندوق اٹھالی اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آگیا۔

سیکندر بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے آئی تھی مگر وہ برآمدے ہی میں رک گئی۔ اس دوران

چھانک ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز بھی سنائی دی تھی۔

”ملک جی۔ دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔ پنڈ کا چوکیدار غلام محمد۔“

”کھول رہا ہوں دروازہ۔“ سکندر کہتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔

وہ چھانک کے قریب پہنچا تو چنگے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ چھانک کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا

تھا۔ وہ باہر آگیا۔

”کیا بات ہے گارے۔ کیا ہو گیا ہے۔ دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟“ وہ بولنے لگا۔

کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین لے کھڑا تھا۔

”ملک جی۔ وہ چھوٹی بی بی کیس چلی گئی ہے۔“ چوکیدار نے کہا۔

”چھوٹی بی بی۔“ سکندر چوکیدار گیا۔ ”وہ کہاں چلی گئی ہے۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں

ہو گیا۔ وہ تو سو رہی ہے۔“

ٹایاب آدمی رات کے بعد حویلی سے نکلی اور گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھی وہاں پہنچ گئی جہاں ڈاکو، راجہ کو لئے چپے ہوئے تھے اور ٹایاب، راجہ کو ان کے کھینچے سے نکال لائی تھی۔ واپسی پر ہرادر اس کے ساتھیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر پھر وہی پر اسرار بوڑھا سامنے آگیا تھا اور ہیراپی جانا سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

چودھری فرخان بہت نیک اور شریف آدمی ثابت ہوا تھا۔ فضل دین کے بیٹے کے رشتے کے پھر میں ان سے کچھ اور بھی تعلق ہو گیا تھا۔ ملک صاحب خود ان کے ساتھ فضل دین کے گھر گئے تھے اور رشتہ طے کر کے آئے تھے۔ واپسی پر چونکہ شام ہو چکی تھی اس لئے ملک صاحب نے چودھری فرخان اور ان کی بیوی کو روک لیا تھا اور اپنے ایک آدمی کے ہاتھ ان کے گاؤں اطلاع بجھوا دی تھی کہ وہ لوگ اب صبح واپس آئیں گے۔

سکندر یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر گھوڑے کو کھیتوں کے درمیان گڈنڈی پر بانگ دیا۔

وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد حویلی والے ٹپے کے سامنے پہنچ گیا۔ تاریکی اور گہرے سانے نے ماحول کو خاصا پر اسرار بنا دیا تھا۔ وہ تاریکی میں ادھر ادھر گھورتا رہا پھر گھوڑے کو آگے بڑھاتا ہوا حویلی کے پھاٹک کے سامنے لے آیا۔ وہ گھوڑے کو پھاٹک کے اندر لے جانا چاہتا تھا لیکن گھوڑا ایک دم رک گیا اور ہنساتا ہوئے پھلنے لگا۔

سکندر گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن گھوڑا بری طرح چھٹتا رہا۔ وہ ہنساتا ہوا پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ سکندر گھوڑے سے اتر گیا اور لگام سے پکڑ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس مرتبہ بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ گھوڑا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ سکندر گھوڑے کو پیچھے لے آیا۔ تقریباً چھپاس گز پیچھے آکر گھوڑا ایک دم پرسکون ہو گیا۔ سکندر نے لگام درخت کی ایک شاخ سے باندھ دی اور کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق اتار کر حویلی کے پھاٹک کی طرف پھلنے لگا۔

پھاٹک کے سامنے وہ ایک لمحہ کو خشکا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کوئی اس کے راستے میں آگیا ہو۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کوئی نہیں تھا اور پھر پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے بھی اسے کہڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے ایک بار ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اسے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے اس کے آس پاس کوئی

گیا۔

”ادھر کوئی۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”بھولتی بی بی اس طرف گئی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ سکندر کہتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

گاؤں سے نکل کر وہ کھیتوں کے قریب پہنچ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹایاب کہاں ہو گئی۔ دفعتاً اس کے دماغ میں جھمکا سا ہوا۔ پرانی حویلی کا راستہ اس طرف سے قریب تھا۔ وہ یقیناً پرانی حویلی کی طرف گئی ہوگی۔ لیکن اس وقت اکیلے حویلی کی طرف جانا اس کیلئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ سکندر نے خطرے والا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ ٹایاب آج کل پر اسرار قسم کے حالات سے دوچار تھی۔ بعض ہوائی چیزیں بھی اسے حصار میں لے ہوئے تھیں۔ اس کے خیال میں ہوائی چیزیں اگرچہ خطرناک ہی ہوتی ہیں لیکن ٹایاب کو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دوسروں کے لئے خطرناک ثابت ہونے والی یہ ہوائی چیزیں ٹایاب کی محافظ بن گئی تھیں۔

سکندر گزرے ہوئے ان پر اسرار واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کی وہ خود کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصہ کے دوران حویلی میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب کیلئے حیران کن تھا۔ ٹایاب حویلی میں آزادی سے گھومتی پھرتی تھی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ حویلی میں جا چکا تھا مگر کچھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن بگا اور کرامت حویلی میں داخل ہونے تو دوسرے روز ان کی لاشیں ملیں۔ چودھری سعادت نے ٹایاب پر ان کے قتل کا الزام لگایا تھا لیکن بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ انکشاف ہوا تھا کہ ان دونوں کی موت شاید خوف کی وجہ سے حرکت قلب بند ہوجانے سے واقع ہوئی تھی۔

ٹایاب کا ہمدرد وہ پر اسرار بوڑھا بھی سب کے لئے حیرت کا باعث بنا ہوا تھا۔ ٹایاب جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی وہ بوڑھا حیرت انگیز طور پر نمودار ہوتا اور اپنا کام دکھا کر غائب ہوجاتا۔

گزشتہ رات کا واقعہ بھی سکندر کے لئے کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ ڈاکوؤں اور راجہ کی تلاش میں گاؤں کے دیہیوں لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دور و قریب کی بستیوں سے بھی ان کے بارے میں پوچھ سمجھ کی گئی تھی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور

موجود ہے۔

”ٹایاب!“ اس نے ایک بار پھر پکارا۔ اس مرتبہ اندر سے ایک نسوانی قہقہے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ سکندر چڑک گیا۔ وہ ٹایاب کی ہنسی کی یہ آواز کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ اس وقت اسے یہ آواز پچانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹایاب حویلی کے اندر موجود تھی۔ لیکن اس نے شاید سکندر کی آواز نہیں سنی تھی۔ سکندر نے ایک بار پھر ٹایاب کا نام لیکر پکارا اور ساتھ ہی دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نہ تو پکار کا جواب ملا اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ البتہ وقفے وقفے سے نسوانی قہقہوں کی مدہم سی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

سکندر پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ برآمدے کی طرف اس دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھیں۔ وہ برآمدے سے نکل کر دائیں طرف آگیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ دائیں طرف حویلی کی اوپر کی منزل پر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں والی اس ڈیوڑھی میں ایک دروازہ حویلی کے نیچے حصہ میں جانے کے لئے بھی تھا۔

وہ برآمدے سے نکل کر دائیں طرف چلے گیا۔ زمین پر پڑے ہوئے ٹشک پہ اس کے پیرو کے نیچے آکر چر مار رہے تھے اور پتوں کی چرماہٹ کی یہ آواز بھی خاموش فضا میں بڑا پر اسرار تاثر پیدا کر رہی تھی۔

وہ ڈیوڑھی والے دروازے کے سامنے آکر رک گیا۔ پہلے تاراج کی روشنی میں دروازے کا جائزہ لیا پھر ہاتھ سے دباؤ ڈالا۔ دروازہ چرماہٹ کی خوفناک آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا۔ سکندر دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تاراج تھی اور دوسرے ہاتھ میں بندوق۔ چند سیکنڈ کچھ سوچنے کے بعد اس نے بندوق کندھے پر لٹکال۔ حویلی کے اندر اسے بندوق کی ضرورت پیش نہیں آسکتی تھی۔ ویسے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بندوق استعمال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

وہ تاراج کی روشنی میں دروازے کے اندر دیکھنے لگا۔ یہ ڈیوڑھی پانچ فٹ چوڑی اور دس فٹ لمبی تھی۔ سامنے اوپر جانے کیلئے سیڑھیاں تھیں اور بائیں طرف وہ دروازہ تاجس سے حویلی میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔

وہ چند لمبے لمبے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا اور دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے یابوسی نہیں ہوئی۔ دروازہ آہستگی سے کھل

سکندر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک انہماک سا خوف اسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ خوف کس بات کا۔ وہ کسی بری نیت سے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ وہ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ٹایاب کے ساتھ پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔

”ٹایاب!“ اس نے اندر کی طرف دیکھتے ہوئے پکارا۔ ”ٹایاب کہاں ہو تم۔ میں ہوں سکندر۔۔۔ ٹایاب۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔؟“

حویلی کی چار دیواری کے اندر سنانے میں اس کی آواز گونجتی چلی گئی۔ وہ بار بار آوازیں دیتا رہا لیکن کوئی جواب نہیں ملا اور پھر وہ پھانک کے اندر داخل ہو گیا۔ اس روز صبح کے کچھ حصہ کی جھاڑیاں صاف کی جا چکی تھیں لیکن کئی ہوئی جھاڑیاں وہیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں میں چلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ سنانے میں پتا چلے کہ آواز بھی دل میں ایک عجیب سا خوف پیدا کر رہی۔

ملک سکندر بچے سے تلتے قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔

”ٹایاب!“

اس نے اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دو تین آوازیں اور دس گھر ہر مرتبہ جواب میں خاموشی ہی رہی۔ سکندر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے قریب آگیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے ہاتھ آگے پھسایا ہی تھا کہ اندر چرماہٹ کی آواز سنائی دی۔ سنانے میں اس ہلکی سی آواز نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسی لمحہ دھڑکی آواز سنائی دی۔ جیسے دروازہ کھلنے کے بعد بند ہو گیا ہو۔

”ٹایاب۔“ سکندر نے پھر پکارا۔ ”کہاں ہو تم ٹایاب۔“

مگر اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ سکندر پھر دروازے کے قریب آگیا اور دروازہ کھولنے کے لئے اس کے پٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے تاراج نکال لی اور اس کی روشنی میں دروازے کا جائزہ لینے لگا۔ اوپر والے کٹڑے کی ذخیرہ لگی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کو ایک بار پھر دھکیلا مگر دروازہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما رہا۔

بڑھنے سے روک لیا ہو۔ اسے اپنے سینے پر کسی ہاتھ کا دباؤ بھی محسوس ہوا تھا۔ سکندر نے اسے اپنا راجہ سمجھا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ ہاتھ کے دباؤ سے اسے پیچھے دھکیل کر دروازے سے باہر نکال دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔

سکندر کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ یہ اس کا راجہ نہیں تھا۔ اسے کسی نابیدہ ہستی نے آہستہ سے پیچھے دھکیل دیا تھا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ ایک بات سکندر کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ نابیدہ ہستی جو کوئی بھی تھی، اس کی دشمنی نہیں تھی۔ اسے پیچھے دھکیلنے کا انداز دوستانہ تھا۔ اگر ناراضگی کا اظہار مقصود ہوتا تو اسے آہستگی سے پیچھے دھکیلنے کے بجائے اٹھا کر رخ دیا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نابیدہ ہستی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہو۔

”نایاب—— نایاب دروازہ کھولو۔ مجھے معلوم ہے تم کمرے کے اندر موجود ہو۔ دروازہ کھولو نایاب۔“ وہ نایاب کو پکارتے ہوئے زور زور سے دروازہ دھڑھڑانے لگا۔ مگر نہ تو دروازہ کھلا اور نہ ہی نایاب کی طرف سے کوئی جواب ملا۔ سکندر تاراج کی روشنی میں راہداری میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس حویلی میں بیٹھ کر ایسے تھے جنہیں ایک دوسرے سے ملانے کیلئے اندر بھی دروازے تھے۔ وہ یہی سوچ کر اس کمرے میں داخل ہوا تھا کہ شاید اس کمرے کے اندر بھی کوئی دروازہ ہو۔

اس کا خیال درست نکلا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ موجود تھا اور یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سکندر دروازے کے قریب ایک لمبے کو رکاب پھر اس نے سمجھتے ہوئے ایک پیر دلہیز کی طرف بڑھا دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی نابیدہ قوت اسے یہاں بھی اندر داخل ہونے سے نہ روک دے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے دوسرا پیر بھی آگے بڑھا دیا۔ اسے نہیں روکا گیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ گیا اور پھر درک تاراج کی روشنی میں کمرے کا چارہ لینے لگا۔

کمرہ خالی تھا۔ تاراج کی روشنی فرش پر ریختی ہوئی کمرے کے اس کونے کی طرف بڑھ رہی تھی جس طرف اس کے خیال میں اس نے نایاب کو جاہتے ہوئے دیکھا تھا۔ روشنی گرد

گیا۔

”نایاب!“ اس نے اندر کی طرف رخ کر کے پکارا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ دروازے میں داخل ہو گیا اور تاراج کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر ایک راہداری میں چلنے لگا۔

آگے جا کر راہداری دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہ اس جگہ رک گیا۔ چند لمبے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اونچی آواز میں بولا۔

”نایاب! مجھے معلوم ہے تم حویلی کے اندر موجود ہو۔ آواز دو۔ کہاں ہو تم۔؟“

نایاب۔۔۔

جواب میں اس مرتبہ بھی نسواری قہقہے کی مدد سے سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ وہ اس طرف کی راہداری میں مڑ گیا۔ تقریباً دس گز آگے جا کر وہ راہداریوں کے ایک اور چوراہے پر پہنچ گیا۔ ہنسی کی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز بائیں طرف سے آئی تھی۔ سکندر اس طرف مڑ گیا۔

سکندر پوری حویلی میں گھومتا رہا۔ ہنسی کی آواز کبھی ایک طرف سے آتی اور کبھی دوسری طرف سے۔ وہ آواز دیتا حویلی میں پکراتا رہا۔ مگر نایاب اسے کہیں نہیں ملی۔

”نایاب! کہاں ہو تم۔؟“ سکندر چچکا۔ اس کی آواز سنسن حویلی میں گونجنی رہی۔

جواب میں اس مرتبہ بھی نسواری قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔

اس مرتبہ سکندر کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھا۔ وہ کھلے ہوئے ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ ہنسی کی وہ آواز اسی کمرے سے آئی تھی۔

اس نے تاراج کی روشنی کمرے میں ڈالی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کوئی کمرے میں دائیں سے بائیں طرف گیا ہو۔ اس نے کسی عورت کے کپڑوں کی جھلک صاف طور پر دیکھی تھی۔

”نایاب۔۔۔ کیا تم اس کمرے میں ہو؟“ سکندر نے اونچی آواز میں کہا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ سکندر نے قدم آگے بڑھا دیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ نایاب اسی کمرے میں ہے لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ شاید جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہی تھی۔

سکندر نے دلہیز کے اندر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے آگے

سکندر کے دماغ میں چبھنیاں سی ریگینے لگیں۔ اس کا یہ خیال درست نکلا تھا کہ اس کمرے میں ٹایپ ہی تھی اور اندھیرے میں وہی اسے دکھا دے کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور حویلی میں کسی اور جگہ غائب ہو گئی تھی۔ لیکن یہاں اس کے کپڑے۔۔۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا ٹایپ؟ نہیں نہیں۔۔۔ ٹایپ ایسی نہیں ہو سکتی۔۔۔ وہ اس کی شرافت کی قسم کھا سکتا تھا۔ لیکن اس کمرے کے گرد آلود فرش پر ٹایپ کے کپڑوں کی موجودگی نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا۔

وہ جبکہ کر فرش پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھاتا چاہتا تھا کہ قہقروں کی آواز سن کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ آواز بلاشبہ ٹایپ کی تھی اور کمرے کے باہر راہداری سے سنائی دی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

راہداری سنسان تھی۔ اب دہم قہقروں کی وہ آواز راہداری کے آخری سرے سے سنائی دے رہی تھی۔ سکندر اس طرف دوڑا۔ لگتا تھا جیسے ٹایپ بالی آواز میں قہقہے لگاتی ہوئی راہداری میں دوسری طرف مڑ گئی ہو۔ سکندر بھی اس طرف مڑ گیا۔ یہ راہداری بھی سنسان پڑی تھی۔

اس نے واپس مڑنا چاہا مگر کوئی ناپیدہ قوت اسے پیرونی دروازے کی طرف دھکیلتی چلی گئی۔ وہ برآمدے والے دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ غیر ارادی طور پر اس دروازے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔

وہ برآمدے میں کھڑا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رات کی تاریکی رخصت ہو چکی تھی اور دن کا اجالا طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور برآمدے سے نکل کر جھاڑیوں میں چلتا ہو حویلی کے چھانک کی طرف بڑھنے لگا۔

چھانک سے باہر نکل کر وہ ایک بار پھر رک گیا۔ ٹھوڑے کے پھٹنے کی آواز سن کر اس نے اس طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ بھکے سے اڑ گیا۔

ٹایپ ٹھوڑے کے قریب کھڑی اس کی گردن پر ہولے ہولے تھمپیاں دے رہی تھی۔ سکندر اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا لگیں جھبک رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ابھی ایک منٹ پہلے وہ حویلی کے اندر تھا جہاں ایک کمرے میں اس

آلود فرش پر تھہرتے تھہرتے رنگ ری تھی۔ کسی کپڑے کا ایک حصہ روشنی میں آیا اور پھر اچانک ہی تاریک جھگٹی۔

سکندر ٹارچ کا بشن آن آف کرنے لگا۔ اس نے ٹارچ کو ہلکے ہلکے دو تین جھٹکے بھی دیئے کہ شاید اس کے اندرونی نیگزیم میں کوئی گزیدہ ہو لیکن کوشش کے باوجود ٹارچ روشن نہیں ہو سکی۔

اور پھر اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کوئی اس سے کھرایا ہو۔ دھکا اگرچہ ہلکا سا تھا مگر وہ لڑکھڑاکر رہ گیا۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔

”کون ہے۔“ وہ تیز لیے میں بولا۔ اس کے لیے میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

کمرے کے کونے سے ہنسی کی دہم سی آواز سنائی دی اور کوئی اس کے قریب سے گزر گیا۔ سکندر نے ایک بار پھر ٹارچ روشن کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اپنی لہو کمرے کا پیرونی دروازہ چڑچڑاہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ صاف پتہ چلا تھا کہ کوئی کمرے سے باہر گیا ہے۔ سکندر تیزی سے اس طرف لپکا۔ اسے پھر محسوس ہوا جیسے کسی سے کھرا گیا ہو۔ وہ سنبھل کر دروازے سے باہر آ گیا۔ راہداری میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی تیزی سے اس کی مخالف سمت میں جا رہا ہو۔

سکندر اس طرف دوڑا۔ قدموں کی وہ آواز اگلی راہداری میں واپس طرف مڑ کر معدوم ہو چکی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر ٹارچ کا رخ اس طرف کر دیا۔ آنکھوں سے جھن کو دہانا ہی چاہتا تھا کہ ٹارچ خود بخود روشن ہو گئی۔

ٹارچ کی روشنی راہداری کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ اس نے ٹارچ کا رخ ذرا سا اوپر کیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ راہداری سنسان تھی۔ وہ واپس مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے کے سامنے آ گیا جہاں سے وہ خود باہر نکلا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سکندر جھپٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اس مرتبہ اسے نہیں روکا گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور ٹارچ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ٹارچ کی روشنی جیسے ہی واپس کونے میں پڑی اس کا دل اچھل کر طعن میں آ گیا۔

ٹارچ کی روشنی کے حلقے میں زنانہ کپڑے پڑے ہوئے تھے اور یہ کپڑے اس نے پہچان لئے تھے۔ ٹایپ نے شام کو یہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

سے کچھ ایسے پراسرار واقعات رونما ہو رہے ہیں جن کی بظاہر کوئی توجیہ نظر نہیں آتی۔ ان چیزوں سے گو کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن ہمارے لئے پریشانیاں تو پیدا ہو رہی ہیں۔ کیا تم نے کبھی سنجیدگی سے ان چیزوں کے بارے میں سوچا ہے؟

”ہاں۔“ نایاب بولی۔ ”مجھے احساس ہوا ہے کہ میں بعض پراسرار قوتوں کے حصار میں پھنس گئی ہوں۔ بعض اوقات مجھ سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں جن کا مجھے کوئی ادراک نہیں ہوتا لیکن ہے کوئی پراسرار قوت جو مجھے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس وقت میں اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ مثلاً اس رات جب میں راجہ کی تلاش میں نکلی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ سب کچھ کیسے ہوا تھا۔ میں تو جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔ آپ نے کہا کہ آپ مجھے آوازیں دیتے رہے اور میرے پیچھے بھی آئے تھے لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہیں اور آج۔۔۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”رات کو میں اور زمرس وندہ دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں تو سو گئیں لیکن میں دیر تک جاگتی رہی۔ گھبراہٹ کی محسوس ہوئی تو میں کمرے سے باہر آگئی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کے بعد پیچھے میں اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ کسی اور کے اختیار میں تھی۔ کوئی ناپیدہ قوت پیچھے مجھے دھکیلتی ہوئی لے جا رہی ہو اور جب مجھے ہوش آیا تو میں حویلی کے قریب پہنچنے کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔“

”تم حویلی کے اندر نہیں گئیں؟“ سکندر نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نایاب بولی۔ ”اگر گئی بھی ہوں گی تو مجھے اس کا شعور نہیں۔“

”لیکن میں نے حویلی میں تمہاری ہنسی اور قہقروں کی آوازیں سنی تھیں اور ایک کمرے میں۔۔۔“ سکندر ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

”آپ نے دوسری بار یہ جملہ اذہورا چھوڑا ہے سکندر بھائی۔“ نایاب بولی۔ ”اس کمرے میں کیا تھا؟“

”میں جنہیں حویلی میں آوازیں دے رہا تھا۔ جواب میں تمہارے قہقروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آخری مرتبہ اس کمرے سے تمہارے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تم اسی کمرے میں ہو۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو یوں

نے نایاب کے کپڑے پڑے ہوئے دیکھے تھے اور حویلی سے باہر نکلتے ہوئے بھی اس نے نایاب کے قہقروں کی آواز سنی تھی۔ صرف ایک منٹ پہلے کی بات تھی اور اس قلیل وقت میں نایاب کپڑے پہن کر اس سے پہلے حویلی سے باہر نہیں آسکتی تھی۔ وہ چند لمبے بے یقینی سی نظروں سے نایاب کی طرف دیکھتا رہا پھر پھوٹے پھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے آگیا۔

”ست۔۔۔ تم کب سے یہاں کھڑی ہو؟“ اس نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”جب آپ حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں اس پہلے کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ میں نے آپ کو آوازیں بھی دی تھیں مگر آپ نے سنا نہیں تھا اور ڈیوڑھی والے دروازے سے اندر چلے گئے تھے۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“ سکندر نے اسے گھورا۔

”مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے سکندر بھائی۔“ نایاب بولی۔ ”میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ جب آپ یہاں آئے تھے تو گھوڑا حویلی کے چائیک پر اڑ گیا تھا اور کسی قیمت پر اندر جانے کو تیار نہیں تھا۔ پھر آپ گھوڑے کو یہاں ہانڈہ کر اندر چلے گئے۔ میں اس وقت سے یہاں کھڑی ہوں۔ لیکن کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا؟“

”ہات ہی کچھ ایسی ہے نایاب۔“ سکندر بولا۔ ”میں نے حویلی کے اندر تمہارے قہقروں کی آوازیں سنی تھیں اور ایک کمرے میں۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”ایک کمرے میں کیا۔۔۔؟“ نایاب نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کچھ نہیں۔ شاید مجھے دہم ہو گیا تھا۔“ سکندر نے بات بنادی۔ ”ویسے بھی اس حویلی میں کچھ ایسی پراسرار باتیں ہو رہی ہیں جن پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اب واپس چلو“ دن چڑھ رہا ہے۔“

سکندر نے گھوڑا کھول لیا۔ پہلے وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایک بڑے سے پتھر کے قریب لے آیا۔

”اس پتھر پر چڑھ کر میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔“ اس نے نایاب سے کہا۔

نایاب پتھر پر چڑھ کر اس کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ سکندر نے لگام کو حرکت دیکر گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ گھوڑا نیچے سے اتر کر پتھروں میں ایک جگہ بڑی پر چلنے لگا۔

”نایاب۔“ سکندر نے گردن کھما کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گرفتہ چند روز

گتی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ سکندر بولا۔ ”آج کسی وقت گھر میں بیٹہ کر اطمینان سے بات کریں گے۔“

نایاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سورج طلوع ہونے میں اگرچہ ابھی بہت دیر تھی لیکن کسانوں کا دن شروع ہو چکا تھا۔ بہت سے کسان کھیتوں میں اپنے کام شروع کر چکے تھے اور کچھ اپنے ڈھور ڈھوروں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف آ رہے تھے۔

نہر کے قریب پہنچ کر وہ دونوں گھوڑے سے اتر گئے۔ سکندر نے گھوڑے کی نگاہ پکڑ رکھی تھی اور وہ دونوں پیدل گھر کی طرف چلتے رہے۔

گھر میں سب لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ کینہ نے راہبہ، زکس اور عذرا کو تو نایاب کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن یہ بات بڑے ملک صاحب اور چودھری فرہان اور اس کی بیوی سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ انہوں نے نایاب اور سکندر کو حویلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد چودھری فرہان اور اس کی بیوی اپنے کپے پر اپنے گاؤں روانہ ہو گئے۔ سکندر کھیتوں پر چلا گیا۔ نایاب ناشتہ کر کے کمرے میں آکر بستر میں لیٹ گئی تھی۔ زکس اور عذرا تو گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں اور راہبہ نایاب کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

نایاب کا دماغ ڈل ہوا تھا۔ وہ راہبہ کی باتیں تو سن رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ صرف ہوں ہاں کرتی جا رہی تھی۔

اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ ان پر اسرار واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

بات اس سنہری سانپ سے شروع ہوئی تھی جسے اس نے نولے سے پچایا تھا۔ پھر چودھری سعادت کے ایک پروردہ غنڈے کی حیرت انگیز موت کا واقعہ رونما ہوا جو نایاب پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن سنہری سانپ نے نایاب کو بچانے کے لئے اس شخص کو ڈس لیا تھا اور اس کی لاش راگہ بن گئی تھی۔ پھر نایاب حیرت انگیز طور پر ٹیلے پر کھنڈروں میں رانی شہا کے خزانے تک پہنچ گئی اور پھر وہ پر اسرار بوڑھا سامنے آیا جسے نایاب نے کار میں

لگا جیسے کسی نابیدہ ہستی نے مجھے روک دیا ہو۔ کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آہستگی سے پیچھے دھکیل دیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں دوسرے کمرے میں داخل ہو کر اندر والے دروازے سے اس کمرے میں آ گیا۔ تارچ خود بخود بجھی گئی اور پھر یوں لگا جیسے تم ہستی ہوئی، تاریکی میں میرے قریب سے گزر گئی ہو۔ میں حمیس حویلی میں تلاش کرتا رہا۔ تمہارے ہنسنے کی آواز تو سناؤ دے رہی تھی مگر تم دکھائی نہیں دیں اور پھر تارچ بھی خود بخود روشن ہو گئی۔ میں دوبارہ اس کمرے میں آ گیا اور تارچ کی روشنی میں نے کمرے کے ایک کونے میں تمہارے کپڑے پڑے ہوئے دیکھے۔ میں وہ کپڑے اٹھاتا ہی چاہتا تھا کہ کمرے کے باہر راہداری میں تمہارے ہنسنے کی آواز سناؤ دی۔ میں فوراً باہر نکل آیا اور تمہاری آواز کے تعاقب میں چلا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ مجھے دھکیلا ہوا باہر کی طرف لا رہا ہو۔ پھر مجھے برآمدے والے دروازے سے باہر نکال دیا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں صرف ایک دو سیکنڈ وہاں رکا اور پھر بھاگ کی طرف آ گیا۔ برآمدے سے نکلے اور بھاگ تک تک آنے میں مجھے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا ہو گا۔ لیکن حمیس گھوڑے کے قریب کھڑے دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ تم مجھ سے پہلے وہاں کیسے پہنچ سکتی تھیں جبکہ تمہارے کپڑے بھی اس کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔“

”سکندر بھائی۔“ نایاب بولی۔ ”آپ یہ کتنا چاہتے ہیں کہ میں حویلی میں بغیر لباس کے پھرتی رہی تھی؟“

”ان کپڑوں کو وہاں دیکھ کر تو یہی تاثر ملتا تھا۔“ سکندر نے کہا۔ ”اور کپڑے بھی یہی تھے جو اس وقت تم پہنے ہوئے ہو۔ ان واقعات کو پر اسرار کہا جاسکتا ہے اور یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ گو کہ ان پر اسرار باتوں سے ہمیں اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن پریشانی تو بڑھ رہی ہیں۔ اب تک چار آدمی ان پر اسرار واقعات کا شکار ہو چکے ہیں۔ بابا لوہاب دین اور دو تین آدمی دیسے مارے چائیکے ہیں۔ تم بھی چاروں طرف سے خطرات میں گھری ہوئی ہو۔ حمیس یا ہمیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان باتوں پر ذرا سنجیدگی سے سوچو اور یہ فیصلہ کر دو کہ حمیس کیا کرنا چاہتے۔“

”میری تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا سکندر بھائی۔“ نایاب نے کہا۔ اس کے لیے میں بے بسی تھی۔ ”جب بھی کچھ سوچنے کی کوشش کرتی ہوں، دماغ میں حیرت سناہٹ سی ہونے

سے کوئی کام لیتا چاہتی تھی اور وہ کام بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے قاتل کا سراغ لگا کر اسے سزا دی جائے۔ ٹایاب نے جب پولیس انسپلر سے یہ بات کہی تھی تو اس نے ٹایاب کا مذاق اڑایا تھا۔ اول تو اسے پرانے کیس پر کام کرنا ممکن نہیں تھا اور اگر کسی طرح حاجرہ کے قاتل کا نام معلوم ہو بھی جائے تو اسے سزا کس طرح دی جاسکتی تھی۔ اگر چودھری سعادت کا دادا ہی اس کا قاتل تھا تو وہ بھی پچاس سال پہلے مر چکا تھا اور اگر کوئی اور تھا تو وہ بھی زندہ نہیں ہوگا۔ اس گاؤں میں دو چار آدمی ہی ایسے تھے جن کی عمریں ستر کے لگ بھگ تھیں۔ ان سے بھی ٹایاب نے بات کی تھی اور ان کے کہنے کے مطابق جب وہ قند چیش آیا تھا تو وہ بہت چھوٹے تھے اور انہیں اس سلسلے میں کچھ یاد نہیں تھا۔

محلہ بھر مال کچھ بھی ہو لیکن ٹایاب اس سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ وہ اس معاملے میں ابھی جاری تھی اور ابھی تک کوئی مقصد بھی سامنے نہیں آیا تھا۔

کھنڈروں کے بچے وہ جیتی خزانہ موجود تھا۔ اسے اس جیتی خزانے تک شاید اسی لئے پہنچایا گیا تھا کہ اس سہری سانپ کی ماں یا وہ جو کوئی بھی تھی، نامن شیتا اس کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتی تھی۔ وہ اس خزانہ میں سے چند ہیرے نکال کر لائی تھی جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے ابھی تک اس خزانے کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

ٹایاب دیر تک یہ سب کچھ سوچتی رہی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے شہر چلی جائے۔ ہو سکتا ہے اس دوران پر اسرار واقعات کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔

ٹایاب رات بھر جاگی تھی۔ اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جاری تھیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

ٹایاب کی آنکھ کھلی تو دوسرے کے دوج رہے تھے۔ اسے عذرا نے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اگر اسے جگایا نہ جاتا تو شاید وہ شام تک سوئی رہتی۔

”کیا بات ہے بھئی۔ کیوں جگا دیا۔“ وہ بھجائی ہوئی آنکھوں سے عذرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے لیے میں نیند کا شمار تھا۔

”کھانا تو کھا لو ٹایاب بانی! سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانے کے بعد سو

لغٹ دی تھی اور جس کی وجہ سے وہ فائزنگ سے بچ گئی تھی۔

اور پھر وہ پرانی حویلی ٹایاب کی نظروں میں آئی جو چودھری خاندان کی ملکیت تھی۔ ٹایاب نے اپنا حق سمجھتے ہوئے اس حویلی کو اپنے استعمال میں لانا چاہا اور جب وہ حویلی میں داخل ہوئی تو پر اسرار واقعات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جو ابھی تک جاری تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان پر اسرار واقعات میں اس کے دشمن ہی موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے اور ٹایاب اور اس کے ساتھیوں کو ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ تاہم چودھری کے آدمیوں نے راجہ اور قیوم کے بوڑھے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے مکان کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ قیوم اس کا ساتھ دے رہا تھا اور قیوم کو ٹایاب سے ہمدردی کی سزا دینے کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ٹایاب کا ساتھ دینے والے دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی ان کے ایسے ہی ارادے ہوں لیکن ٹایاب جس طرح راجہ کو ان کے قہقے سے نکال لائی تھی اور جس طرح ملنگی کا ساتھی بھر خنک موت کا شکار ہوا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا تھا کہ اب وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

چودھری سعادت اور ملنگی ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ چودھری سعادت کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ شہر گیا ہوا ہے اور لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ قیوم کے گھر کو جلائے اور راجہ کے اغرا کے منصوبے میں اسی کا ہاتھ تھا لیکن وہ اس پر واضح طور پر الزام نہیں لگا سکتے تھے۔ البتہ ملنگی کا اس کیس میں شامل ہونا ثابت ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کی واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ٹایاب یہ سب کچھ سوچتی رہی۔ اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔ پہلی مرتبہ جب وہ حویلی میں گئی تھی تو اس نے وہاں ایک لڑکی کی لاش دیکھی تھی اور پر اسرار سرکشوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ گاؤں کے موچی کی بیٹی تھی جسے ساٹھ ستر سال پہلے قتل کیا گیا تھا اور بعد میں گاؤں والوں نے تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ اتنا عرصہ پہلے اس کا نام کی ایک لڑکی کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا تھا اور اس کے بوڑھے باپ نے خودکشی کر لی تھی۔ حاجرہ کے قتل کا الزام چودھری سعادت کے دادا پر عائد کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔

ٹایاب نے اس روز سرکشوں والی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ حاجرہ کی روح اس

جانا۔“ غزرا نے کہا۔

غائب کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ نیند کا شمار اب بھی باقی تھا۔ اگر غزرا اسے پکڑ کر سہری سے نہ اٹھا دیتی تو شاید وہ دوبارہ سو جاتی۔ کمرے سے باہر آ کر وہ ہاتھ روم میں گھس گئی اور منہ پر فھٹے پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد وہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ملک صاحب کئی روز بعد آج گھر کے سب افراد کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ سکندر کا کھانا پیلے ہی ڈیرے پر بھجویا جا چکا تھا۔

کھانے کے دوران زیادہ تر چودھری فرمان اور اس کی بیوی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ملک صاحب چودھری فرمان سے ٹکر بست خوش ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں ایسے شریف اور سیدھے سادے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔

ہاں۔۔۔ غائب بیٹی۔“ وہ غائب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم سے تو کئی روز سے باتیں نہیں ہو سکی ہیں۔ کہاں تک پہنچا تمہارا معاملہ؟“

”معاملہ تو جوں کا توں ہے انکل!“ غائب نے جواب دیا۔ ”چودھری سعادت کی حرکتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مجھے تو کئی سیدھی انگلی سے لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔ گتا ہے انگلیاں ٹیڑھی کٹنی ہی پڑیں گی۔“

”تمہارے مقدمے کی چیٹی کب ہے اور فیصلہ ہونے کی توقع کب تک ہے۔“ ملک صاحب نے پوچھا۔

”چیٹی اگلے مہینے کی تین تاریخ کو ہے یعنی آج سے سات دن بعد۔“ غائب نے جواب دیا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ اس سے انکی چیٹی پر فیصلہ ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے۔ ملک صاحب نے کہا ”فیصلہ انشاء اللہ میرے ہی حق میں ہو گا۔“ غائب نے کہا۔

”لیکن اس مقدمے کے علاوہ چودھری سعادت جو کچھ کر رہا ہے، اس پر مجھے تشویش ہے۔ اس کی حرکتوں سے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا لیکن گاؤں کے لوگوں کے ساتھ جو زیادتیوں ہو رہی ہیں ان کا مجھے افسوس ہے۔ مگر آپ یقین کیجئے انکل۔ اس ٹھٹھیا انسان کو اپنی حرکتوں کا فائدہ بھگتنا پڑے گا۔ اس نے رابہ کے گھر کو جس طرح برباد کیا ہے اسے

میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ سعادت کو اپنے کرتوتوں کا حساب دینا پڑے گا اور وہ حساب عدالت میں نہیں، یہاں ہو گا۔“

”ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔ سب کو ہی افسوس ہے لیکن بیٹا۔۔۔ یہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ مجھے یا تمہیں اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کی ضرورت نہیں۔ اس طرح معاملہ مزید اچھ جائے گا۔“

”انکل۔“ غائب نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پولیس جو کچھ کر رہی ہے وہ بھی ہم سب جانتے ہیں۔ آج اگر ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں تو پولیس دو دن میں ہی اس معاملے کو بھول جائے گی۔ پولیس کو اگر کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکی ہوتی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ پولیس بھی واضح طور پر جانبداری سے کام لے رہی ہے۔ اس لئے اس معاملے میں میری مداخلت ضروری ہے۔ میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی ہوں اور پھر میں اکیلی نہیں، گاؤں والے میرے ساتھ ہیں۔“

”میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ معاملہ سنبھلنے کی بجائے چودھری فیملی سے تمہاری دشمنی زیادہ گہمیر ہوئی جا رہی ہے۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ یہ معاملات کسی طرح حل ہو جائیں۔“

”میں تو معاملہ سمجھنے کو تیار ہوں مگر چودھری خاندان والے ایسا نہیں چاہتے۔ وہ جیلوں بہانوں سے اس جھگڑے کو زیادہ طول دینا چاہتے ہیں تاکہ تاکہ جائیداد تقسیم ہونے کا معاملہ ٹل رہے۔ لیکن اب میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ یہ قصہ آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔“

”اگر تم کو تو میں چودھری امانت علی سے مل کر ایک اور کوشش کر لوں۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ غائب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں ہو گا۔ صورتحال اس قدر بگڑ چکی ہے کہ انہیں سمجھانے کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوگی۔ بہرحال آپ ایک کوشش کر دیکھئے تاکہ کل کو آپ یہ نہ کہہ سکیں کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔“

چاہتی ہو۔“

تقریباً دس منٹ بعد ٹایاب راجہ کو لیکر بیٹھک میں آگئی۔ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا بیٹہ کاشیپل انہیں دیکھ کر اٹھ گیا۔

”بیٹھو حوالدار جی!“ ٹایاب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ راجہ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”بیگم صاحبہ“ بیٹہ کاشیپل دوبارہ کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ ”وہن والی سے آج صبح پولیس نے ایک آدمی کو پکڑا ہے۔ اس کا علیہ اگرچہ ملکی کے بتائے گئے ملے سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ اپنا نام کچھ اور بتاتا ہے۔ راجہ لی لی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے خلاف رپورٹ میں ملکی کا نام درج ہے۔ اس لئے تھانیدار صاحب نے راجہ لی لی کو بلایا ہے تاکہ اس کی شناخت ہو سکے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں راجہ کو ساتھ لیکر آتی ہوں۔“ ٹایاب بولی۔ ”تم کیسے آئے ہو۔ ٹانگے پر یا سائیکل پر۔“

”میں سب انسپکٹر کی مونٹر سائیکل لے کر آیا ہوں جی!“ حوالدار نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ ہم بھی آ رہی ہیں۔“ ٹایاب نے بیٹہ کاشیپل کو گھر کے دروازے سے رخصت کر دیا اور دروازہ بند کر کے راجہ کے ساتھ اندر آگئی۔

ان دونوں کو کپڑے بدلنے میں دس پندرہ منٹ لگے تھے۔ ٹایاب نے ملک صاحب کو بھی راجہ کے لئے پولیس کے بلاؤس کے بارے میں بتا دیا۔

”میں چلوں تمہارے ساتھ بیٹی!“ ملک صاحب بولے۔

”نہیں اٹکل۔ آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ پولیس سے بات کرنے کے لئے میں کافی ہوں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے زمر سے گاڑی کی چابی لی۔

تقریباً دس منٹ بعد ان کی گاڑی گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ نور پور تھانے پہنچنے میں انہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ گاڑی تھانے کے سامنے روک کر وہ دونوں بچے اتر آئیں اور جیسے ہی وہ تھانے کے گیٹ میں داخل ہوئیں، دائیں

طرف ٹائلی کے درخت کے نیچے بندھی ہوئی سفید گھوڑی دیکھ کر ٹایاب چونک گئی۔ اس نے

”جیتی رو بیٹی۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے۔“

”میں سوچ رہی ہوں کہ کل شہر چلی جاؤں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”ڈیڑی کو بھی دیکھ آؤں گی اور کوٹھی کی آغوش والی معاملہ بھی ابھی کٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے ٹارٹا می ایک آدمی کو کوٹھی کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکھا ہوا تھا۔ اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ شہر جا کر ہی صورتحال کا اندازہ ہوگا۔“

”میرا خیال ہے تمہیں پہلے شہر چلے جانا چاہئے تھا۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”سوچا تو میں نے بھی یہی تھا۔“ ٹایاب بولی۔ ”لیکن یہاں پیدا ہونے والی مگر بڑی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ یہاں، دیر آئے درست آئے۔“

کھانے کے بعد ملک صاحب دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ زمرس وغیرہ بھی برتن وغیرہ سمیٹنے لگ گئی تھیں۔ البتہ راجہ وہاں بیٹھی رہی تھی۔

”کیا تم واقعی شہر چلی جاؤ گی ٹایاب؟“ راجہ نے پوچھا۔

”ہاں چند روز کے لئے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چلی چلو۔ آؤنگ ہو جائے گی۔ دھیان بٹ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ضرور چلوں گی۔“ راجہ بولی۔ ”مگر تم نے کہیں تو میں خود تم سے کہنے والی تھی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

”تو ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ ٹایاب نے کہا۔ وہ ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ گھر کا کام کاج کرنے والی عورت نے آکر بتایا کہ نور پور تھانے کا ایک سنتری راجہ سے ملنے آیا ہے۔

”اسے بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں راجہ کو لیکر آ رہی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”کیا بات ہے۔ یہ سنتری راجہ سے کیوں ملے آیا ہے؟“ سیکرٹ نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے بہائی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”راجہ ان دنوں جس صورتحال سے دوچار ہے اس کا آپ کو علم ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس اسی سلسلے میں کچھ پوچھتا

دیکھتے ہوئے کہا۔

”جن لوگوں نے ہمارے گھر پر حمل کیا تھا وہ سب لوگ ڈھانے پاندے ہوئے تھے۔ اس لئے میں اس وقت کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ لیکن۔“ راجہ چند لمحوں کا خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن جو لوگ مجھے اٹھا کر لے گئے تھے انہوں نے گھوڑوں پر طویل مسافت کے بعد مجھے ایک دیران مکان میں لپکا کر ڈال دیا تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے اپنے چہروں سے ڈھانے ہٹائے تھے۔ وہ چار آدمی تھے۔ یہ ان میں نہیں تھا لیکن چند گھنٹوں بعد یہ بھی وہاں آگیا تھا اور اس نے ان لوگوں کو شاباش دی تھی۔“

”یہ۔۔۔ یہ جھوٹ بولتی ہے تھانیدار جی۔“ ملنگی بولا۔ ”میں ڈر کر گاؤں سے ضرور بھاگ گیا تھا لیکن یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے۔ میں ان چاروں میں سے کسی کو نہیں جانتا جن کے بارے میں یہ بتا رہی ہے۔“

”میں بتاتی ہوں وہ کون تھے اور تم ان سب کو جانتے ہو۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دو آدے کا مشورہ ڈاکو حاکم علی۔ اس کے ساتھ امین اور بھر بھی تھے۔ ایک اور آدمی تھا جو وہاں سے چلا گیا تھا۔ دریا کے کنارے اس دیران رست ہاؤس میں تم لوگوں کو چودھری مسرات کا انتظار تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ تم لوگوں نے وہ سارا دن اس دیران رست ہاؤس میں گزارا اور پھر رات کے پچھلے پھر حاکم علی اور امین وہاں سے چلے گئے۔ میرا تو تم نے روک لیا تھا۔ تم حاکم علی اور امین کو رخصت کرنے کے لئے ان کے ساتھ باہر کھڑے بائیں کر رہے تھے اور جب اندر واپس آئے تو راجہ غائب تھی۔“ ٹایاب خاموش ہو کر ملنگی کی طرف دیکھنے لگی۔

ملنگی کے چہرے پر ہوا یائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ سی نظروں سے ٹایاب کو دیکھتے ہوئے بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتے ملنگی!“ ٹایاب نے کہا۔ ”تمہیں حیرت ہوگی کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتی ہوں۔ میں بتاتی ہوں۔ راجہ کو اس رست ہاؤس سے نکلنے والی میں تھی۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر لائی اور کھیت میں پھینک دی۔ تم اور بزر راجہ کو تلاش کرتے رہے پھر میرا کو خشک سکندر کی وہ گھوڑی مل گئی جو رست ہاؤس سے پچاس گز دور درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ تم

سکندر کی گھوڑی پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ گھوڑی نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اور اٹھا پیر زمین پر مارنے لگی۔ ٹایاب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھوڑی کے پاس پہنچ گئی اور اس کی گردن مٹھتے پھانسی لگی۔ گیٹ پر کھڑا ہوا سنتری اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹایاب راجہ کو لیکر اندر آگئی۔ انسپکٹر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ ان دونوں کو دیکھ وہ کرسی سے اٹھ گیا۔

”پچھنے لی بی!“ انسپکٹر نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کتنی ہیں کہ ہم جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ اس واردات کو آج تیسرا ہی دن ہے اور دیکھئے ہم نے ایک آدمی کو پکڑ لیا ہے۔ راجہ بی بی اسے شناخت کر لیں تو ہم بہت جلد اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی پکڑ لیں گے۔“

”کوئی رزلٹ نکلتا چاہئے انسپکٹر صاحب!“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسے یہاں بلائیے۔ دیکھیں وہ کون ہے۔“

انسپکٹر نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ چند منٹ بعد ہی ہیڈ کانسٹیبل ایک کانسٹیبل کے ساتھ ایک آدمی کو دھکے دیتا ہوا اندر لے آیا۔

”کیوں لوئے۔ انہیں جانتے ہو؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”اس لی بی کو جانتا ہوں بی!“ اس نے ٹایاب کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ملک صاحب کی پردہنی ہے۔ گاؤں میں دیکھا ہے جی اسے۔ لیکن اس کو نہیں جانتا بی!“ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”اب آئے ہو نا راستے پر۔“ انسپکٹر بولا۔ ”اب تو تم یہ بھی اعتراف کر لو گے کہ تم ملنگی ہو۔“

”آہو جی۔ میرا نام ملنگی ہے جی۔ لیکن میرا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے جی۔ میں تو در کے مارے گاؤں سے بھاگ گیا تھا جی۔“ ملنگی نے کہا۔

”راجہ بی بی۔ آپ اسے پہچانتی ہیں۔ آپ کے مکان کو آگ لگائے۔ آپ کے والد کو قتل کرنے، آپ کے بھائی کو زخمی کرنے اور آپ کو اٹھا کر لے جانے والوں میں یہ بھی شامل تھا یا نہیں۔ اسے کسی موقع پر آپ نے دیکھا تھا یا نہیں۔“ انسپکٹر نے راجہ کی طرف

اس کی زبان سے سنا چاہتا ہوں۔“
ہیڈ کانسٹیبل نے ملکی کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا دفتر سے باہر لے گیا۔

ٹایاب اور راجہ تقریباً ایک گھنٹے تک قہانے میں بیٹھی رہیں اور پھر ان کی موجودگی ہی میں ملکی کو دوبارہ انسپکٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ پولیس والوں نے اس کی ٹھیک ٹھاک توضیح کر ڈالی تھی۔ اس مرتبہ سوال کرنے پر وہ واقعی فر فر بولے گا تھا۔

ملکی کے کہنے کے مطابق یہ منصوبہ چودھری سعادت علی نے تیار کیا تھا۔ لیکن اس منصوبے کے مطابق صرف راجہ کو اغوا کرنا مقصود تھا۔ سعادت یہ کام گاؤں کے کسی آدمی سے نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ کام ملکی کے سپرد کر دیا۔ چار روز پہلے ملکی نے دو آدھے کے علاقے میں حاکم علی سے رابطہ کیا۔ حاکم علی اس علاقے کا ایک بدنام ڈاکو تھا۔ اس کے گردہ میں کئی لوگ شامل تھے جو دو آدھے کے جنگل میں پناہ گاہوں میں چھپے رہتے تھے اور آس پاس کی بستیوں اور گاؤں دہاتوں میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔

حاکم علی سے دو لاکھ میں معاملہ طے ہوا تھا۔ اسے صرف لڑکی اغوا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی کارکردگی دکھا گیا۔ انہوں نے راجہ کو اٹھانے کی کوشش کی جسی قیوم اور بوڑھے نواب دین کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس پر حاکم علی نے نواب دین پر کھانڈیوں سے وار کئے۔ اس کے ایک آدمی نے مکان کو آگ لگا دی۔ قیوم نے حاکم علی کو روکنے کی کوشش کی تو اس پر بھی حملہ کیا گیا۔ قیوم ڈھکی ہو کر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ حاکم علی اور اس کے ساتھی یہی سمجھے کہ وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہ لوگ راجہ کو لیکر فرار ہو گئے۔

ملکی اس رات گھر میں ہی تھا۔ گاؤں میں شور کی آوازیں سن کر وہ بھی جاگ گیا تھا لیکن وہ صورتحال معلوم کرنے کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آج رات حاکم علی اور اس کے ساتھی راجہ کو اٹھا کر لے جانے والے ہیں۔

صبح چھ بجے کے قریب ایک پردی نے ملکی کو بتایا کہ گاؤں میں کیا ہو چکا ہے۔ اس صورتحال سے ملکی ڈر گیا۔ وہ چودھری سعادت کا کارندہ تھا اور اس کے اشارے پر کچھ بدساتھی بھی کرتا رہتا تھا۔ گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ چودھری سعادت اور

سمجھے کہ شاید ملک سکندر راجہ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا ہے۔ تم دونوں دن "نون" فائزنگ بھی کرتے رہے۔" ٹایاب چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور ایک بار پھر ملکی کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی۔ "تمہارا ساتھی میری گاؤں تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش میں پراسرار طور پر خوفناک موت کا شکار ہو چکا ہے۔ تم بھی اپنے انجام سے نہیں بچ سکتے اور نہ ہی تم وہاں اپنی موجودگی سے انکار کر سکتے ہو۔ وہاں تمہاری موجودگی کا ایک ثبوت ملک سکندر کی وہ گھوڑی ہے جو اس وقت قہانے کے کپڑوں میں بندھی ہوئی ہے۔ میں اسی گھوڑی پر اس دیران رست ہاؤس تک پہنچی تھی جو بند میں تمہارے ہاتھ لگ گئی اور اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنے جرم کا اعتراف کرو۔ ورنہ جانے ہو کہ پولیس زبان کھولنے کے لئے کیسے کیسے خوفناک طریقے اختیار کرتی ہے۔"

"ٹایاب لی بی بی! قہانیدار نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "اب آپ کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ باقی باتیں اس سے ہم خودوا لیں گے۔ معاملہ صرف ذہنی اور اغوا کا نہیں قتل کا بھی ہے۔"

"مہم میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" ملکی ایک دم بول پڑا۔ "یہ درست ہے کہ میں اس رست ہاؤس میں پہنچ گیا تھا لیکن میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا۔"

ٹایاب اس کے چہرے پر نظرس جماتے ہوئے بولی۔ "یہ منصوبہ کس نے بنایا تھا؟"

"وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" ملکی ٹھٹھکیا۔

"تم پولیس کی حفاظت میں ہو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر تم نے سب کچھ بچ چ نہ بتایا تو نواب دین کے قتل سمیت تمام جرائم تمہارے کھاتے میں آئیں گے اور پھر تمہیں جیلانی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیوں انسپکٹر صاحب میں نے غلط تو نہیں کہا؟" ٹایاب انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگی۔

"جو باتیں مجھے کہنی چاہئے تھیں وہ آپ کہ دی ہیں۔" انسپکٹر مسکرایا۔ "فوق صرف

اس طرح ملکی، حاکم علی کے ذریعے پر پہنچنے کے بجائے پولیس کے کھیتے میں آگیا۔
 ”میں بالکل بے تصور ہوں قنایدار جی۔“ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تو ایک معمولی سا کارندہ ہوں۔ مجھے جو حکم ملتا ہے وہی کرتا ہوں۔“
 ”جب تم یہ سب کچھ کر رہے تھے، اس وقت تو تم نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ تمہارا کیا انجام ہوگا۔ اب تمہیں پتہ چل جائے گا۔“ قنایدار نے کہا۔ پھر ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بندر کو دوسرے میں بعد میں دیکھوں گا۔“

”تو ہم چلیں انسپکٹر صاحب!“ ٹایپ بولی۔ ”اب ساری بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ کی تفتیش میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے۔“
 ”آپ فکر نہ کریں ٹایپ بی بی۔“ انسپکٹر بولا۔ ”یہ کیس اب کسلی کتاب کی طرح سامنے آگیا ہے۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں وہ انجمنیں تھیں وہ بھی ختم ہوگئی ہیں۔ مجرم خواہ کتنا ہی پاڑا کریں نہ ہو، قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔“

”شہریرہ جنتاب!“ ٹایپ منکراتے ہوئے بولی۔ ”ملک صاحب کی گھوڑی باہر بندھی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں۔۔۔“
 ”گھوڑی شام تک پہنچ جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ٹایپ اور رابہر تھانے سے باہر آئیں۔

گاؤں کی طرف جاتے ہوئے ٹایپ نے کار ایک جگہ روک لی اور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں تقریباً پانچ سو گز دور رہے پر وہ پرانی کوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک راستہ اس طرف سے بھی حویلی تک جاتا تھا لیکن یہ راستہ جھاڑوں سے پٹا پڑا تھا۔ ٹایپ کچھ دیر تک حویلی کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے کار آگے بڑھا دی اور رابہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”حویلی کی صفائی دیکھو میں کم از کم ایک مہینہ لگے گا۔ اب شہر سے واپس آکر ہی کام شروع کراؤں گی اور اسی وقت تمہارے مکان کا کام بھی شروع کیا جائے گا۔“
 ”میرے مکان کا کام؟“ رابہر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بھئی۔ تمہارا مکان بھی تو بونا ہوگا۔ مکان نہیں ہوگا تو تم لوگ روگے کماں۔“
 ٹایپ نے کہا۔

ٹایپ میں مثل چل رہی ہے۔ چودھری کے نام پر ان تمام لوگوں کو دھمکیاں دی گئی تھیں جو ٹایپ کا ساتھ دے رہے تھے۔ قیوم اور چند آدمی چونکہ ٹایپ کے لئے حویلی کی صفائی کا کام کر رہے تھے اس لئے انہیں بھی دھمکیاں گئیں تھیں کہ وہ ٹایپ کا ساتھ چھوڑ دیں اور قیوم کی بس کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ دوسرے جہت حاصل کریں اور ٹایپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ لیکن معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا تھا اور ملکی درمیا تھا کہ کہیں گاؤں کے لوگ اسے نہ مار ڈالیں۔

وہ گاؤں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلے سے لے شدہ پروگرام کے مطابق حاکم اور اس کے ساتھی رابہر کو لیکر دریا کے کنارے اس دریاں رست ہاؤس میں چلے گئے تھے۔ ملکی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اگلے دن شام کو چودھری سماعت کو بھی وہاں پہنچنا تھا لیکن اسے بھی اس صورت حال کی اطلاع مل گئی تھی اور شاید وہ اسی لئے وہاں نہیں آیا تھا۔

اگلی رات حاکم علی، بہر کو ملکی کے پاس چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے فوراً ہی بعد رابہر پر اسرار طور پر رست ہاؤس سے غائب ہوگئی تھی۔ وہاں ملک سکندر کی گھوڑی دیکھ کر ملکی ڈر گیا تھا۔ وہ رات بھر اسی علاقے میں رابہر اور سکندر کو تلاش کرتے رہے پھر اس نے بہر کو گاؤں کی طرف بھیج دیا کہ اگر رابہر اور سکندر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے نظر آئیں تو انہیں ختم کر دیا جائے۔

بہر نے دو تین آدمیوں کو ساتھ ملا لیا اور گاؤں کے راستے کے قریب چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چودھری فرماں کے کیے کو روکا اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ سب کے لئے حیرت انگیز تھا۔ اس پر اسرار بوڑھے کے بارے میں گاؤں کے سب ہی لوگ جان چکے تھے۔ بہر اس پر اسرار بوڑھے کے ہاتھوں نارمیا۔ اس کے تین ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ملکی کو بہر کی موت کی اطلاع مل گئی۔ وہ ڈر کر اپنی موجودہ پناہ گاہ سے بھی بھاگ نکلا اور دو آپے کے علاقے میں جنگل کے کنارے اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ گیا جہاں اس نے ڈاکو حاکم علی سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے حاکم علی کو پیغام بھجوایا اور اس بستی میں رک کر انتظار کرنے لگا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ اس کا خیال تھا حاکم علی اب صبح ہی آئے گا یا اسے جنگل میں اپنے ٹھکانے پر بلائے گا۔ لیکن صبح سویرے پولیس نے اس بستی کو گھیرے میں لے لیا اور

”ہاں۔ بشرطیکہ پولیس والے اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔“ ٹایاب نے کہا۔
”تھانے میں ملنے کے بیان سے اگرچہ بے بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ ساری کارروائی
چودھری سعادت کے کئے پر ہوئی تھی۔ پولیس اگر چاہے تو اسے قتل، اغوا اور آتشنی کے
الزام میں گرفتار کر سکتی ہے۔“

”پولیس چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔“ سکندر بولا۔ ”لیکن میرے خیال میں ایسا ہوگا
نہیں۔ چودھریوں کی بیخ کنی بہت اوج تک ہے۔ وہ اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار
ہیں۔ چودھری امانت علی بھی بے نہیں چاہے گا کہ پولیس اس کے بیٹے کو ہتھکڑی لگا کر لے
جائے۔ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو اس کے بس میں ہوگا۔
البتہ یہ ضرور ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے کچھ بے گناہوں کو آگے کرے۔“

”لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”کل میں شر جابری
ہوں۔ پاپا کے ذریعے اوپر سے بھی کچھ دباؤ ڈالواؤں گی۔ سزا مجرموں کو ملنی چاہئے“ بے
گناہوں کو نہیں۔“

”کل تم شر جاری ہو!“ سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہاں اور راہبہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔ ماحول کی تہذیبی سے شاید اس کے دکھوں
کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ لے جاؤ اسے بھی۔ لیکن۔۔۔“
”لیکن کیا سکندر بھائی؟“ ٹایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
”اس خزانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔ اس مرتبہ اس
کی آواز سرکوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

”ہر چند میرے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی جو ہم وہاں سے لائے تھے۔“ ٹایاب نے
جواب دیا۔ ”شر میں ان کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ اس رقم سے چھوٹے موٹے کام
ہو جائیں گے۔ حویلی کی تعمیر نو کرانے کے علاوہ میں قیوم اور راہبہ کو مکان بھی بنا کر دینا
چاہتی ہوں تاکہ انہیں سرچھپانے کی جگہ مل سکے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ دونوں زندگی بھر جہنم دھائیں دیتے رہیں گے۔“
سکندر نے کہا۔

”ہمارا مکان۔۔۔ تم بجاؤ گی!“ راہبہ کے لیے میں حیرت تھی۔

”ہاں بھی۔“ ٹایاب گمراہ سا لہجے میں بولی۔ ”یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا
ہے۔ تمہارے ابا کو تو میں واپس نہیں لاسکتی۔ یہ کسی کے بس میں بھی نہیں ہے۔ البتہ
دوسرا نقصان پورا کر سکتی ہوں۔ میں آج قیوم سے بھی بات کروں گی۔ ہماری واپسی تک وہ
ملبہ دنیو ہوا ہے گا۔ جگہ کی پیکٹس کا پتہ چل جائے تو میں شہر میں کسی آرکیٹیکٹ سے
کوئی ڈھنگ کا نقشہ بھی بنوا لوں گی۔“

”کیا تمہارے پاس ایسا چیز ہے کہ یہ سب کچھ کر سکو۔ جہیں تو ابھی اس جائیداد میں
حصہ بھی نہیں ملا۔“ راہبہ نے کہا۔

”جائیداد میں حصہ۔“ ٹایاب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”میں اس جائیداد کے حصے پر
انحصار نہیں کر رہی ہوں راہبہ۔ دیے بھی میں اتنی گئی گزری نہیں ہوں اور بھراپ تو مجھے
اتنی دولت مل گئی ہے کہ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیسی دولت؟“ راہبہ نے پوچھا۔
”تم لوگوں کے پیار اور غلوں کی دولت۔“ ٹایاب نے بات بدل دی۔ ”ان چیزوں کے
سامنے دنیاوی دولت کوئی شیت نہیں رکھتی۔“

”تم نے بات بدل دی۔“ راہبہ نے اسے گھورا۔ ”شاید کچھ چھپانا چاہتی ہو۔ لیکن میں
وہ بات جاننے کے لئے اصرار نہیں کروں گی جو تم نہیں بتانا چاہتیں۔“

”ہاں۔ کوئی ایسی ہی بات ہے۔ وقت آنے پر ہمیں سب کچھ بتا دوں گی۔ کچھ نہیں
چھپاؤں گی تم سے۔“

راہبہ نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ گاڑی گاڑوں میں داخل ہو چکی تھی۔ ٹایاب اسے
مختلف گلیوں میں گھمائی ہوئی حویلی کی طرف لے آئی۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ ایک
گھنٹے بعد سکندر بھی کھینچوں سے آگیا۔

ٹایاب ملک صاحب کو تباہی چکی تھی کہ تھانے میں کیا ہوا تھا اور اب وہ سکندر کو
بھی صورتحال سے آگاہ کر رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے اب پولیس چودھری سعادت کے پیچھے پڑ جائے گی۔“ سکندر اس
کے خاموش ہونے پر بولا۔

”ٹھیک ہے پھولی بی بی۔“ قیوم نے کہا۔ ”زمین کی پکائش میں آپ کو صبح دیکھوں گا۔ لیکن آپ کب تک واپس آئیں گی۔“

”ایک ہفتہ تو لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے دو چار دن اور بھی ہو جائیں۔ تم رابہ کی طرف سے پریشان مت ہونا۔“ ثایاب نے کہا۔

”رابہ آپ کے ساتھ جاری ہے جی۔ میں پریشان کیوں ہونے لگا۔“ قیوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔“ ثایاب نے کہا۔ ”صبح سات بجے سے پہلے مجھے زمین کی پکائش بتا دینا۔ میں جلدی نکل جانا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جی۔ میں صبح سات بجے سے پہلے ہی آجاؤں گا۔“ قیوم کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر رابہ کے پاس کھڑا باتیں کرتا رہا پھر رخصت ہو گیا۔

قیوم کے جانے کے بعد ثایاب اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو اس کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا جس میں دو جوڑے کپڑوں کے علاوہ ضرورت کی چند چیزیں تھیں۔ یہاں اگر تو وہ زمرس ہی کے کپڑے استعمال کرتی رہی تھی اور اب وہ زمرس والے استعمال شدہ کپڑے بھی ساتھ لے جا رہی تھی۔ دو تین جوڑے رابہ کے تھے جو اسے گاؤں کی عورتوں نے دے دیے تھے۔ لیکن نے اسے اپنا ایک سوٹ کیس دیکھا تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ گاؤں کی کچھ سوغاتیں بھی تھیں۔ اسی طرح ایک گھڑی بھی تیار ہو گئی تھی۔ تیاری مکمل کرنے کے بعد وہ زمرس و فیروہ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھ گئی اور باتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

ان میں سے کوئی بھی رات کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ زمرس صبح چھ بجے باورچی خانے میں گھس گئی اور ناشتہ تیار کرنے لگی۔

وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ قیوم بھی آگیا۔ اس نے کانڈ کا ایک ٹکڑا ثایاب کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ مکان والی زمین کی پکائش ہے۔“ اس نے کہا پھر رابہ سے باتیں کرنے لگا۔ سندر بھی ناشتہ کر کے تیار ہو چکا تھا۔ سوٹ کیس اور گھڑی کار کی ڈگی میں رکھ دی گئی۔ سندر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ رابہ اور ثایاب پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گاؤں کی

”اس کے علاوہ آپ بھی سوچئے کہ ہمیں وہ خزانہ کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔ آپ بھی کوئی منصوبہ بنائیے۔“ ثایاب نے کہا۔

”میرے ذہن میں ایک دو منصوبے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کیس کا فیصلہ ہو جائے تو کوئی پروگرام بنایا جائے۔“ سندر بولا۔

”کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“ ثایاب بولی۔ ”آپ انکل سے بات کریں۔ گاؤں کے کچھ اور مسترد اور قابل اعتماد لوگوں سے بھی مشورہ کریں اور کوئی پروگرام فائنل کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری واپسی تک کوئی پروگرام بن جائے گا۔“ سندر نے کہا اور پھر اس رات کھانے کے بعد ثایاب نے قیوم کو بھی حویلی بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ وہ کل شہر جاری ہے اور رابہ بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ قیوم نے رابہ کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

”تم میرے آنے تک مکان کا لمبہ صاف کرا دو اور کیا ہمیں معلوم ہے کہ اس جگہ کا رقبہ کتنا ہے؟“ ثایاب نے پوچھا۔

”دو کمال ہے جی۔“ قیوم نے جواب دیا۔ ”یہ زمین بابا حسین دین نے لیا کو دی تھی۔ لہذا نہ دو کمرے بنوا لئے تھے اور باقی معن کھلا رکھا تھا۔“

”میرا خیال ہے زمین کا وہ ٹکڑا استعمال ہے۔“ ثایاب بولی۔ ”صبح میرے جانے سے پہلے اس کی لمبائی چوڑائی کی پکائش کر کے مجھے بتا دینا تاکہ میں شہر سے مکان کا نقشہ بنوا لاؤں اور واپس آکر کام شروع کروا دوں۔“

”میں سمجھا نہیں، کیا نقشہ؟ کیا کام؟“ قیوم نے ابھی ہوئی ٹکاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ پرانی حویلی کو تڑوا کر کوئی نقشہ بنوانا چاہتی ہیں؟“

”میں پرانی حویلی کی نہیں، تمہارے مکان کی بات کر رہی ہوں۔“ ثایاب نے کہا۔ ”اپنے مکان والی زمین کی لمبائی چوڑائی ناپ کر مجھے بتا دینا۔ میں شہر سے واپس آتے ہی مکان کی تعمیر کا کام شروع کروا دوں گی اور پرانی حویلی کا کام بھی اب واپس آنے کے بعد ہی شروع کراؤں گی اور ہاں اگر میرے بعد کوئی غیر معمولی بات ہو تو فوراً شہر آکر مجھے اطلاع دینا۔“

وجہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ کوئی مرد تھا یا عورت لیکن پھر وہ ہیولہ واضح ہوتا چلا گیا۔ ٹایاب کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں دودھین کے لینز فٹ ہو گئے ہوں۔ لینز جیسے آہستہ آہستہ ایلے جسٹ ہو رہے تھے اور ہیولہ قریب آتا جا رہا تھا اور پھریوں لگا جیسے وہ ٹایاب کے بالکل سامنے کھڑا ہو۔

ٹایاب کے منہ سے بے اختیار مگر سانس نکل گیا۔ وہ اس نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ایسا جوان رحما اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لمبا قد، سرخ و سفید رنگت، موٹی موٹی چھتی ہوئی آنکھیں، ٹایاب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے اپنی طرف بلا رہا ہو اور پھر ٹایاب نے دروازہ کھولنے کیلئے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سکندر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ٹایاب کے منہ سے ایک بار مگر سانس نکل گیا۔ حویلی کے جھروکے میں کھڑا ہوا وہ خوبرو نوجوان اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ جیسے وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ ٹایاب کچھ دیر اسی طرف دیکھتی رہی پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

کیا ہوا ٹایاب۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ راجہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ ٹھیک ہوں“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”سر میں اچانک ہی درد شروع ہو گیا ہے۔“

”مگر طبیعت خراب ہو رہی ہے تو آج کا پروگرام کینسل کر دو ٹایاب۔ لمبا سفر ہے۔ راستے میں اگر طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو۔۔۔“

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ ٹایاب نے سکندر کی بات کٹ دی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”نور پور پہنچ کر پونشان کی دو گولیاں لے لوں گی۔ سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور پھر نور پور پہنچ کر اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ سکندر نے کار ایک میڈیکل سٹور کے سامنے روک لی اور نیچے اتر کر دکان سے پونشان کا پورا اسٹریپ اور پانی کا گلاس لے آیا۔ ٹایاب نے دو گولیاں پانی کے ساتھ حلق سے اتار لیں اور پانی پتہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

سکندر نے انہیں شاہ پور جانے والی اینٹرکنڈینٹ کوچ میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا

بست سی عورتیں ٹایاب اور راجہ کو رخصت کرنے پہنچ گئی تھیں۔ راجہ اور ٹایاب نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ لہرایا اور کار حرکت میں لگئی۔

کار گاڑوں سے نکل کر کھیتوں کے درمیان شہر کی طرف جانے والی سڑک پر چلنے لگی۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی ہونے کی وجہ سے کار کی رفتار بہت تھکی گئی۔

ٹایاب کھڑی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کار اب اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں سے پرانی حویلی نظر آ رہی تھی۔

ٹایاب حویلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دھننا۔ وہ چمک گئی۔ حویلی کی اوپر والی منزل پر ایک عمارتی جھروکا تھا جہاں بیٹھ کر دور دور تک کھیتوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور اس وقت اس جھروکے میں کسی کو کھڑے دیکھ کر ٹایاب چونک گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا، سفید لباس پہنے ہوئے تھا اور اس میں شرے پٹن کی جھلک بھی لہٹا رہی تھی۔ ٹایاب غور سے اس طرف دیکھنے لگی۔ پہلے تو وہ اسے اپنا دامہ سمجھی تھی لیکن وہ دامہ نہیں تھا۔ اس جھروکے میں واقعی کوئی کھڑا تھا اور وہ کوئی آدمی تھا۔

”سکندر بھائی ذرا گاڑی روکنا۔“ ٹایاب نے کہا۔ سکندر نے گاڑی روک لی اور ٹایاب گمری نظروں سے حویلی کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ٹایاب۔ کیا دیکھ رہی ہو۔“ سکندر نے سڑک پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سکندر بھائی۔ وہ آدمی آپ کو نظر آ رہا ہے۔ وہ جو حویلی کے جھروکے میں کھڑا ہے۔“

ٹایاب نے کہا۔

”کہاں؟“ مجھے تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ سکندر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ جھروکے میں۔ سفید لباس پہنے ہوئے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔ کیوں راجہ ہمیں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟“ سکندر نے راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں کوئی وہم ہو گیا ہے ٹایاب۔ وہاں واقعی کوئی نہیں ہے۔“ راجہ نے کہا۔

ٹایاب ایک بار پھر گمری نظروں سے حویلی کی طرف دیکھنے لگی۔ دوسری منزل کے جھروکے میں وہ سفید لباس والا انسانی ہیولہ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی

جاری تھی، ٹایاب میں بھی تہہ پٹی آئی جاری تھی۔ جیسے جیسے فاصلے ہوتا گیا اس کی بے چینی کم ہوتی گئی اور جب کوچ چند میل آگے دیر کا بل پار کر گئی تو ٹایاب بھی پر سکون ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔

”کیسی طبعیت ہے اب؟“ راہب نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”اب تو سر میں بھی درد نہیں ہو رہا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

”کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔“ راہب بولی۔ ”شکر ہے تمہاری طبیعت سنبھل گئی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی کہ اگر راستے میں تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو میں کیا کروں گی۔“

”اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ حمیس کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ”ٹایاب نے کہا اور پھر وہ چمک چمک کر ہاتس کرے لگی۔ بس کہ وہ مسافر جو کچھ دیر پہلے ٹایاب کے لئے پریشان ہو رہے تھے، اب اسے چپکے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

کوچ تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ ٹایاب کبھی راہب سے ہاتس کرے لگتی اور کبھی باہر دیکھنے لگتی۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھولنی پھولنی بشتیاں بھی تھیں۔ ٹایاب کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

راہب سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے ادھر رہی تھی۔ ٹایاب بھی رات بھر جاگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اوجھلنے لگی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب کوچ شاہ پور پہنچ گئی۔ بس سٹیشن پر کوچ سے اتر کر گھر پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ اور لگ گیا۔ ٹایاب کے والد ارشاد صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ گھر کی دیکھ بھال کے لئے ادویز عمر میاں بیوی ملازم رکھے ہوئے تھے۔ اکرم کیٹ میں جیسی داخل ہوئے دیکھ کر اس طرف لپکا اس نے ٹایاب کو جیسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی بیوی مضر بی بی آواز سن کر آگئی تھی۔

راہب بڑی حیرت سے اس کو کھنکی کو دیکھ رہی تھی۔ ہزار مربع مگر پر مشتمل یہ کونسی بڑی شاندار تھی۔ لگا تھا یہ کونسی اینٹوں سے نہیں مائل سے بنائی گئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر صرف مائل ہی نظر آ رہا تھا۔ پورچ کے سامنے ایک خوبصورت لان تھا۔ دیڑ سر سبز کھاس

پھر رخصت ہو گیا۔

جب وہ گاؤں سے رخصت ہو رہے تھے تو راہب نے محسوس کیا تھا کہ ٹایاب کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی اور جب حویلی کے سامنے اس نے سڑک پر گاڑی رکوائی تھی تو اس کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ بقتل اس کے اس نے حویلی کے چھوٹے میں کسی کو کھڑے دیکھا تھا۔ وہ شاید اس کا راہب تھا اور جب سکندر نے گاڑی آگے بڑھائی تھی تو اس کی بے چینی دو چند ہو گئی تھی۔

سکندر انہیں کوچ میں بٹھا کر چلا گیا تھا۔ ٹایاب اپنی سیٹ پر بیٹھی بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ وہ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتی اور کبھی کونکری سے باہر دیکھنے لگتی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھی بھی تھی لیکن پھر دوبارہ بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے کپٹیاں مسلتے لگی۔

”ٹایاب۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ہم بس سے اتر جائیں۔ کل یا ایک دو دن بعد پہلے جائیں گے۔“ راہب نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ حالانکہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آگ بھر رہی تھی اس کے اندر۔ داغ سنگ رہا تھا۔ سینے میں غبار سا پھیل چلا جا رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

بس میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی بار بار اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹایاب کو اس طرح بے چینی دیکھ کر راہب کا دل جا رہا تھا کہ وہ ٹایاب کو زبردستی بس سے اتار لے۔ سکندر ابھی قہقہے ہی میں کہیں ہو گا وہ اسے تلاش کر لے گی۔ اگر وہ نہ بھی ملا تو وہ کسی نائنگے پر بیٹھ کر گاؤں واپس چلی جائیں گی۔

راہب اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ کنڈیکٹر بھی دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے انجن شارت کر دیا اور کوچ حرکت میں آگئی۔

بوسں کا اڈا شکر کے وسط میں تھا۔ کوچ کو شکر سے نکلنے میں پانچ منٹ لگ گئے اور پھر وہ شاہ پور کی طرف جانے والی دلی دے پر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی کوچ کی رفتار تیز ہو گئی۔

راہب نے ایک اور بات خاص طور سے نوٹ کی۔ کوچ جیسے جیسے ٹوپر سے دور ہوتی

نایاب بھی اپنے کمرے میں آکر ہاتھ دھو میں کھس گئی۔ چھ سات گھنٹوں کے سفر نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ غصے سے پانی کے غسل سے اس کی کسندی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔ آگے گھٹنے بعد وہ باہر نکلی تو رابعہ بھی تیار ہو چکی تھی۔

”ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے؟“ نایاب نے صغریٰ سے پوچھا جو میز پر چائے کے برتن لگا رہی تھی۔

”تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔“ صغریٰ نے کہا۔ ”میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ آپ آگئی ہیں، وہ آگے گھٹنے تک آجائیں گے۔“

”ڈیڈی آج کل دفتر سے دیر سے آتے ہیں کیا؟“ نایاب نے پوچھا۔

”آپ کے بعد تو دیر سے ہی کمرے آئے لگے ہیں۔ دفتر سے چھٹی کر کے کسی دوست کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ اب آپ آگئی ہیں تو صاحب بھی جلدی گھر آجایا کریں گے۔“ اس نے چائے بنا کر ایک ایک کپ ان کے سامنے رکھ دیا۔

چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی تھے۔ نایاب نے ایک کیک چیس اٹھالیا اور پلیٹ رابعہ کی طرف سرکادی۔

”کھاؤ تا تم بھی۔ راستے میں تو کوئی ڈھنگ کی چیز ملی نہیں تھی۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ لو کھاؤ۔“

رابعہ نے بھی ایک کیک چیس اٹھالیا۔

چائے پینے کے بعد نایاب برآمدے میں آگئی۔ رابعہ بھی اسی کے ساتھ ہی تھی اور ٹھیک اسی لمحہ سفید رنگ کی شاندار کار کو غصے کی گیت میں داخل ہوئی اور پورچ میں آکر رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد ارشاد صاحب کار سے اترے۔ رابعہ انہیں دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ بڑی شاندار شخصیت تھی ان کی۔ نایاب دوڑ کر ان سے اپٹ گئی۔

”ارے بیٹا۔ تم تو وہاں جا کر مجھے بھول ہی گئی تھیں۔“ ارشاد صاحب اس کے سر پر پیار سے ہاتھ بھرتے ہوئے بولے۔

”میں آپ کو کیک لھو کو بھی نہیں بھولی تھی، ڈیڈی! بس وہاں کے حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے ضرورت سے زیادہ وہاں رکنا پڑا۔“ نایاب نے جواب دیا۔

”ہاں۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہاں کچھ پراسرار قسم کے واقعات پیش آرہے تھے۔ خیر۔ ان

کے قطعے کے چاروں طرف رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔

رابعہ اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فرش پر بیچے ہوئے دیوار قالین اور شاندار فرنیچر۔

”یہ تمہارا گھر ہے نایاب۔“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے سرچھپانے کو یہ جگہ دے رکھی ہے۔“

نایاب نے انکساری سے کام لینے ہوئے کہا۔

”نایاب! تمہیں اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے تو پھر لعلت بھیجو چودھری کی زمین پر۔“ رابعہ نے کہا۔

”نہیں رابعہ۔ میں اس پر لعلت نہیں بھیج سکتی۔“ نایاب بولی۔ ”گاؤں اور آس پاس کی بستیوں کے لوگ ان کے ظلم سے رہے۔ کسی نے ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ظلم بڑھتا ہی گیا۔ اگر شروع ہی میں کوئی ان کے سامنے ڈٹ جاتا تو آج یہ صورتحال نہ ہوتی۔ اب یہ لوگ میرا حق مارنا چاہتے ہیں۔ اگر میں خاموش رہی تو ان کے حوالے ہو دیں گے اور یہ روایت قائم ہو جائے گی۔ اس خاندان کی کوئی بو یا کوئی اور فرد اپنا حق نہیں مانگ سکے گا۔ میں نے ملے کر رکھا ہے کہ اپنا حق لیکر رہوں گی۔ گاؤں میں رہتے ہوئے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ ان چودھروں نے دھوکے اور دھونس دھمکیوں سے کچھ چھوٹے کسانوں کی زمینوں پر بھی قبضہ کر رکھا ہے۔ ان سے اپنا حصہ لیکر میں وہ زمینیں ان چھوٹے کسانوں میں تقسیم کر دوں گی۔ اچھا چھوڑو۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ آؤ۔۔۔ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو تو پھر باہر جائیں گے۔ بہت طلب ہو رہی ہے۔“

نایاب اسے ایک بیڈ روم میں لے آئی اور ایک الماری کھول کر بولی۔

”یہ میرے کپڑے ہیں۔ تمہیں پورے آجائیں گے۔ جو دل چاہے پہن لینا اور یہ دیکھو۔ یہ ہاتھ روم ہے۔ اب تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ ڈیڈی بھی آنے والے ہی ہوں گے۔“

نایاب باہر نکل گئی تو رابعہ نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور الماری میں سے ایک جوڑا نکال کر ہاتھ روم میں کھس گئی۔

”نادیدہ ہستیاں!“ ملک صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں؟“
 ”میں آپ کو بتاؤں گی۔ آئیے۔ اندر تو چلیں۔“ نایاب بولی۔

وہ اندر آکر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ نموداری ہی دیر بعد مغربی نے ارشاد صاحب کے سامنے چائے رکھ دی۔

”ہاں۔“ تو وہ نادیدہ ہستیاں کون ہیں اور تمہاری مدد کیسے کر رہی ہیں؟“ ارشاد صاحب نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو اب تک میں بھی نہیں سمجھ سکی کہ وہ کون ہیں اور میری مدد کیوں کر رہی ہیں۔“ نایاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”ہات ایک سنری سانپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس روز میں اور ملک صاحب کی چھوٹی بیٹی عذرا کیتوں میں مگھوم رہی تھیں کہ ایک سانپ اندر نکلے کر لڑتے ہوئے دیکھا۔ سانپ سنری رنگ کا تھا جسے نیلا بری طرح بچ رہا تھا۔ نمائے کیوں مجھے اس سانپ پر ترس آگیا۔ میں نے اسے بچانے کے لئے نکلے کو مار بھگایا۔ وہ سانپ زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے بلاخوش اسے ہاتھ میں اٹھالیا۔ وہ سانپ میرے بازوؤں سے لپٹ گیا اور بھر زین پر رینگتا ہوا کیت میں غائب ہو گیا۔“ نایاب چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر تفصیل سے گاؤں میں پیش آنے والے تمام واقعات بتاتے گئی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”چودھری سعادت کا خیال تھا کہ میں ان لوگوں سے ڈر کر گاؤں سے بھاگ جاؤں گی۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ پر حاکمانہ حملے کرائے۔ لیکن میں ہر مرتبہ بچتی رہی البتہ کچھ بے گناہ موت کے شکار ہوئے رہے۔ گاؤں کے معصوم اور مقولم لوگوں کی ہمدردیاں اور دغاغلیں میرے ساتھ ہیں۔ لیکن ایک بات میں نے واضح طور پر نوٹ کی ہے کہ نورپور کا تھانیدار کھل کر جانبداری سے کام لے رہا ہے۔ اگر وہ کوئی فرض شناس آفیسر ہوتا تو چودھری سعادت کو سلاخوں کے پیچھے بند کرچکا ہوتا۔ اب رابہر والا معاملہ ہی لیجئے۔ ملنگی نے اگرچہ میری موجودگی میں یہ بیان دیا تھا کہ یہ سارا منصوبہ چودھری سعادت نے بنایا تھا اور تھانیدار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ قانون کے مطابق کارروائی کرے گا۔ لیکن آج صبح تک تو خاموشی ہی تھی مجھے امید نہیں کہ وہ ”اسپیئر“ سعادت کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔“

”اس سلسلے میں تو میں اس علاقے کے ڈی سی سے فون پر بات کرلوں گا لیکن یہ نادیدہ

کی تفصیل تو بعد میں سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ ملک صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ ارشاد صاحب نے پوچھا۔

”پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ میں نے تو کہا تھا کہ چند روز کے لئے وہ بھی شہر آجائیں مگر وہ نہیں ائے۔“ نایاب نے کہا۔

”ہاں بیٹا۔ یہ ذمیدار لوگ اپنی ذمیتوں کی منی سے مشکل ہی سے الگ ہوتے ہیں۔ اور ہاں۔ یہ کون لڑی ہے۔ یہ ملک صاحب کی بیٹی تو نہیں ہو سکتی۔ انہیں تو میں پہچانتا ہوں۔“

ارشاد صاحب رابہر کی طرف دیکھنے لگے۔

”یہ رابہر ہے۔ اسے آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔“ نایاب نے رابہر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ گاؤں کے ایک معتبر شخص چاچا لوب دین کی بیٹی ہے۔ چند روز پہلے انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔“

”اوہ۔“ ارشاد صاحب بولے۔ ”مجھے بہت الموس ہوا بیٹی۔ کسی سے دشمنی تھی کیا؟“
 ”ان لوگوں کو مجھ سے ہمدردی کا خیالہ بھگتا پڑا ہے ڈیڑی!“ نایاب نے کہا۔ ”ان کے گھر کو جلا کر رکھ کر دیا گیا۔ چاچا لوب دین کو قتل کر دیا۔ اس کا بھائی زخمی ہوا اور اسے بھی اغوا کر لیا گیا۔ یہ بیٹی کمائی ہے ڈیڑی۔ آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔ یہ چودھری لوگ تو بہت ہی گھٹیا ثابت ہوئے۔ مجھ سے دشمنی کا بدلہ دوسرے بے گناہوں اور معصوم لوگوں سے لے رہے ہیں۔ ان لوگوں کو تو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کیا جانا چاہئے۔“

”مجھے پتہ چلا تھا۔“ ارشاد صاحب بولے۔ ”بلکہ گاؤں کا ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری سعادت تم سے دشمنی میں مد سے آگے بڑھ رہا ہے۔ میں تمہیں واپس بلا لوں گا کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ میں تو پریشان ہو رہا تھا اور سوچا تھا کہ اگر تم ایک دو دن تک نہ آئیں تو دیک اینڈ پر میں خود گاؤں چلا جاؤں گا۔“
 ”چودھری سعادت نے میرے خلاف کیا تو بہت کچھ مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ نایاب نے کہا۔ ”گاؤں کے بیشتر لوگ میرے ساتھ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نادیدہ ہستیاں بھی میری مدد کر رہی ہیں۔“

ان جگہ گاتے ہوئے ہیروں کو دیکھ کر ارشاد صاحب کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک ابھر آئی۔

”یہ --- یہ تو بہت قیمتی ہیرے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ٹایاب نے مسکرا کر راجہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے ان ہیروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”وہ سنہری ناگ مجھے نیلے والے کھنڈروں میں ایک ایسی جگہ لے گیا تھا جہاں ایک بت بڑا خزانہ موجود تھا۔ وہ خزانہ اتنا بڑا ہے کہ میں اس شرکی ساری بڑی عمارتیں خرید سکتی ہوں۔ یہ چند ہیرے میں نے اسی خزانے سے اٹھائے تھے۔ اس خزانے کے بارے میں میں جانتی ہوں یا سکندر بھائی۔ البتہ ملک انکل کو بھی ہم نے سرسری طور پر بتا دیا تھا۔ ہمارے علاوہ اور کوئی اس خزانے کے بارے میں نہیں جانتا۔“

راجہ اور ارشاد صاحب بھی پہلی سی نظروں سے ٹایاب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا واقعی، تم سچ کہہ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے، کیا حقیقت میں اس خزانے کا کوئی وجود ہے؟“ ارشاد صاحب بولے۔ ان کے لیے میں بے پناہ حیرت تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں ڈیڑی۔“ ٹایاب مسکرائی۔ ”یہ چند ہیرے اس خزانے کا ایک حصہ ہیں۔“

”اگر یہ واقعی سچ ہے تو تم اس شرکی چند بلڈنگیں تو کیا پورا شر خرید سکتی ہو۔ صرف یہ ایک ہیرا۔“ وہ اپنی ہتھیلی پر سے ایک ہیرا اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”صرف یہ ایک ہیرا کم سے کم دو لاکھ روپے سے کم کا نہیں ہوگا۔ اس طرح کے سکتے ہیرے ہیں وہاں؟“

”تعداد کا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن تین چار بوریاں بھری جاسکتی ہیں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

”تین چار بوریاں۔“ ارشاد صاحب کا منہ مارے حیرت کے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”ان ہیروں کے علاوہ وہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”سوئے کے برتن، زیورات، نوادرات اور بہت کچھ۔ اس خزانے میں ایک خوبصورت تاج بھی ہے جس میں اس قسم کے کئی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر اس ایک ہیرے کی قیمت دو لاکھ ہو سکتی ہے تو پھر اس تاج کی قیمت آٹھ دس کروڑ روپے سے کم نہیں ہوگی۔“

”ہائی گاؤ!“ ارشاد صاحب نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ”میری ایک بات غور

ہستیں کے بارے میں تم جو کچھ بھی بتا رہی ہو، وہ میرے لئے ناقابل یقین اور حیرت انگیز ہے۔“ ارشاد صاحب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”یہ سچ ہے انکل۔“ راجہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ“

پراسرار اور نازیدہ ہتھیاں ٹایاب کی پشت پر نہ ہو جس تو شاید چودھری اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا ہے۔“

”یہ سب کچھ میرے لئے حیرت انگیز ہے۔“ ارشاد صاحب بڑبڑائے۔

”گاؤں کے سب لوگ ان پر اسرار واقعات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ راجہ بولی۔ ”ابھی پر اسرار واقعات کو بنیاد بنا کر چودھری سعادت نے ٹایاب کو بدنام کرنے کی ایک مہم بھی چلائی تھی۔ کبھی کہا گیا ہے ناگن ہے اور کبھی یہ افواہ پھیلائی گئی کہ کوئی بدروح ہے لیکن گاؤں کے لوگ ان کی باتوں میں نہیں آتے۔ سب ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ ٹایاب نہ تو کوئی ناگن ہے اور نہ بدروح۔ وہ ان سب کی طرح جتنی چاہتی انسان ہے۔ بات صرف اتنی ہے انکل کہ ٹایاب کے دل میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس کی نیت میں فتنہ نہیں ہے۔ یہ ایک نیک طبیعت لڑکی ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے بھدروی کا مادہ کوٹ کر کبھرا ہوا ہے۔ سانپ بھی زہریلی چیز ہے کوئی بھی ذی ہوش انسان بھدروی کا اظہار نہیں کر سکتا لیکن ٹایاب نے نہ صرف اس سانپ کو نیوٹے سے بچایا بلکہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے ہاتھ میں اٹھالیا اور اس کے زخم سسلانے لگی۔ انسان تو احسان فراموش اور محسن کش ہو سکتا ہے مگر وہ زہریلا ناگ ایسا نہیں تھا۔ اس نے ٹایاب کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور یہ ثابت بھی ہو گیا ہے کہ اس نے ہر موقع پر ٹایاب کی حفاظت کی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ پر اسرار بوڑھا بھی اس ناگ ہی کا کوئی روپ ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“

”اس کے علاوہ۔“ ٹایاب اس کے خاموش ہونے پر بولی۔ ”اس زہریلے ناگ نے میری بھدروی کا ایک ایسا انعام بھی دیا ہے جس کا میں یا کوئی اور تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”اور وہ انعام کیا ہے؟“ ارشاد صاحب نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک منٹ، ابھی دکھاتی ہوں۔“ اور پریف کیس میں سے وہ ہیرے نکال لائی۔ ”یہ دیکھئے۔“ اس نے ہیرے ارشاد صاحب کے ہاتھ میں دے دیئے۔

ہے۔“

”یہ اسرار و رموز میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی ڈیڈی۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”لیکن ڈیڈی۔ جھپٹے دنوں گاؤں میں جو پراسرار واقعات پیش آئے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ مثال کے طور پر میں نے حاجرہ بائی ایک لڑکی کی لاش دیکھی تھی جس کے سینے میں خنجر بوس تھا۔ لگتا تھا اسے چند منٹ پہلے ہی قتل کیا گیا ہو۔ اس وقت میرے کالوں میں کچھ پراسرار سی سرگوشیاں سنائی دی تھیں جن سے مجھے اس لڑکی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ گاؤں کے موہی کی بیٹی ہے۔ میں بعد میں سکندر بھائی کو لیکر حویلی میں آئی تو لاش غائب تھی۔ لیکن اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ حاجرہ واقعی گاؤں کے موہی کی بیٹی تھی اور اسے اسی حویلی میں قتل کیا گیا تھا۔ لیکن یہ ساٹھ ستر سال پہلے کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو باہر ناقابل یقین اور پراسرار لگتی ہیں لیکن ان کا کسی نہ کسی حقیقت سے کوئی تعلق ضرور ہے۔

تاہم شیتا نے مجھے یہ خزانہ سترے ناگ کو بچانے کے عوض انعام کے طور پر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر میرے علاوہ کسی اور نے اس خزانے پر قبضہ بھانے کی کوشش کی تو یہ خزانہ یا تو غائب ہو جائے گا اور یا راگ کا ڈھیر بن جائے گا۔ ڈیڈی! وہ چاند لے خاموش ہو کر باپ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں آپ ایک فرض شناس آفسیر ہیں ڈیڈی۔ آپ پہلے اس ملک کے مفاد کا سوچتے ہیں پھر اپنے بارے میں۔ میں بھی آپ ہی کی بیٹی ہوں ڈیڈی۔ میری رگوں میں بھی آپ کا ہی خون دوڑ رہا ہے۔ یہ خزانہ پا کر میرے دل میں کسی بددلتی کا خیال نہیں آیا۔ میرا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ اگر یہ خزانہ مجھے عام حالات میں ملا نہ ہوتا تو میں آپ کے کہنے سے پہلے اسے حکومت کے حوالے کر دیتی۔ لیکن یہ خزانہ جن حالات میں مجھے ملا ہے وہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ اس کے ساتھ جو خرمیں وابستہ کی گئی ہیں اگر وہ پوری نہ کی گئیں تو یہ ضائع ہو جائے گا اور ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

میں نے سکندر بھائی سے بات کی ہے۔ ہم اس خزانے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ غریبوں اور عام لوگوں کی بھلائی کیلئے کئی قلمی منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچائے جاسکتے ہیں۔ لیکن۔۔۔ اگر یہ خزانہ کسی کی مداخلت سے ضائع ہو گیا تو میں نے جو سوچا ہے وہ سب

سے سنو بیٹی! یہ کوئی گمشدہ خزانہ ہے جو اتفاق سے حمیس مل گیا ہے۔ ہمارے ملک کا دنیا کے ہر ملک کا قانون یہ ہے کہ اگر زمین سے کوئی قیمتی چیز، مثلاً ”سونا“ چاندی، تیل، گج، یا اسی قسم کی کوئی چیز برآمد ہوتی ہے تو وہ حکومت کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ بھی ا زمرے میں آتے ہیں۔ اس لئے قانونی طور پر یہ دیندہ بھی حکومت کی ملکیت ہے۔ اس۔ حمیس میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ خزانہ حکومت کے حوالے کر دو۔ حکومت حمیس جو حد و گی وہ بھی کر دے گا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈیڈی۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن مسئلہ ہے کہ میرے علاوہ اور کوئی بھی اس خزانے کو استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے اس خزانے کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو وہ راگ کا ڈھیر بن جائے گا اور دیے بھی کوئی اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اس کی حفاظت شیتا نامی ایک ایسی ناگن کر رہی ہے صدیوں پہلے شاید مرہٹی تھی اور سترہ سانپ بنے میں سے نیولے سے بچایا تھا اسی کی ن سے ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ ارشاد صاحب نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ”وہ ناگن اگر صدیوں پہلے مر چکی ہے تو اب اس خزانے کی حفاظت کیسے کر سکتی ہے۔“ ”یہ تو وہ باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آسکتیں اور شاید کسی اور کی سمجھ میں نہ آسکیں۔“ نایاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”صدیوں پہلے وہ علاقہ ایک ایسی ریاست میں شامل تھا جس پر رانی شپا نامی ایک عورت کی حکمرانی تھی۔ حیا ہونے کے علاوہ رانی شپا نے جد بھدر اور نیک عورت تھی۔ حکمران نیک نیت ہوں عوام بھی خوشحال ہوتے ہیں۔ رانی شپا کی ریاست میں امن و آسوش تھی، خوشحالی تھی، رانی شپا سے ایک غلطی ہوگئی اور وہ غلطی ہی نہ صرف رانی شپا کو بلکہ پوری ریاست لے ڈوبی۔ لوگوں نے رانی شپا کو زندہ جلا دیا اور ریاست تباہ ہوگئی۔ وہ خزانہ اسی رانی کی ملکیت تھا۔ شیتا نامی ناگن اس کی محافظ ہے۔ شیتا کا کہنا ہے کہ رانی شپا واپس آ گی۔ اسے رانی شپا کا انتظار ہے۔“

”عجیب عقائد باتیں ہیں۔“ ارشاد صاحب بولے۔ ”کوئی انسان مرنے کے بعد اس میں واپس نہیں آتا اور پھر وہ ناگن جو صدیوں پہلے مر چکی تھی وہ تم سے باتیں کیسے کرے

سے ٹار کو شناخت کر لیا گیا۔

”گھڑی کی پست پر ٹار کا نام کندہ ہے۔ ارشاد صاحب نے بتایا۔ ”پولیس کو شبہ ہے کہ کوئی کو آگ لگانے سے پہلے ان لوگوں کے ٹار کو گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ غالباً اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ چند روز اسے اپنی حراست میں رکھا اور پھر قتل کر کے لاش نمر میں پھینک دی۔ لاش تین چار روز پرانی تھی۔ جسم کا گوشت گل سڑ گیا تھا۔ چہرہ تو بالکل شناخت کے قابل نہیں رہا تھا۔“

”اس کے علاوہ کچھ اور؟“ ٹایاب نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ ارشاد صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”پولیس ابھی تک کسی کا سراغ نہیں لگا سکی۔ کل تیس انٹورنس والوں سے بھی ملنا تھا۔“

”وہ کیا کہتے ہیں؟“ ٹایاب نے پوچھا۔
 ”جب تک پولیس اپنی تفتیش مکمل نہیں کر لیتی، انٹورنس والے کلیم کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ ارشاد صاحب نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ڈیڑی۔“ ٹایاب بولی۔ ”کل میں خود پولیس کے تفتیشی آفیسر اور انٹورنس کمپنی والوں سے ملوں گی۔“ اس نے بات کرتے ہوئے رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی جمائیاں لے رہی تھی۔ ”تمہیں نیند آ رہی ہے رابعہ! سو جاؤ جاکر۔“
 رابعہ کو واقعی نیند آ رہی تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ گزشتہ رات جاگنے اور دن بھر کے سفر نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ٹایاب دیر تک اپنے ڈیڑی سے باتیں کرتی رہی اور تقریباً ”ذیرھ بجے کے قریب وہ دونوں اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔“

شدید تھکن ہونے کے باوجود ٹایاب کو دیر تک نیند نہیں آ سکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی کر دیکھیں بدلتی رہی اور بالاخر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو ارشاد صاحب دفتر جا چکے تھے۔ رابعہ ابھی تک سو رہی تھی۔ ٹایاب نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔ اس نے رابعہ کو بھی جگایا اور اپنے کمرے میں آکر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

دھڑے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس لئے ڈیڑی پلیرا میری باتوں پر ذرا محضے دل سے سوچنے اور خزانے کے راز کو اپنے سینے تک ہی محدود رکھئے۔ پلیر ڈیڑی۔“
 ”ٹھیک ہے بیٹی۔“ ارشاد صاحب نے کمر سانس لیے ہوئے کہا۔ ”لیکن ان ہیروں کو کیسے ڈیڈز آف کرو گی؟“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے ڈیڑی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”میں دو چار روز میں خود ہی ان کا بندوبست کر لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔“

ان کے قریب بیٹھی ہوئی رابعہ بڑی حیرت سے باپ بیٹی کی باتیں سن رہی تھی۔ ٹایاب کئی روز گاؤں میں رہی تھی اور اس کے حوالے سے کئی پر اسرار واقعات ردنا ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ لیکن ان سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ خزانہ تھا جس کا ذکر اس وقت اس نے پہلی مرتبہ سنا تھا اور وہ جانتی تھی کہ خزانے کے بارے میں بھی ٹایاب جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس کے پاس ثبوت کے طور پر وہ ہیرے موجود تھے جو اس وقت سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔

وہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ملازمہ صفائی نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ وہ تینوں چونک گئے۔ ان میں سے کسی کو بھی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ٹایاب نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔
 ”چلو بھئی۔ کھانا لگ گیا ہے۔ باتیں بعد میں ہوئی رہیں گی۔“ ارشاد صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ٹایاب اور رابعہ بھی اٹھ گئیں اور پھر وہ تینوں میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔
 ”تمہارے پنگلے میں آفتنی کے سلسلے میں ایک پیش رفت ضرور ہوئی ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ وہ تینوں کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی کی چٹکیاں لیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ”دو روز پہلے پولیس کو نارتھ کینال کے پل کے قریب کنارے کی جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ لاش گل سڑ چکی ہے۔ اس کی شناخت ممکن نہیں رہی تھی لیکن بائیں گلاں میں پھنسی ہوئی گھڑی کی وجہ سے پولیس نے اسے ٹار کی حیثیت سے شناخت کیا ہے۔“

”او۔“ ٹایاب بولی۔ ”پولیس یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ وہ گھڑی ٹار ہی کی تھی۔ جس

آڑی کو خمی کی دیکھ بھال کیلئے رکھا ہوا تھا جس کے بارے میں پولیس کا خیال ہے کہ اسے قتل کر کے لاش نمیں پھینک دی گئی تھی۔" ٹایاب نے بتایا اور کار کا انجن بند کر کے نیچے اتر آئی۔

رابرہ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک جملے ہوئے لمبے کا جائزہ لیتی رہیں پھر ٹایاب ساتھ والی کو خمی کے گیٹ پر آگئی۔ آگ سے اس کو خمی کا بھی کچھ حصہ متاثر ہوا تھا۔ کو خمی کے گیٹ کے سامنے سٹول پر بیٹھا ہوا چکیدار شروع ہی سے کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ٹایاب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹایاب کو سلام کیا۔

"نہرن بانی گھر پر ہیں یا نہیں؟" ٹایاب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔
"جی بیکم صاحبہ گھر پر ہیں۔ آپ آئیے۔ میں بتاتا ہوں انہیں۔" چکیدار نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ گیٹ میں داخل ہو گئیں۔ برآمدے کی طرف چلتے ہوئے چکیدار ٹایاب سے کو خمی کی آتشزدگی پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ لوگ برآمدے میں پہنچے ہی تھے کہ جالی والا دروازہ کھلا اور نہرن باہر آگئی۔ ٹایاب کو دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"ارے ٹایاب۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔" وہ ٹایاب سے لپٹ گئی۔ "تم نے اپنی کو خمی دیکھی۔"

"ہاں نہرن بانی۔" ٹایاب نے گہرا سانس لینے ہوئے جواب دیا۔ نہرن اس سے تقریباً دس سال بڑی تھی۔ ٹایاب جب یہاں رہائش پذیر تھی تو اس کا زیادہ آنا جانا اسی کے ہاں تھا اور وہ اسے بچی کہا کرتی تھی۔

"کچھ بچہ چلا آگ کس نے لگائی تھی۔" نہرن بولی۔ "آؤ۔۔۔ اندر آؤ تا تم لوگ۔۔۔"

وہ نہرن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ نہرن نے ملازمہ کو چائے کیلئے کہہ دیا تھا۔

"پولیس ابھی تک کچھ معلوم نہیں کر سکی۔ البتہ وہ دون پہلے میرے ثار کی لاش ملی ہے

میاہہ بجے وہ ناشتہ کر رہی تھیں۔

"اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" ٹایاب ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "ایک دو کام ہیں وہ آج ہی منمائے جائیں۔"

ارشاد صاحب گاڑی چھوڑ گئے تھے۔ بارہ بجے کے قریب ٹایاب اور رابرہ گاڑی میں سوار کو خمی سے باہر نکل رہی تھیں۔

"یہ گاڑی بھی تمہاری ہے؟" رابرہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ گاڑی میرے شوہر نے خرید کر دی تھی۔ اب میں اس کی نشانی رہ گئی ہے۔" ٹایاب نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی شہر کے مختلف علاقوں سے گھومتی ہوئی اس علاقے میں آگئی جسے شہر کا سب سے پوش علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ریسیوں اور دولت مندوں کی رہائش تھی۔ بڑی بڑی عایشان کوٹھیاں دیکھ کر رابرہ حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔

ٹایاب نے کار ایک اور سڑک پر موڑ دی۔ بہت چوڑی سڑک تھی۔ کناروں پر پندرہ پندرہ فٹ چوڑی گرین بنٹس تھیں۔ دیہر سرسبز گھاس کے علاوہ گرین جھلٹ پر پھولوں کے پودے بھی تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرو کے پودے بھی۔ ان گرین بنٹس کے بعد کشادہ سروس روڈز تھیں اور ان کے ساتھ پنگلے۔ بنگلوں کے سامنے بھی چھوٹے چھوٹے خوبصورت لان بنے ہوئے تھے۔ ٹایاب گاڑی کو گھما کر دائیں طرف والے سروس روڈ پر لے آئی اور پھر ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ بہت بڑا پلاٹ تھا جس پر بنی ہوئی کو خمی جل چکی تھی۔ چند دیواروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس جملے ہوئے ٹکڑر کو دیکھ کر رابرہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کو خمی بھی آس پاس کی دوسری کوٹھیوں کی طرح بہت شاندار رہی ہوگی۔

"یہاں کیوں رک گئیں۔ یہ کس کی کو خمی ہے؟" رابرہ نے پوچھا۔

"یہ وہ کو خمی ہے جو میرے شوہر نے انتقال سے پہلے میرے نام ٹرانسفر کر دی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس پر بھی میرا حق تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن عدالت نے اس کار اور کو خمی پر میرا حق تسلیم کر لیا۔ میرے سرال والوں کو یہ بھی باگوار گزرا اور اس کو خمی کو جلا کر رکھ کر ڈالا۔ گزشتہ رات میں ڈیڑی سے اسی کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ ایک

جسے قتل کر کے لاش نہریں پیچیک دی گئی تھی۔" ٹایاب نے کہا۔

"ہائے اللہ! پیچارہ۔" نسرین متاسفانہ انداز میں ہاتھ لگے گی۔

"بست اچھا لڑکا تھا۔ پیچارہ۔ شام کو انٹر گیسٹ کے سامنے بیٹھا ہمارے چوکیدار سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میں تو کبھی کبھی اسے بازار بھیج کر سودا بھی منگوا لیا کرتی تھی۔ لیکن اس سے کسی کو کیا دشمنی تھی۔ وہ تو بہت شریف لڑکا تھا۔"

"ان لوگوں کا اصل مقصد تو مجھے نقصان پہنچانا تھا۔ ثار بھی اس کی پیٹ میں آگیا۔" ٹایاب نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ثار نے انہیں دیکھ لیا ہو اور ان میں سے کسی کو پہچان لیا ہو۔ اس لئے وہ کوٹھی کو آگ لگا کر اسے بھی اٹھا لے گئے اور بعد میں قتل کر کے لاش نہریں پیچیک دی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "میں تو دراصل یہ پوچھنے آئی تھی کہ اگر آپ لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ معلوم ہو تو۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کے چوکیدار نے شاید کسی کو دیکھا ہو۔"

"پولیس نے لالہ کا بیان لیا تھا۔" نسرین نے جواب دیا۔ "اس نے پولیس کو کسی آدمی کا حلیہ بھی بتایا تھا۔ اب پتہ نہیں پولیس نے اس سلسلے میں کچھ کیا یا نہیں۔ میں لالہ کو بلاتی ہوں۔ اسی سے پوچھ لیتا۔"

اسی دوران ملازمہ چائے نکھر آگئی۔ نسرین نے اس سے کہہ کر لالہ کو بلوایا۔

"لالہ کچھ یاد ہے اس رات کیا ہوا تھا؟" ٹایاب نے پوچھا۔

"رات کے دو بجے تھی! میں گیسٹ کے اندر کی طرف بیٹھا ادھم لالہ نے جتنا شروع کیا۔ "کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر میں اٹھ گیا تھا۔ ویسے تو گاڑیوں کی آمدورفت رات بھر جاری رہتی ہے لیکن اس وقت تجانے میرے دل میں کیا خیال آیا۔ میں نے جھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سفید رنگ کی وہ کار آپ کی کوٹھی کے گیسٹ سے ذرا پیچھے رکی تھی۔ اسی وقت میں نے ایک آدمی کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آدمی کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے اندر آگیا۔ اس کے تقریباً "آدھے گھنٹے بعد ایک چچ اور فائز کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے باہر نکلتا پایا تھا مگر اسی وقت وہ تین فائز اور دو تین اور پھر اچانک ہی آپ کی کوٹھی میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آگ لگانے سے پہلے پڑول چڑکا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے پڑول کی بو محسوس کی تھی۔" لالہ چند لمحوں کو

خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "پانچ چھ منٹ تک فائزنگ ہوتی رہی۔ وہ جو کوئی بھی تھے ہوائی فائزنگ کر رہے تھے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ کوئی گھر سے باہر نہ نکلے۔ اس کے بعد کار سٹاٹ ہونے کی آواز سنائی دی کار کے جانے کے بعد میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور شور مچا دیا۔ شور کی آواز سن کر لوگ گھروں سے باہر آگئے تھے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی اٹھ گئے تھے۔ کوٹھی میں آگ ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔ غالباً اندر اور باہر پڑول اچھی طرح چڑکا گیا تھا۔ آگ کے شعلے ساتھ دلی کوڑیوں تک پہنچ رہے تھے۔ سب نے فائز بریگیڈ کو فون کر دیا۔ فائز بریگیڈ کی گاڑیاں تقریباً "ذیہ گھنٹے بعد پہنچی تھیں۔ اس وقت تک کوٹھی پوری طرح آگ کی لیٹ میں آچکی تھی۔ آگ پر قابو پانے میں دو گھنٹے لگے تھے لیکن اس وقت تک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اگر آگ پر قابو نہ پایا جاتا تو ساتھ دلی دونوں کوٹھیاں بھی جل کر راکھ ہو جاتیں۔"

"تم نے پولیس کو اس آدمی کا حلیہ بتایا تھا جسے تم نے کار سے اترتے ہوئے دیکھا تھا؟" ٹایاب نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"جی ہاں بی بی! لالہ نے جواب دیا۔ "پولیس نے وہ حلیہ لکھ بھی لیا تھا۔

"وہ آدمی کیسا تھا۔" ٹایاب نے پوچھا۔

"لبا سا قد تھا جی اور بال پٹوں کی طرح تھے۔" لالہ نے کہا اور پھر پورا حلیہ بتانے لگا۔

لالہ اس آدمی کا حلیہ بتا رہا تھا اور ٹایاب کی آنکھوں میں چمک سی ابھرتی آ رہی تھی۔ اس نے رابطہ کی طرف دیکھا۔ جلیہ سن کر اس کی آنکھوں میں بھی چمک ابھرتی تھی۔

"وہی ہے۔" رابطہ بولی۔ "اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"کون۔۔۔؟ کیا تم جانتی ہو اسے؟" نسرین نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں نسرین ہائی۔" ٹایاب بولی۔ "اگر پولیس اس آدمی کو یہاں تلاش کر رہی ہے تو وہ یقیناً "میں ملا ہو گا اور وہ یہاں ملے گا بھی نہیں۔"

"کیا مطلب۔" میں سمجھی نہیں۔" نسرین نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ آدمی اس شہر میں نہیں ہے۔" ٹایاب بولی۔ "مہر حال" ہمیں اب پولیس سے رابطہ

”نور پور میں!“ سب انسپکٹر کے لیے میں حیرت تھی۔ ”کیا آپ اسے جانتی ہیں؟“
 ”جی ہاں۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ملٹی ٹائیپ میرے جیسے چودھری سعادت کا
 کارندہ ہے یا یوں کہئے کہ اس کا پروردہ بدعاش ہے جس سے اس قسم کے کام لئے جاتے
 ہیں۔ گاؤں میں بھی وہ ایسے سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہے جس پر وہ روز پتلے پولیس نے
 اسے حرات میں لے لیا ہے۔ جن دونوں میری کوٹھی کو آگ لگائی تھی ان دونوں میں گاؤں میں
 تھی اور مجھے یقین ہے کہ میری کوٹھی کو آگ لگانے کیلئے ملٹی ٹائیپ اس شخص کو خاص طور
 پر یہاں لایا گیا ہوگا۔ اپنا کام کرنے کے بعد وہ گاؤں واپس چلا گیا۔ اس لئے پولیس شرمیں
 اسے تلاش نہیں کر سکی۔ اس کیلئے آپ کو نور پور پولیس سے رابطہ کرنا ہوگا۔“
 ”میں ایچ او صاحب آتے ہیں تو ان سے بات کرتا ہوں۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔
 ”بہر حال“ آپ کا بہت بہت شہر ہے۔ آپ لوگ تعاون کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ جرائم پیشہ
 قانون کی گرفت میں نہ آسکیں۔“
 ”عوام تو تعاون کرتے ہیں۔ کارکردگی تو آپ کو دکھائی ہے۔“ ٹایاب کہتے ہوئے اٹھ
 گئی۔

تھانے سے نکل کر وہ گاڑی کو شہر کی سڑکوں پر دوڑاتی ہوئی ایک اور پوش علاقے میں
 آگئی۔ یہاں بھی بڑی بڑی اور عالشان کوٹھیاں تھیں۔ ٹایاب نے ایک جگہ گاڑی روک لی
 اور سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”وہ کوٹھی دیکھ رہی ہو۔ غلطی کی والی۔“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے رابہر سے کہا۔
 ”یہ کوٹھی بھی چودھری کی ہے۔ سعادت نے گاؤں میں یہ کہہ رکھا ہے وہ شہر گیا ہوا ہے۔
 اب معلوم یہ کرنا ہے کہ وہ شہر آیا بھی ہے یا نہیں۔“
 ”یہ کیسے معلوم ہوگا؟“ رابہر نے پوچھا۔

”کوٹھی کے کسی ملازم سے۔“ ٹایاب نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ ایک مختصر سا چکر
 کٹ کر وہ سڑک کے دوسری طرف پہنچی اور کار کو اس کوٹھی کے سامنے روک دیا اور انجن
 بند کرتے ہوئے بولی۔ ”تم گاڑی میں بیٹھ رہو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“
 ٹایاب کار سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔ گیٹ بند تھا۔ اس نے کال
 تھل کاٹن دیا دیا۔ ذیلی دروازہ کھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ دروازہ کھولنے

کرنا ہوگا۔ اب میں چلتی ہوں نرسن بائی۔ پھر آؤں گی۔“
 وہ دونوں اٹھ گئیں۔ نرسن انہیں رخصت کرنے گیٹ تک آئی تھی۔
 نرسن کے ہاں سے رخصت ہو کر ٹایاب سیدھا پولیس سٹیشن پہنچی تھی۔ تھانہ انچارج
 تو اس وقت موجود نہیں تھا البتہ وہ سب انسپکٹر موجود تھے اس کیس کا تعقیبی آفیسر مقرر
 کیا گیا تھا۔ ٹایاب نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور اس کیس کے بارے میں دریافت
 کرنے لگی۔
 ”ماہرین کے معائنے کے بعد اور لوگوں کے بیانات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آگ
 اتفاقاً طور پر نہیں لگی تھی بلکہ چٹول چھڑک کر لگائی گئی تھی۔“ سب انسپکٹر بتا رہا تھا۔ ”وہ
 لوگ دیر تک فائرنگ کرتے رہے تھے تاکہ پڑوسیوں میں سے کوئی گھر سے باہر نہ نکل سکے۔
 پہلے ہمارا شبہ تھا کہ آپ کا ملازم بھی اس میں شریک ہے لیکن تین دن پہلے میرے اس کی
 لاش ملی ہے جس سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ اس نے ملتان میں سے کسی کو پھانچ لیا تھا اور
 وہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ بعد میں اسے قتل کر کے لاش نہیں پھینک دی گئی۔ کیس
 نے اب نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں قتل بھی شامل ہو گیا ہے۔“

”ہمارے پڑوس والی کوٹھی میں رہنے والے ڈاکٹر عبدالہاب کے چوکیدار نے ایک
 آدمی کو دیکھ لیا تھا اور اس نے آپ کو اس شخص کا حلیہ بھی بتایا تھا اس سلسلے میں۔۔۔۔۔“
 ”جی ہاں۔“ سب انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس شخص کی تلاش جاری ہے۔
 چند مشتبہ لوگوں کو حراست میں بھی لیا گیا تھا۔ لالہ کو کچھ ملتان کی تصویر بھی دکھائی گئی
 تھیں لیکن وہ ان میں نہیں ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے۔“
 ”وہ شخص آپ کو اس شہر میں نہیں ملے گا۔“ ٹایاب نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ سب انسپکٹر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”لالہ نے مجھے اس آدمی کو جو حلیہ بتایا ہے میں اسے پہچان گئی ہوں۔“ ٹایاب نے
 جواب دیا۔ ”اس کا نام ملٹی ہے اور وہ قتل، اغوا، ڈکیتی اور آتشزدگی کی دیگر وارداتوں میں
 بھی ملوث ہے اور اسی وقت نور پور پولیس کی تحویل میں ہے۔ آپ چاہیں تو نور پور پولیس
 سے رابطہ کر کے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ شناخت کیلئے اس کی تصویر منگوا لیں یا اسے
 یہاں لے آئیں۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ اس کیلئے آپ کونسا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔“

کنڈیشنڈ ریٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

”یہ کوئی جگہ ہے ٹایاب۔ تم مجھے کہاں لے آئی ہو۔“ رابعہ حیرت سے اوجھڑا دھڑکے رہی تھی۔ مناسب فاصلوں پر میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ چند میزوں پر کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

”یہ ریٹورنٹ ہے۔ ہم یہاں کھانا کھائیں گے۔ تین بج رہے ہیں اور بھوک لگ رہی ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔

ان کے اندر داخل ہوتے ہی سفید ڈریس میں بیوس ایک اوجھڑا عمر ویران کے قریب آگیا۔ اس نے ٹایاب کو سلام کیا اور رہنمائی کرتا ہوا ایک میز پر لے گیا۔ ٹایاب اس ریٹورنٹ میں اکثر آتی رہتی تھی۔ سیفر اور شاف اسے پہچانتا تھا۔ ان کے بیٹھے کے بعد ویرنر نے میو کی ایک ایک کاپی ان کے سامنے رکھ دی۔

”یہ کتاب ہمیں کیوں دے رہا ہے۔ کچھ پڑھنا پڑے گا ہمیں۔“ رابعہ بولی۔
 ”یہ میو ہے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کھانوں کی فرسٹ۔ کیا کھاؤ گی تم۔۔۔؟“

”مکئی کی روٹی اور ساگ مل جائے گا یہاں۔“ رابعہ بولی۔
 ”یہ چیزیں صرف گاؤں میں ملتی ہیں۔ اچھا میں منگواتی ہوں تمہارے لئے بھی۔“ ٹایاب میو دیکھنے لگی۔ اس نے ویرنر کو ایسے کھانے نوٹ کروا دیئے جو رابعہ بھی بے تکلفی سے کھا سکے۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کی میز پر کھانا سرد کیا گیا۔ رابعہ کھانا کھاتے ہوئے جھجک سی رہی تھی۔ میزکری پر بیٹھ کر کھانا اس کیلئے عجوبہ نہیں تھا لیکن اس طرح کسی ہوٹل میں آنا اس کیلئے واقعی عجوبہ تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عورتیں بھی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھا سکی ہیں۔

”طمینان اور بے تکلفی سے کھاؤ۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر جھجک اور تکلف سے کام لوگی تو بھوکى رہ جاؤ گی۔“
 رابعہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگی۔

جب وہ ریٹورنٹ سے باہر نکلیں تو چار بج رہے تھے۔ رابعہ کا خیال تھا کہ اب وہ

والا اسے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ بھی چودھروں کا ملازم تھا اور گاؤں ہی سے آیا ہوا تھا۔ ٹایاب اسے پہچانتی تو تھی لیکن نام سے واقف نہیں تھی۔

”چھوٹی لی لی! آپ یہاں! خیریت!“ اس نے حیرت سے ٹایاب کی طرف دیکھا۔
 ”سعادت سے ملنا ہے۔ اسے جا کر بتاؤ میں آئی ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔

”چودھری جی تو یہاں نہیں ہیں جی۔“ ملازم نے جواب دیا۔ ”وہ تو گاؤں میں ہی ہیں۔ کئی دنوں سے شہر نہیں آئے۔ آپ کب آئی ہیں جی! شاید گاؤں میں کوئی گزرب ہو گئی ہے۔“
 ”گاؤں میں کوئی نہ کوئی گزرب تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ خیر۔ ٹھیک ہے۔“ ٹایاب گاڑی کی طرف واپس آگئی۔ اس نے سیٹ پر بیٹھ کر انجن شارت کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ کوشی کا ملازم گیٹ پر کھڑا حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو وہ ہے چاچا خیرے کا بیٹا والا۔“ رابعہ نے کہا۔ ”یہ بھی بڑا کمینہ آدمی ہے۔ ایک دفعہ ماسی میدہ نے اسے گاؤں کے چوک پر جوڑوں سے پیٹ دیا تھا۔ اس کی بیٹی کو پھیرا تھا اس نے۔“

”میں نے اسے پہچان تو لیا مگر نام نہیں جانتی تھی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”وہیے چودھری سعادت کے بارے میں میرا شبہ درست نکلا۔“
 ”کیسا ہے؟“ رابعہ نے پوچھا۔

”وہ شہر میں نہیں ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”یہ تو ملنگی ہے بھی تا دیا تھا کہ تمہارے اغوا کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ شر جانے کے برابر وہ آس پاس کی کسی ہستی میں موجود ہے۔ پروگرام کے مطابق اسے اسی ریسٹ ہاؤس میں پہنچنا تھا جہاں ہمیں لے جایا گیا تھا۔ لیکن اسے یہ چل گیا ہو گا کہ چاچا نواب دین کو قتل کر کے گھر بھی نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ وہاں آیا ہی نہیں۔ اگر میں تمہیں وہاں سے نکال کر نہ لے آتی تو ملنگی اور اس کے ساتھی اپنی ہوس پوری کر کے تمہیں بھی قتل کر دیتے۔“

”شاید وہ یہی کرتے۔“ رابعہ کانپ اٹھی۔
 کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی شہر کے ایک بارونق علاقے میں آگئی۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ ٹایاب نے ایک پارکنگ ایریا میں گاڑی روک لی اور وہ دونوں نیچے اتر آئیں۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد وہ رابعہ کو لے کر ایک ایئر

کاری کی طرف جائیں گی۔ لیکن نایاب مخالف سمت میں جاری تھی۔ راہبہ اب تک صرف نورپور تک جاتی رہی تھی۔ بڑے شہر میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا۔ بلند و بالا عمارتیں دیکھ کر اس کی حیرت دوچہر ہوگئی تھی۔ نایاب اسے لے کر ایک عمارت میں داخل ہوگئی اور پھر لفٹ میں داخل ہو کر اس نے بٹن دبا دیا۔ راہبہ کو بہت ہلکا سا جھٹکا لگا تھا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ لفٹ رکی۔ آٹو ایک دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں باہر نکل آئیں۔

”بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ راہبہ بولی۔ ”تم اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئیں اور پھر باہر نکل آئیں۔“

”آؤ میں جنسین دکھاؤں۔ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔“ نایاب اسے لیکر راہداری کے آخری سرے پر آگئی اور بہت بڑی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہاں سے جھانک کر باہر دیکھو۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔“

راہبہ نے آگے بڑھ کر باہر جھانکا اور اس کے ساتھ ہی اسے سینے میں اپنا سانس رکھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بہت نیچے سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیاں کھلونوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

”ہم اس وقت پندرہویں منزل پر ہیں۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں ہم داخل ہو کر باہر نکلے تھے لفٹ کھاتا ہے۔ اسی سے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ یہ سب کچھ تمہارے لئے حیرت انگیز ضرور ہے۔ چند روز شہر میں رہو گی تو ایسی چیزوں کی عادی ہو جاؤ گی۔ آؤ۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔“

یہ لفٹ راہبہ کے لئے واقعی حیرت انگیز ثابت ہوئی تھی جس نے وہ منٹ سے بھی کم وقت میں انہیں پندرہویں منزل پر پہنچا دیا تھا۔

دو تین کشادہ راہداریوں میں محوم کر نایاب ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ یہ شہر کے مشہور آرکیٹکٹ صمدیق کا دفتر تھا۔ صمدیق نایاب کے والد ارشاد صاحب کا دوست بھی تھا۔ اس نے بڑی گرجبوشی سے نایاب کا استقبال کیا تھا۔

”تم تو گاؤں بھی ہوئی تھیں۔ کب واپس آئیں؟“ صمدیق نے پوچھا۔

”کل آئی ہوں۔ نایاب نے جواب دیا۔ ”ایک نام تھا۔ سوچا سب سے پہلے آپ ہی

سے مل لوں۔“

”کوہ۔۔۔ کیا کام ہے؟“ صمدیق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

نایاب نے بیگ میں سے کانڈ کا ایک پرزہ نکال کر اس کی طرف دیکھا دیا۔

”یہ اس پلانٹ کا رقبہ ہے۔ ایٹم فیسٹک ہے۔ آپ کو ڈبل سنوری مکان کا نقشہ تیار کرنا ہے۔“

”یہ پلانٹ کہاں پر ہے۔ اس کے آس پاس کی آبادی کیسی ہے؟“ صمدیق نے پوچھا۔

”پلانٹ گاؤں میں ہے۔ دائیں بائیں بیک پر کچے مکان ہیں۔ آپ تصور کر لیں کہ کسی گاؤں میں کیسے مکان ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ جو نقشہ بنائیں گے وہ ماڈرن ہونا چاہئے۔ ڈبل سنوری۔“

”اور یہ نقشہ چاہئے کب؟“ صمدیق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں رہوں گی اور میری خواہش ہے کہ جب میں جاؤں تو یہ نقشہ میرے بیگ میں ہو اور آپ کا ایک اسسٹنٹ میرے ساتھ جو وہاں پہنچے ہی اپنی گھرانی میں کام شروع کرا سکے۔“

”گلتا ہے تم ملت کے لئے میرا کوئی عذر قبول نہیں کرو گی۔“ صمدیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال جانے سے دو دن پہلے مجھے فون کر دیتا۔“

”جی ہنوز۔“ نایاب اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

”ارے بیٹو تو سی۔ چائے یا ٹھنڈا۔۔۔“

”اس وقت کچھ نہیں اٹھل!“ نایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب نقشہ لینے آؤں گی تو چائے ضرور پیوں گی۔“

وہ دفتر سے باہر آئیں۔ اس بلڈنگ میں واقع دفاتر میں چھٹی ہو رہی تھی اور راہداری میں رش تھا۔ اگرچہ چار نشین تھیں مگر انہیں اپنی باری کے لئے تقریباً دس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔

اس عمارت سے باہر آنے کے بعد نایاب نے راہبہ کے ساتھ محوم پھر کر تھوڑی سی شاپنگ کی اور پھر وہ گھر واپس آئیں۔ جب ان کی گاڑی کو غصی کے گیٹ میں داخل ہوئی تو سورج ڈھل رہا تھا۔ نایاب کے ڈیڑی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نایاب اور راہبہ بھی گاڑی

اسے اغوا کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ وہ تین دن پہلے پکڑا گیا تھا اور نور پور پولیس کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ یہ منصوبہ چودھری نے بنایا تھا۔ میں نے اپنے کیس کے تفتیشی آفیسر کو اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ ایک دو دن میں نور پور پولیس سے رابطہ کریں گے اور اس کے علاوہ ایک اور خاص بات بھی معلوم ہوئی ہے۔

”وہ کیا؟“ ارشاد صاحب نے پوچھا۔

”راہبہ کے اغوا کا منصوبہ چودھری سعادت نے کئی روز پہلے بنایا تھا اور وہ خود گاؤں سے چلا گیا تھا تاکہ راہبہ کے اغوا کے وقت گاؤں میں اس کی موجودگی ثابت نہ ہو سکے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شہر جا رہا ہے۔ لیکن مجھے شبہ تھا کہ وہ شہر نہیں گیا اور آج اس کی تصدیق ہو گئی ہے کہ وہ سینے بھر سے شراب پی رہی ہیں۔“ ثانیاب نے بتایا۔

”وہ کیسے؟“ ارشاد صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سعادت کی کوٹھی پر گئی تھی۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”اس کے ملازم دلا نے بتایا کہ سعادت تو ایک مینے سے شہر نہیں آیا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

”اب صورت حال یہ ہے کہ چودھری سعادت کے چاروں طرف قانون کا جال مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ وہ لاکھ بٹن کرے! اس جال سے میں نہیں نکل سکتا۔“

”وہ اس جال سے بچنے کیلئے دوسرے طریقے بھی اختیار کر سکتا ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ ”جس میں معلوم ہے صرف تین دن بعد تمہارے مقدمے کی پیشی ہے۔ تمہارے آنے سے ایک روز پہلے میں نے تمہارے وکیل سے ملاقات کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس پیشی پر تمام عدالتی کارروائی مکمل ہو جائے گی اور اگلی پیشی پر فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس پیشی پر عدالت میں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔“

”جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے اسی لیے میں گاؤں سے آئی ہوں۔“ ثانیاب نے کہا۔

”میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس موقع پر جسیں ذرا محتاط رہنا چاہئے۔ جسیں عدالت سے دور رکھنے کے لئے سعادت کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔

”میں جانتی ہوں ڈیڈی۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”لیکن آپ مطمئن رہیں۔ یہ گاؤں نہیں ہے جہاں سعادت اپنی من مانی کر رہا ہے۔ یہاں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اسے ہزار بار سوچنا پڑے گا۔“

سے اتر کر وہیں آئیں۔

”معزنی نے بتایا تھا تم لوگ بارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔ کہاں گھومتی رہیں اتنی دیر۔“

ارشاد صاحب نے ثانیاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتنی دیر گھر سے باہر ضرور رہی ہیں ڈیڈی لیکن ہم نے کچھ کام بھی کیا ہے۔“ ثانیاب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اے؟“ ارشاد صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم نے اس شخص کا پتہ چلا لیا ہے جس نے کوٹھی کو آگ لگائی تھی اور شار کو بھی وہی اٹھا کر لے گیا تھا۔“ ثانیاب نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ ارشاد صاحب کے لبے میں حیرت تھی۔ ”یعنی جو کام پولیس اتنے روز میں نہیں کر سکی وہ تم نے کچھ بجائے میں کر لیا۔“

”آپ کی دعا سے۔“ ثانیاب مسکرائی۔ ”آپ کو یاد ہو گا کہ میری کوٹھی کے پردوس میں رہنے والے ڈاکٹر عبدالوہاب کے چوکیدار نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ اس نے کار میں آنے والے آدمیوں میں سے ایک کو دیکھ لیا تھا جنہوں نے کوٹھی کو آگ لگائی تھی۔ اس نے پولیس کو اس آدمی کا حلیہ بھی بتایا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ ”میں دو دن پہلے ہی پولیس آفیسر سے ملا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ پورے شہر میں اس آدمی کو تلاش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”جی ہاں۔ آج بھی بات پولیس نے مجھے بھی بتائی تھی۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”وہ آدمی تو اس شہر میں ہی ہے نہیں۔ پولیس کو کیسے پتہ لگے۔“

”کیا مطلب؟“ ارشاد صاحب نے اسے گھورا۔

”میں آج اپنی کوٹھی بلکہ اس کا جلا ہوا کھنڈر دیکھنے گئی تھی۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”ڈاکٹر عبدالوہاب کے ہاں بھی چلی گئی۔ وہیں نسرین بائی سے باتیں کرتے ہوئے چوکیدار سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نے ایک آدمی کو دیکھ لیا تھا اور پولیس کو اس کا حلیہ بھی بتا دیا تھا اور جب مجھے لالہ نے وہ حلیہ بتایا تو میں چونک گئی۔ اس آدمی کا نام ملنگی ہے اور وہ چودھری سعادت کا پردہ غنڈہ ہے۔ راہبہ کے گھر کو جلاتے اس کے باپ کو قتل کرنے اور

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ وہ خزانہ۔۔۔“

”میں نے ٹھیک کہا تھا ڈیڈی۔“ نایاب نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”وہ خزانہ اگرچہ نامکن شیتا نے مجھے انعام میں دیا تھا لیکن میں اسے ذاتی استعمال میں نہیں لاؤں گی۔ میں وہاں اور منصوبوں پر کام کروں گی اور ان منصوبوں میں ایک سکول بھی شامل ہوگا۔ گاؤں کے لوگوں کو تعلیم دوں گی۔ یہ لوگ جدیدیوں سے ڈیروں اور زمینداروں کے ظلم کی چکی میں پھنس رہے ہیں، انہیں ناخواندگی کے اندھیروں سے نکال کر زور تعلیم سے آراستہ کروں گی تاکہ ان میں شعور پیدا ہو اور وہ۔۔۔“

”بس۔۔۔ بس۔۔۔ بس۔۔۔“ ارشاد صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”تم گاؤں والوں کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہو جس کے وعدے ہر جی حکومت کرتی ہے۔ دھت لینے سے پہلے ان معصوم لوگوں کے سامنے ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ انکیشن کے دنوں میں ہر طرف سے ایسی ہی آوازیں کالوں میں پڑتی ہیں جنہیں سن کر یہ خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ اب ہمارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ملک میں امن و امان ہوگا۔ خوشحالی ہوگی۔ کوئی غریب رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہیں رہے گا۔ غریبوں کے علاج کے لئے ڈاکٹر ان کے گھروں پر جائیں گے۔ منگائی، جس نے غریب عوام کی کمزور رکھی ہے، خود دم توڑ دے گی۔ لیکن انکیشن کے بعد کیا ہوتا ہے؟ یہ ہم پچاس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ انکیشن جیتنے والے تو دولت کے انبار لگانا شروع کر دیتے ہیں اور غریب، غریب تر ہو جاتے ہیں اور ان وعدوں کو یاد کر کے ہنسنے لگتے ہیں۔“

”ڈیڈی!“ نایاب نے ان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”چونکہ مجھے دھت کی ضرورت نہیں ہے اس لئے میں جو وعدہ کروں گی وہ پورا کروں گی۔ میں اس گاؤں کو اور اس علاقے کی ساری بنیادوں کو مثالی بنائوں گی اور میں اکیلی نہیں ہوں گی۔ میرے ساتھ تمام گاؤں والے ہوں گے۔“

”بیٹی! میری تو دعا ہے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔

”امین۔“ راہب نے دعا کیلئے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

”کل آپ کو دفتر کے بعد تو کوئی ضروری کام نہیں ہے۔“ نایاب نے پوچھا۔

برا تو ہر جگہ برا ہی ہوتا ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ ”اس کے پاس پیسہ ہے اور وہ پیسے کے زور پر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کرائے کے غنڈے تو کہیں بھی مل جاتے ہیں۔ ہر حال کل صبح میں ڈی آئی جی سے بات کروں گا تاکہ تمہاری حفاظت کا کوئی مناسب بندوبست ہو سکے۔“

نایاب کچھ کہنا چاہتی تھی کہ صغریٰ ان کے لئے چائے لیکر آجی۔

چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ اب نایاب اور راہب ارشاد صاحب کو گاؤں کی باتیں سناری تھیں۔ پراسرار واقعات کا تذکرہ ایک بار پھر چل نکلا۔ پھر نایاب اچانک ہی بات بدلتی ہوئی بولی۔

”ڈیڈی۔ آپ کی رپازرٹ میں شاید ایک سال باقی رہ گیا ہے۔ میں نے تو اب بیسہ کیلئے گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ رپازرٹ کے بعد آپ بھی گاؤں ہی سیش ہو جائیں۔ مجھے تو گاؤں بڑا اچھا لگتا ہے۔ ہر طرف سبزہ سبزہ، کھلی اور تازہ ہوا۔ تازہ سبزیاں اور پھل اور اپنے سامنے پنا ہوا کندم کا خالص آنا۔ ہر چیز خالص۔ پیار بھی، خلوص بھی اور جاہت بھی۔ سکتے معصوم اور سادہ لوح لوگ ہیں۔ اگر خدا مجھے دس زندگیاں دے تو میں گاؤں ہی میں رہنا پسند کروں گی۔“

”شاید تم بھول گئی ہو کہ گاؤں میں چوہری سعادت جیسے لوگ بھی رہتے ہیں۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔

”برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”لیکن اگر شروع ہی میں ایسے لوگوں کو بچاں دیا جائے تو برائی کو پھیلنے کا موقع نہیں ملتا۔“

”لیکن تم گاؤں میں کدو کی کیا؟“ ارشاد صاحب مکرانے۔ ”تمہارا منصوبہ تو یہ ہے کہ چوہریوں کی جائیداد سے اپنا حصہ لینے کے بعد وہ زمین غریب کسانوں میں بانٹ دو گی۔ تمہارے پاس کیا رہے گا؟“

”سوچا تو میں نے یہی ہے اور انشاء اللہ کروں گی بھی ایسا ہی۔“ نایاب نے جواب دیا۔ ”وہی میری اپنی بات تو میرے پاس نہیں ہے“ حوصلہ ہے۔ گاؤں والوں کا خلوص ہے پیار ہے۔ جس کے پاس یہ سب کچھ ہو اسے کسی اور چیز کی ضرورت ہی کب رہتی ہے اور پھر آپ اس خزانے کو بھول گئے ہیں جس کا گزشتہ رات میں نے ذکر کیا تھا۔“

ان دونوں کے ہاتھوں میں آٹو جیک رانٹلیں تھیں۔ وہ دونوں بڑی پھرتی سے آگے بڑھے اور انہوں نے کار میں بیٹھی ہوئی ٹایاب اور ارشاد صاحب پر رانٹلیں تان لیں۔
ٹایاب کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ارشاد صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ خوفزدہ پہلی چوٹی سی نظروں سے سامنے کھڑے ہوئے نقاب پوشوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔



”نہیں ایسا تو کوئی کام نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“
”وہ دراصل میں چاہتی ہوں کہ کسی قابل اعتماد جوہری کو ہیرے دکھا کر سودا کر لیا جائے تاکہ مجھے اپنے منصوبوں پر عمل شروع کرنے کیلئے راست مل سکے۔“ ٹایاب نے کہا۔
”نہیک ہے۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ ”کل میں دفتر سے سیدھا گھر آ جاؤں گا۔ تم لوگ تیار رہنا۔ ہم بازار چلے چلیں گے۔ میں دو چار ایسے جوہریوں کو جانتا ہوں جن کے پاس عرب ریاستوں کے شیخ آتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہیں نہ کہیں بات بن جائے گی۔“

وہ دیر تک وہاں بیٹھے ہاتھیں کرتے رہے اور نو بجے کے قریب جب صغریٰ نے بتایا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے تو وہ لان سے اٹھ کر اندر آ گئے۔
کھانے کے بعد ٹایاب نے لاؤنج میں رکھا ہوا ٹی وی کھول دیا۔ رابہر بھی وہیں بیٹھ گئی۔ ارشاد صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ٹی وی پر فلم آرہی تھی۔ رابہر بڑی دلچسپی سے فلم دیکھ رہی تھی۔
ایک بجے کے قریب فلم ختم ہوئی۔ رابہر اور ٹایاب اس کے بعد بھی دیر تک لاؤنج ہی میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور جب ٹایاب کو ہمائیاں آنے لگیں تو وہ دونوں اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

اگلے روز جوہریوں کی دو تین دوکانوں پر گھومنے کے بعد ایک جوہری سے پانچ ہیریوں کا دس لاکھ میں سودا ہو گیا۔ اس نے ایک دن بعد ادائیگی کا وعدہ کیا تھا اور پھر اس سے اگلے دن ٹایاب نے ہیرے اس کے حوالے کر کے رقم وصول کر لی۔ جوہری نے باقی ہیرے بھی ایک ہفتے بعد خرید لینے کا وعدہ کیا تھا۔

دوسرے دن ہائیکورٹ میں پیشی تھی۔ رابہر کو گھر پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ٹایاب اپنے ڈیوٹی کے ساتھ ہائیکورٹ جانے کیلئے روانہ ہو گئی۔

کار ہائیکورٹ والی سڑک پر مڑی ہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار نے تیزی سے آگے نکل کر ان کا راستہ روک لیا۔ ٹایاب نے بڑی پھرتی سے بریک لگا کر اپنی کار روک لی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی آگے کھڑی ہوئی کار کے دونوں طرف کے دروازے کھلے اور دو آدمی بڑی تیزی سے نیچے اترے۔ ان کے چہروں پر نقاب چڑھے ہوئے تھے۔

ڈرائیور نے انجین اسٹارٹ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں بھی آؤٹریک رائفل تھی۔ ان دونوں کے چروں پر بھی نقاب بندھے ہوئے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر وہ راہ گیر فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی ایک کار کی آڑ میں کھڑے ہو کر شور مچانے لگا۔

وہ دونوں نقاب پوش جنہوں نے ٹایاب اور ارشاد صاحب کو رائفوں کی زد پر لے رکھا تھا، چونک گئے۔ کار میں بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنی رائفل کی ٹال کھڑی سے باہر نکال لی اور اس طرف متوجہ ہونے والے لوگوں کو ہراساں کرنے کے لئے ہوائی فائرنگ کرنے لگا۔

ٹایاب اور ارشاد صاحب کی کار کو گھیرے ہوئے دونوں نقاب پوشوں نے بھی اپنی اپنی رائفوں کے ٹرائیگر دے دیے۔ ٹایاب چیختے ہوئے نیچے جھک گئی۔ اس کا خیال تھا کہ رائفل سے نکلنے والی گولیاں اس کا جسم چھلی کر دیں گی۔ ارشاد صاحب بھی چیختے ہوئے نیچے جھک گئے تھے۔

ایک سیکنڈ گزر گیا۔ دو سیکنڈ گزر گئے۔ لیکن ٹایاب کا جسم گولیوں سے چھلی نہیں ہوا۔ فائرنگ کی آواز اس کی سماعت سے نہیں ٹکرائی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی طرف کھڑا ہوا نقاب پوش بار بار ٹرائیگر دیا تھا لیکن فائر نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف کھڑا ہوا نقاب پوش بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔

”فائر کرو..... اڑا دو انہیں۔ دیکھ کیا رہے ہو؟“ اگلی کار میں بیٹھا ہوا نقاب پوش چیخ اٹھا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس نے ایک ہوائی برسٹ مارا اور پھر اپنی رائفل کا رخ ٹایاب کی طرف کر کے ٹرائیگر دیا۔

لیکن اس مرتبہ رائفل سے کوئی گولی نہیں نکلی۔ ٹرائیگر پوری طرح نہیں دیا تھا۔ وہ فھنس ٹرائیگر کو پوری قوت سے دبا لے لگا۔ لیکن ٹرائیگر جیسے جام ہو کر رہ گیا تھا۔

ٹایاب کی کار کے دونوں طرف کھڑے ہوئے نقاب پوش بار بار ٹرائیگر دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے رائفوں کو جھٹکے بھی دیے۔ ٹیلے نقاب والے نے بڑی پھرتی سے رائفل کا ٹریگن نکال کر دوبارہ فٹ کیا اور ایک بار پھر ٹایاب کو زد پر لے کر ٹرائیگر دبانے لگا لیکن ٹرائیگر نہیں دیا اور رائفل سے کوئی گولی نہیں نکلی۔ اس فھنس کی

سولہویں فرسٹ

وہ دونوں نقاب پوش رائفیں تانے ایک لمحے کو کار کے سامنے رکے اور پھر بڑی پھرتی سے ان میں سے ایک کار کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف آگیا۔ ایک کی رائفل کا رخ ٹایاب کی طرف تھا اور دوسرے کی رائفل نے ارشاد صاحب کو زد پر لے رکھا تھا۔ جو فھنس ٹایاب کی طرف آیا تھا اس کے چہرے پر گہرے ٹیلے رنگ کا کپڑا تھا جس پر سفید پولکا ڈاٹس تھے، بندھا ہوا تھا۔ وہ کار کی کھڑکی سے تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ رائفل کا رخ ٹایاب کی طرف اور انگلی ٹرائیگر پر تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ٹایاب ایک بے خوف، نڈر اور حوصلہ مند لڑکی تھی لیکن موت کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی حالت بھی غیر ہو گئی تھی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگی تھیں۔ موت چند فٹ کے فاصلے پر سامنے کھڑی تھی اور پھاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کار سے اتر کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

ارشاد صاحب کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ موت اس طرح جھپٹ پڑنے کو تیار کھڑی ہو تو بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ وہ سیدھے سادے آدمی تھے۔ صبح جو اور اس پنڈ۔ لڑائی جھگڑوں سے بیحد دور رہے تھے اور اب ایک نقاب پوش ان پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ ان کی زندگی اور موت کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس فھنس کی انگلی کی معمولی سی حرکت ان کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔

ان دونوں کاروں کو اس طرح رستے دیکھ کر ایک دو راہ گیر بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک راہ گیر نے دو آدمیوں کو رائفیں لئے کار سے اترتے دیکھ لیا اور جب وہ نقاب پوش دوسری کار میں بیٹھے ہوئے ٹایاب اور ارشاد صاحب پر رائفیں تان کر کھڑے ہو گئے تو وہ فھنس چوگے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے آگے والی کار کی طرف دیکھا۔

کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا جس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر شور مچا دیا تھا۔

”ہاں بھیا۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی۔

کچھ دوسرے لوگ بھی کار کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دونوں پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے اور لوگوں کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید اس کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر فائرنگ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں خیریت دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”آپ ٹھیک ہیں صاحب!“ ایک پولیس والا جو ہیڈ کانسٹیبل تھا، ارشاد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

فائرنگ کس پر کی گئی تھی۔ کار کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ یہ بی بی بھی ٹھیک ہی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں حوالدار صاحب۔“ ٹایاب کی طرف کھڑے ہوئے شخص نے کہا جس نے شور مچایا تھا۔ ”میرا نام انیس احمد ہے۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ ایک اور کار نے اس کا راست روک لیا۔ ان میں سے دو نقاب پوش اترے اور ان پر رائلنلین تان لیں۔ میں نے اس کار کی آڑ میں کھڑے ہو کر شور مچایا۔ ان نقاب پوشوں کا تیسرا ساتھی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ لوگ شاید انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر شور مچا دیا۔ میرے شور مچانے پر وہ دونوں نقاب پوش شاید بدحواس ہو گئے تھے۔ ان سے فائرنگ نہیں ہو سکی۔ اسی دوران ان کا تیسرا ساتھی بھی کار سے اتر کر ادھر آگیا۔ اس نے خود انہیں گولیوں کا نشانہ بنانا چاہا مگر وہ بھی ان پر فائرنگ نہیں کر سکا اور وہ کار میں بیٹھ کر ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔“

”بڑے ہادور ہو یاد تھ۔“ حوالدار انیس احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان نقاب پوشوں پر تمہارا اتنا دھب پڑا کہ وہ بدحواس ہو کر ان پر فائر نہیں کھول سکے اور بعد میں فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔“

”یہ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں آفسیر۔“ ٹایاب نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے

آنکھوں میں الجھن کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ اس نے رائفل کو دو تین جھٹکے دیئے لیکن رائفل چل کر نہیں دی۔ دوسرے نقاب پوش بھی ایسی صورت حال سے دوچار تھے۔

فٹ پاتھ کے قریب کار کی آڑ میں کھڑا ہوا راہ گیر مسلسل شور مچا رہا تھا۔ ہوائی فائرنگ سے ٹھیک رک گیا تھا اور لوگ کاروں سے اتر کر محفوظ مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔ عجیب بھگدڑ مچ گئی تھی اور کسیر سے پولیس کے سائرن کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

”کبیرے بھاگو۔“ یہ چیخ ہوئی آواز اس نقاب پوش کی تھی جو بعد میں اگلی کار سے اترتا تھا اور کچھ دیر پہلے ہوائی فائرنگ کرتا رہا تھا۔

تینوں نقاب پوش دوڑ کر اگلی کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور فوراً ہی کار کو حرکت میں لے آیا۔ تینوں نقاب پوش رائلنلین کمرکھیں سے باہر نکال کر ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ اس مرتبہ ٹرانسگر جام نہیں ہوئے تھے۔ تینوں رائلنلین تیز رفتاریاں اگلی رہی تھی۔ وہ کار ایک زور دار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

یہ سب کچھ صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ نقاب پوشوں کی کار کافی آگے جا چکی تھی۔ پولیس کی ایک موبائل وین بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ صرف ایک لمحوہ دہاں رکی۔ دو پولیس والے رائلنلین سنبھالے بچے اتر آئے اور موبائل تیز رفتاری سے اس کار کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

ٹایاب کے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ کر سر جھکا لیا۔ اس کے دل کی دھڑکن خوشگند حد تک تیز ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لئے کچھ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ارشاد صاحب کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

فٹ پاتھ کے قریب کار کی آڑ میں کھڑا وہ شخص، جس نے نقاب پوشوں کو دیکھ کر شور مچا دیا تھا، دوڑ کر ٹایاب کی کار کے قریب آگیا۔

”میڈم۔ آپ ٹھیک ہیں نا.....“ اس نے کڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

ٹایاب نے اسٹیرنگ پر جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی حد تک اپنی

ہیڈ کانسٹیبل لوگوں کو ادھر ادھر بٹانے لگے۔ ٹایاب نے انہیں اشارت کر دیا اور گاڑی کو سڑک پر لے آئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ گاڑی کو ہائی کورٹ کے پارکنگ ایریا میں روک رہی تھی۔

کمرہ عدالت میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ چوہدری سعادت حاضر نہیں تھا البتہ اس کا وکیل موجود تھا۔ مختصر سی کارروائی کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنانے کے لئے دو ہفتے بعد کی تاریخ دی گئی۔

عدالت سے نکلنے کے بعد ٹایاب اور ارشاد صاحب سیدھے گھر ہی پہنچے تھے۔ مغزی نے بتایا کہ دو مرتبہ ایس بی محاس کا فون آچکا ہے۔ ارشاد صاحب فون کا ریسور اٹھا کر نمبر ملانے لگے اور ٹایاب صوفے پر بیٹھ گئی۔ رابعہ بھی اس کے پاس آئی۔

”کیا ہوا پیشی کا۔ فیصلہ ہو گیا۔“ رابعہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ فیصلے کے لئے دو ہفتے بعد کی تاریخ دی گئی ہے۔ سعادت بھی آج عدالت میں نہیں آیا تھا۔ البتہ عدالت جانے سے پہلے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔“ ٹایاب نے بتایا۔

”ہائے رہا۔ کون تھا وہ؟“ رابعہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ ”تین نقاب پوش تھے۔ انہوں نے ہماری گاڑی روک کر ہم پر فائرنگ کرنا چاہی تھی لیکن ان کی رائفوں نے گولیاں اٹکنے سے انکار کر دیا۔“ ٹایاب نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے اس واقعہ کے بارے میں بتانے لگی۔

”بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سانچ کو آج نہیں۔“ رابعہ نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں، تم حق پر ہو اس لئے قدرت بھی تمہاری مدد کر رہی ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ کچھ دیر پہلے وہ نقاب پوش ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے تم پر فائرنگ کرنا چاہی تو رائفل نہیں چلی اور پھر فرار ہوتے ہوئے بھی وہ تینوں ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ تم پر حملہ کرنے کے لئے تینوں کی رائفوں نے کام نہیں کیا۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت تمہاری مدد کر رہی ہے۔ لیکن وہ حملہ آور کون ہو سکتے تھے؟“

”چوہدری سعادت کے گروگروں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔“ ٹایاب بولی۔ ”وہ مجھے

کہا۔“ ان کے شور چمانے سے وہ نقاب پوش شاید واقعی بدحواس ہو گئے تھے اور ان سے فائرنگ نہیں ہو سکی تھی۔“

”آپ کون ہیں بی بی!“ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ ”آپ کی کار کو گھیر کر آپ پر فائرنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارروائی باقاعدہ فائرنگ کے تحت کی گئی تھی۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ آپ اس طرف آنے والی ہیں اور وہ لوگ پہلے سے کھات لگائے بیٹھے تھے۔“

”وہ لوگ پہلے سے کھات لگائے نہیں بیٹھے تھے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”وہ ٹالہا“ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ راستے میں کہیں انہیں موقع نہیں مل سکا ہو گا اور یہاں پہنچ کر انہیں موقع تو مل گیا لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔“

”رب کا شہر ادا کریں جی۔“ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ ”اس قسم کے لوگ بڑے پکے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ شاید اناڑی تھے۔ بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔“

”یہی ہی لگتا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”کیا اب ہم جا سکتے ہیں۔“

”کوئی نقصان تو ہوا نہیں۔ آپ کو روکنا بیکار ہے لیکن ہمارے انچارج کے آنے تک تو آپ کو رکنای پڑے گا۔“ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

”میری کورٹ میں چٹھی ہے۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔“ ٹایاب نے کہا۔

”سسر، ہیڈ کانسٹیبل۔“ ارشاد صاحب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ”میرا یہ کارڈ رکھ لو۔

تمہارا آفیسر آجائے تو اس سے کتا بعد میں کسی وقت مجھ سے رابطہ کر لے۔“

”آپ کون ہیں جناب۔ اس بی بی سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے ان کے ہاتھ سے کارڈ لینے ہوئے کہا۔

”یہ میری بیٹی ہے اور میں وزارت داخلہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہوں۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔

ڈپٹی سیکریٹری کے الفاظ سننے ہی ہیڈ کانسٹیبل نے کھٹ سے سلیوٹ بھڑا دیا۔

”میں سر۔“ وہ بولا۔ ”آپ تشریف لے جا سکتے ہیں سر۔ میں انچارج صاحب کو بتا دوں گا۔ وہ آپ سے مل لیں گے۔ یہ تکلیف معاملہ ہے سر۔ اس کی تحقیقات ہوگی سر۔

پولیس پارٹی ان لوگوں کے پیچھے گئی ہے سر۔ آپ تشریف لے جائے۔“

حق کی ارشاد صاحب کی آواز سن کر چونک گئی۔

”جی ڈیٹی۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”تم شاید سوچتی تھیں۔“ ارشاد صاحب بولے۔

”نہیں ڈیٹی، دیسے ہی انھیں بند کئے بیٹھی سوچ رہی تھی۔“ ٹایاب نے جواب

دیا۔ رابہر اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

”میں نے ابھی لیٹی فون پر ایس بی عباس سے بات کی ہے۔“ ارشاد صاحب کہہ رہے تھے۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا ہے۔ پولیس ہائی حملہ آوروں کے تعاقب میں گئی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ عباس کا کہنا ہے کہ ہمیں پولیس میں باقاعدہ ایف آئی آر ضرور درج کروائی چاہئے۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا ڈیٹی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”البتہ یہ ضرور ہوگا کہ میرے رپورٹ لکھوانے کے بعد یہ لوگ دو چار بے گناہوں کو پکڑ کر بند کر دیں گے۔ اصل طزم تو ان کے ہاتھ آئیں گے نہیں۔“

”اب ایسی بات بھی نہیں ہے بیٹی!“ ارشاد صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ”پولیس کوئی کارروائی اسی وقت کرے گی جب حوام کی طرف سے انہیں تعاون حاصل ہوگا۔ ہم لوگ تعاون نہیں کریں گے تو پولیس طرہوں کا کھوج کیسے لگائے گی۔“

”پولیس کے ساتھ تعاون کر کے بھی دیکھ لیا ڈیٹی۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”گاؤں میں ایسے کتنے واقعات ہوتے ہیں کہ ہر مرتبہ جانتے جا کر پولیس کو اطلاع دی لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ چوہدری سعادت ہی کے بارے میں پولیس کے سامنے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ گاؤں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں چوہدری سعادت کا ہاتھ ہے لیکن اس کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس نے کیا فائدہ پولیس کے پاس جانے کا۔“

ارشاد صاحب کچھ کہتا ہی چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ چند لمبے فون پر بات کرتے رہے پھر ریسیور رکھ کر ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”اسپیکر بحال کا فون تھا۔ پولیس موبائل نے شر کے لڑائی علاقے کبیر والا تک ان

عدالت پہنچنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”خدا غارت کرے اسے۔“ رابہر بولی۔ ”تم نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی۔ اسے پکڑ لیا کیوں نہیں۔“

ٹایاب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”ایسے لوگوں کا پکڑا جانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب پکڑے جاتے ہیں تو ہرج مرج نہیں سکتے۔ میں اس پر اس طرح ہاتھ ڈالنا چاہتی ہوں کہ وہ بخ کر نکل نہ سکے۔ دیسے سعادت اتنا بیوقوف نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے۔ بہت پلاننگ کے ساتھ کر رہا تھا۔ تمہارے خلاف جو کارروائی ہوئی تھی اس میں بھی اس نے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ اس کا لوٹ ہونا ثابت نہ ہو سکے اور آج بھی جو کچھ ہوا ہے وہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ یہ پروگرام کئی دن پہلے بنا ہوا تھا اور وہ خود اس شہر میں موجود نہیں ہے۔ مگر اس کا نام نہ آسکے۔ حالانکہ آج اس کا یہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ عدالت میں اس کی پیشی تھی۔“

”ہاں۔ ایسے لوگ واقعی بہت چالاک ہوتے ہیں۔“ رابہر نے کمرہ سانس لیتے ہوئے کہا۔

ٹایاب نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آج کا واقعہ اس کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا تھا۔ کتاب پر پوچھ لے جب اس پر رانٹیں مانی تھیں تو وہ سمجھی تھی کہ زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن رابہر نے شاید ٹھیک کہا تھا کہ قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ تین خدنگ آوی ہو اسے قتل کرنے کے ارادے ہی سے آئے تھے۔ اس پر رانٹیں مانتے کڑے تھے۔ وہ بار بار ٹرانسکرپٹر دبا رہے تھے لیکن رانٹوں نے گولیاں نہیں اٹھی تھیں۔ تین رانٹیں جام ہو گئی تھیں اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ جو شخص پہلے اپنی رانٹوں سے ہوئی فائرنگ کر رہا تھا اور اس کی رانٹیں بھی جام ہو گئی تھی اور راہ فرار اختیار کرتے ہوئے ہوائی فائرنگ کے لئے تینوں کی رانٹوں نے گولیاں اگلا شروع کر دی تھیں۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ لیکن اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھر آیا۔ کیا رانٹوں کو جام کرنا ان پر اسرار اور تادیبہ قوتوں کا کارنامہ ہو سکتا ہے جو گاؤں میں اس کی مدد کرتی رہی ہوں؟ ٹایاب یہ سب کچھ سوچ رہی

”ٹھیک ہے پی بی!“ انہیں بولا۔ ”اس کی شناخت کے بعد یہ آسانی ہوگئی ہے کہ اب ہم اس کے دوسرے ساتھیوں کا سراغ بھی لگا سکیں گے۔ آئیے ارشاد صاحب آپ لوگوں کو زحمت تو ہوگی لیکن تمہاری دیر کے لئے آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا تاکہ باقی کارروائی بھی پوری ہو سکے۔“

”چلے۔ ہمیں ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔“ ارشاد صاحب نے جواب دیا۔ ہسپتال سے نکل کر انہیں جمال تو اپنی جیب میں بیٹھ گیا اور ٹایاب وغیرہ اپنی کار میں آئے۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ پولیس اسٹیشن کا سارا عملہ چوکس ہو گیا تھا۔ انہیں جمال نے راستے میں موبائل فون پر ڈی ایس پی کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ڈی ایس پی بھی اپنی گاڑی پر تقریباً ان کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔ ارشاد صاحب حکومت کے ایک اہم عہدہ میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ ان پر ناکام قاتلانہ حملے کی خبر پہلے ہی سچ گئی تھی۔

پولیس میں رپورٹ ارشاد صاحب کی مددیت ہی میں لکھی گئی تھی اور پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے ملزم کی شناخت بھی رابعہ کے حوالے سے درج کر لی گئی تھی۔ ملزم کا نام رمضان تھا اور وہ گاؤں میں واردات کرنے کے بعد فرار ہوا تھا۔ رابعہ ہی کے بیان سے انکشاف ہوا تھا کہ ”تقریباً“ ایک مہینہ پہلے رمضان اور گاؤں کے دکاندار اکرم کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ رمضان اکرم کی دکان سے سودا ادھار لیتا رہتا تھا۔ وہ تین سو روپے کا مقروض ہو گیا تھا اور جب اکرم نے یہ قرض مانگا تو ان میں جھگڑا ہو گیا۔ بات بڑھ گئی۔ رمضان نے برف توڑنے والا سوا اٹھا کر اکرم کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

رمضان پہلے تو گاؤں ہی میں چھپا رہا لیکن جب بات پولیس تک پہنچی تو وہ گاؤں سے بھاگ گیا۔ اکرم بچ گیا تھا۔ چوہدری سعادت نے سچ میں ہر طرح کا معاملہ دفع کر دیا اور پولیس میں رپورٹ درج نہیں ہونے دی۔ اکرم کو بھی رمضان کے قرضے کی رقم کے علاوہ ایک ہزار روپے دے کر اس کی زبان بند کر دی گئی تھی۔ لیکن رمضان گاؤں واپس نہیں آیا تھا اور اب گاؤں سے سینکڑوں میل دور شہر میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ وہ ٹایاب پر حملہ کرنے والوں میں شامل تھا۔

لوگوں کا چچھکا کیا تھا جنہوں نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیر والا میں مقابلے کے دوران ملتان کا ایک ساتھی مارا گیا جبکہ باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہلاک ہونے والے ملزم کی لاش اس وقت ہسپتال میں پڑی ہے۔ اس نے شناخت کے لئے بلایا ہے۔“

”ہم اسے کیسے شناخت کر سکتے ہیں۔ جبکہ حملہ آوروں کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”اس لاش کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے اس شخص کو پہلے کیس دیکھا ہو۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ چلے۔“ ٹایاب اٹھ کر کمری ہو گئی۔ اسی وقت رابعہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ ٹایاب نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسٹیونگ اس مرحلے پر بھی ٹایاب ہی نے سنبھالا تھا۔ کوئی سے نکل کر ہسپتال پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ انہیں جمال پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ انہیں لے کر ہسپتال کے مردہ خانے میں لایا۔ مردہ خانے میں اس وقت دو لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں کے اشارے پر ایک انڈسٹری نے ایک لاش پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ چہرہ ٹایاب اور ارشاد صاحب کے لئے تو ابھی تھا۔ لیکن رابعہ اسے دیکھ کر اچھل پڑی۔

”یہ..... یہ.....“ وہ بھلا کر رہ گئی۔

”کون ہے یہ۔ پچھانی تو اسے؟“ ٹایاب نے چوک کر پوچھا۔

”یہ تاجا سسلی کا بیٹا ہے۔“ رابعہ نے جواب دیا۔ ”تقریباً“ ایک مہینہ پہلے اکرم دکاندار سے اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے برف توڑنے والا سوا اس کے پیٹ میں گھونپ دیا تھا اور پھر گاؤں سے بھاگ گیا تھا پولیس اسے تلاش کرتی رہی تھی لیکن اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔“

”اوہ!“ انہیں جمال نے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے پہلے سے پولیس کو مطلوب تھا۔“

”یہ چوہدری سعادت کا کارندہ تھا۔“ رابعہ نے جواب دیا۔ ”چوہدری کی وجہ سے ہی نور پور کے پولیس والوں نے اس کی تلاش پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ حالانکہ وہ کوشش کرتے تو اسے پکڑا جاسکتا تھا۔“

بولی۔ ”نور پور پولیس نے ملٹی ٹائی ایکٹس کو حراست میں لیا ہے۔ اس شخص نے میری شہر دہلی کو بھی آگ لگائی تھی اور میں نے مقامی پولیس کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔“

”ٹھیک ہے مس ٹایاب۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”اب صورت حال میری سمجھ میں آگئی ہے۔ میں جلد ہی اس سلسلے میں آپ کو اطلاع دوں گا۔“

”شکریہ۔ میں انتظار کروں گی۔“ ٹایاب نے کہا۔

ڈی ایس پی نے گرجھوٹی سے ارشاد صاحب سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کر دیا اور وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس سلسلے میں ضروری کارروائی کرے گا۔

وہ لوگ گھر واپس آگئے۔ ٹایاب آج کے اس واقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ دن پہلے اس نے چوہدری سعادت کی کوٹھی پر جاکر معلوم کیا تھا تو کوٹھی کے ملازم نے بتایا تھا کہ چوہدری سعادت تقریباً ایک مہینے سے یہاں نہیں آیا۔ لیکن آج کے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ وہ شہر میں موجود ہے۔

ٹایاب کا ذہن الجھ گیا تھا۔ رابہ کے اغوا میں بھی چوہدری سعادت کا ہاتھ تھا اور اب اس واقعہ میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ایک آدمہ دن پہلے ہی شہر آیا ہو اور اسے پتہ چل گیا ہو کہ ٹایاب اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ اس نے ٹایاب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کسی پراسرار غیبی قوت نے ٹایاب کو بچا لیا۔ رمضان پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اس کی شناخت کے بعد تو یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ ٹایاب پر اس سلسلے میں چوہدری سعادت ہی کا ہاتھ ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کرتی ہے۔

ٹایاب اس رات بھی دیر تک یہی سبک بھجھ سوچتی رہی۔ وہ غیبی قوت کون تھی جس نے اسے بچایا تھا۔ وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھی کہ ان تینوں حملہ آوروں کی رائٹیں محض اتفاق سے جام ہوگئی تھیں۔ وہ کوئی نادیدہ قوت ہی تھی جس نے ان کی رائٹوں کو ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ نادیدہ قوت کون تھی؟

وہ پراسرار بوڑھا جو گاؤں میں بھی ایسے مقبوض پر اس کی مدد کرتا رہا تھا یا وہ سہرا سانپ جس نے کہا تھا کہ وہ اس کا محافظ بن کر رہے گا۔ ٹایاب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا

ٹایاب کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گاؤں سے فرار ہونے کے بعد رمضان شہر آیا تھا اور چوہدری سعادت کی کوٹھی میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ ٹایاب پر حملہ چوہدری سعادت ہی نے کروایا تھا۔

”ٹھیک ہے سر۔“ ڈی ایس پی نے ارشاد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حادثہ کی شناخت ہوگئی ہے۔ اب ہم دوسرے مظلوم کا سراغ لگائیں گے اور انشاء اللہ دو تین دن میں آپ کو اطلاع دیں گے۔“

”ایک بات اور جواب!“ ٹایاب نے کہا۔ ”کچھ عرصہ پہلے سن آباد میں میری کوٹھی کو آگ لگ دی گئی تھی۔ پولیس ٹھکان کو تلاش نہیں کر سکی۔ لیکن کل ایک مظلوم کی شناخت ہوگئی ہے اور میں نے پولیس کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ملٹی ٹائی وہ شخص اس وقت نور پور پولیس کی تحویل میں ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ مقامی پولیس کی طرف سے اس سلسلے میں کیا چیزیں رشت ہوئی ہے۔“

”سن آباد کا خاندان بھی میرے ہی اغوا ہے۔ میں معلوم کر کے آپ کو اطلاع دوں گا۔“ ڈی ایس پی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”ان تمام باتوں سے میں ایک نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان ساری کارروائیوں کے پیچھے چوہدری سعادت کا ہاتھ ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ شخص کون ہے اور اس سے آپ کی کیا کوٹھی ہے؟“

”جی ریاست ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”چند سال پہلے چوہدری سعادت کے چھوٹے بھائی سرسزا سے میری شادی ہوئی تھی۔ اس شادی میں سرسزا کے گھرانوں کی مرضی شامل نہیں تھی۔ لہذا انہوں نے مجھے بوکی حیثیت سے تحمل نہیں کیا۔ شادی کے چند ماہ بعد میرے شوہر کو گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ شہر ہے کہ اس میں چوہدری سعادت کا ہاتھ تھا لیکن پولیس آج تک کچھ نہیں کر سکی۔ میں سرسزا چوہدری کی جائز وارث ہوں اور میں نے جائیداد میں اپنے حصے کے لئے مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ بس یہی جھگڑا ہے۔ چند روز پہلے میں گاؤں گئی تھی۔ وہاں بھی مجھ پر بار بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ میں نے ہر بار فور پور پولیس کو اطلاع دی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہاں شہر میں میری کوٹھی کو آگ لگ دی گئی اور گاؤں میں میرے حمایتیوں کو ہراساں کیا جانے لگا۔ اس کے باپ کو قتل کر کے مکان کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔“ اس نے رابہ کی طرف اشارہ کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے

کھڑا مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مگرمی ہوگئی اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے آیا۔

اس نوجوان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ٹایاب کی نظریں اب بھی اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور پھر اسے یوں لگا جیسے وہ خوبرو نوجوان اس کیلئے اجنبی نہ ہو۔ وہ سرفراز تھا۔ اس کا اپنا سرفراز جس کے لئے اس نے دنیا بھر کی مخالفت مول لی تھی۔ نوجوان کا ہاتھ اب بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ ٹایاب نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور پھر اس نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

ہاتھ کے لمس سے یوں لگا جیسے ٹایاب کے جسم میں ہزاروں دولت کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ اس کے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی چلی گئی۔ نوجوان اس کا ہاتھ تھامے کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑکی خود بخود کھل گئی اور پھر ٹایاب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیر زمین سے اوپر اٹھ رہے ہوں وہ اس نوجوان کے ساتھ فرش سے تقریباً "ایک فٹ اوپر ہوا میں معلق تھی اور پھر وہ دونوں وہاں تیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر نکل گئے۔

وہ بادلوں میں تیر رہے تھے۔ نوجوان نے ٹایاب کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ لیکن ٹایاب کو خوف سا محسوس ہو رہا تھا وہ اس نوجوان کے ساتھ لپٹ گئی۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ بیڈ روم میں واپس آگئے۔

اور پھر ٹایاب کو یوں لگا جیسے کوئی اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا ہو اور پکار رہا ہو۔ یہ آواز اسے گمراہی سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹایاب ٹایاب آنکھیں کھولو کیا ہوا ہے تجیس"

ٹایاب کسمائی اور اس نے اس خوبرو نوجوان کو اپنی ہانپوں کی لپیٹ میں لے لیا اور اسے بچپتی چلی گئی۔

"ٹایاب چھوڑ مجھے میری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ آنکھیں کھولو ٹایاب کیا ہوا ہے تجیس"

ٹایاب کو بری طرح جھنجھوڑ والا لگتا اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ رابعہ تھی جسے اس نے اپنی ہانپوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ رابعہ نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو

تھا۔ دشتا" اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

اس روز جب وہ گاؤں سے نکل رہے تھے تو اس نے حویلی کی دوسری منزل کے بھروسے میں کسی نوجوان کو کھڑے دیکھا تھا۔ ایسا حسین اور خوبرو نوجوان اس سے پہلے اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ لیکن وہ کون تھا اور صرف اسے ہی نظریں آیا تھا۔ رابعہ اور ملک سکندر کو دکھائی کیوں نہیں دیا تھا۔ ٹایاب جانتی تھی کہ وہ حویلی خالی تھی۔ وہاں کسی انسان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تو پھر وہ نوجوان کون تھا اور حویلی میں کہاں سے آیا تھا اور صرف اسے ہی دکھائی کیوں دیا تھا۔

رات بیتی جا رہی تھی۔ گھر پر گہرا سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ گلی میں کسی وقت چوکیدار کی سٹی کی آواز سنائی دے جاتی اور اس کے بعد پھر سناٹا طاری ہو جاتا۔

ٹایاب چشم تصور سے اس حسین و خوبرو جوان کو دیکھ رہی تھی۔ ٹایاب نے سرفراز چوہدری سے محبت کی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد بھی وہ اسی کی محبت کو دل میں بسانے ہوئے تھی۔ کسی اور کا خیال بھی کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ سرفراز کے انتقال کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس دوران اسے کئی مرتبہ شادی کی پیشکش ہوئی تھی۔ خاندان سے بھی کئی رشتے آئے تھے۔ ڈیڑی نے بھی چند ایک بار اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن ٹایاب نے بیٹھ ٹال دیا تھا۔ وہ سرفراز کے تصور کے سارے ہی باقی زندگی گزار دینا چاہتی تھی لیکن یہ خوبرو نوجوان ہونٹوں پر دلغری مسکراہٹ سجائے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ ٹایاب اس کے تصوراتی ہونے کو دیکھتے ہوئے دل میں عجیب سی گودگدھی محسوس کر رہی تھی اور پھر اس کی پلکیں بند کر کے بوجھ سے جھٹکتے لگیں۔

نہیں میں بھی اس نوجوان کا حسین تصور ٹایاب کے ذہن پر چھایا رہا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہونٹوں پر بڑی دلغری مسکراہٹ تھی۔ ٹایاب کے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ نوجوان اندر کیسے آیا تھا؟ لیکن ٹایاب کو سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کی نظریں نوجوان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں معنططبی کشش تھی۔ ٹایاب کو کشش کے باوجود اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی تھی۔ اس کے دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان بیٹھ سے چند فٹ کے فاصلے پر

رہی ہو۔ لگتا ہے وہ کوئی بہت ہی اچھا خواب تھا۔“

”ہاں۔“ ٹایاب کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ ”لیکن خواب تو خواب ہی ہوتا ہے۔ حقیقت سے اس کا کیا تعلق؟“

”کون تھا وہ؟“ راجہ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”کون.....؟“ ٹایاب چونک گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

”ذی..... جس سے تم خواب میں پہلی جا رہی تھیں؟“ راجہ سہکرائی۔

”بہت بے شرم ہو۔“ ٹایاب کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ چند لمبے خاموشی رہی پھر بولی۔

”جہیں یاد ہے جب ہم گڈوں سے روانہ ہوئے تھے تو میں نے راستے میں ایک جگہ گاڑی رکوائی تھی۔“

”ہاں..... اور تم بتا رہی تھی کہ حویلی کی دوسری منزل کے جھروکے میں کوئی نوجوان کھڑا ہے۔ لیکن وہ نوجوان مجھے یا سکندر بھائی کو نظر نہیں آیا تھا۔“ راجہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”کیا وہی نوجوان تمہارے خواب میں آگیا تھا۔“

”ہاں وہی تھا۔“ ٹایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ مجھے کیسے لے جا رہا تھا۔“

”اور تم اس کے ساتھ جا رہی تھیں!“ راجہ سہکرائی۔

ٹایاب کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی نظر کھلی ہوئی کوئی کی طرف اٹھ گئی۔ اسے یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے بھی اس نے کوئی کو دیکھا تھا۔ وہ بند تھی اور جب وہ حسین نوجوان اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے لے جا رہا تھا تو کھڑی خود بخود کھلی گئی تھی اور اب بھی وہ کھڑی کھلی ہوئی تھی۔

”یہ کوئی تم نے کھلی تھی؟“ اس نے راجہ سے پوچھا۔

”نہیں۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”جب میں کمرے میں آئی تو کھڑی کھلی ہوئی تھی۔“

”تو پھر۔“ ٹایاب دھجے لمبے میں بولی۔ ”وہ خواب نہیں تھا۔“

”کیا.....؟“ راجہ اچھل پڑی۔

”میں بچ کہہ رہی ہوں۔“ ٹایاب بولی۔ ”رات کو سونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔“

اس کی گرفت سے چڑایا۔

ٹایاب کے دماغ پر نیند کا غبار طاری تھا۔ وہ چند لمبے متوجش سی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی اور پھر اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھر آئے۔

ٹایاب شرمیں نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ نہ وہ عراغیز باجول تھا اور نہ پہنوں کا وہ شہزادہ جو اسے ایک انجانی دنیا کی سرکوانے کے لئے لے گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ سب یکہ وہی تھا۔ ایسٹ کوئی کھلی ہوئی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کس قدر الجھن سی تھرمتی تھی۔ اس کے بیٹے پر راجہ بیٹھی ہوئی تھی جس نے اسے اپنی آغوش میں سیٹ رکھا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پڑی آگئی سے راجہ سے الگ کیا۔ اس کا جسم پیسے سے تر ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو راجہ سے الگ کر کے وہ کمرے کمرے سانس لینے لگی۔

”کیا ہوا تھا ٹایاب۔“ راجہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نیند میں کچھ بڑبا رہی تھیں اور مجھ سے پہلی جا رہی تھیں۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھیں کیا.....؟“

”ہاں..... شاید میں خواب ہی دیکھ رہی تھی۔“ ٹایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن تم میرے کمرے میں کیسے آگئیں۔ کیا میرے بڑباہ کی آواز اتنی اونچی تھی کہ تم جاگ گئیں اور اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں آگئیں؟“

”نہیں۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”سوئے میں کوئی آہٹ سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ آواز باہر سے آئی تھی۔ لیکن میری نیند اجاٹ ہو گئی اور پھر نہانے کیوں مجھے دو سا لگنے لگا۔ سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند نہیں آسکی۔ میں اٹھ کر یہاں آگئی۔ یہ ڈر بھی عجیب چیز ہے۔ بڑے بڑے دل گردے والوں کو سوتا ہے اور پھر میں تو کزور سی لڑکی ہوں۔ ابھی جگہ پر اکیلے میں کچھ زیادہ ہی ڈر گئی۔ یہ سوچ کر آئی تھی کہ تمہارے ساتھ لیٹ کر سوجاؤں گی۔ لیکن.....“

”کیا میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”بھڑا ہوا تھا۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے ساتھ آکر لیٹ گئی۔ لیکن اس وقت شاید تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔ تم نے مجھے اپنی ہانوں میں لپیٹ لیا اور زور سے بچھنے لگیں۔ تم کچھ بڑبا رہی تھیں۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم کوئی خواب دیکھ

طرح پھلے ہوئے دیکھا تھا اس سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بستر پر اس کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا اور جب اس نے ٹاپ کو جگانے کی کوشش کی تھی تو ٹاپ نے اسے بھیج لیا تھا۔ اس سے بھی راجہ پریشان ہوگئی تھی۔

راجہ در تک یہی سوچتی رہی۔ اس نے ٹاپ کی طرف دیکھا۔ سنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔ کیا یہ معصوم لڑکی کسی ہوائی پکر میں پھنس گئی ہے؟ بڑی بوومی عورتیں سن تو یہی کہیں یا دہائی عورتیں ایسا بات سن کر فوراً ہی اس کا یقین کر لیں۔ راجہ بھی دہائی تھی۔ اس نے اگرچہ صرف میزک پاس کیا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ عام دہائی عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے گاؤں میں جو کچھ ہو رہا تھا اور یہاں جو کچھ ہوا تھا، اسے تسلیم کرنے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بعض باتیں ایسی تھیں جنہیں بھلائے نامکن نہیں تھا۔

راجہ نے ایک بار پھر ٹاپ کی طرف دیکھا اور پھر اسے جتنی سورتیں یاد تھیں، پڑھ کر ٹاپ پر اور اپنے آپ پر چھوٹا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح راجہ کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ گھر کی ملازمہ صغریٰ جاگ چکی تھی۔ راجہ کمرے سے نکل کر لان میں آگئی اور پھر ارشاد صاحب کو وہاں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ارشاد صاحب ٹھنم سے ہنسی ہوئی گھاس پر ننگے پیر مشل رہے تھے۔ راجہ کو یہاں آنے ہوئے تین چار دن تو ہو چکے تھے۔ وہ بیٹھ جلدی اٹھ جاتی تھی اور ارشاد صاحب اسے گھاس پر بیٹھنے ہوئے ملنے تھے۔ اس وقت بھی راجہ نے انہیں سلام کیا اور لان کے کنارے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ٹاپ تو ابھی گمری نیند سو رہی ہوگی۔“ ارشاد صاحب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”وہ بیٹھ رات کو دیر تک جاگئے اور صبح دیر تک سوئے رہنے کی عادی ہے۔ یہ بات آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ رات کو جلدی سو جانا اور صبح جلدی اٹھنا صحت کے لئے کتنا مفید ہے۔“

”گاؤں میں تو وہ جلدی اٹھ جایا کرتی تھی۔“ راجہ نے جواب دیا۔

”اگر ایسی بات ہے تو مجھے واقعی حیرت ہے۔“ ارشاد صاحب مسکرائے۔

”دراصل گاؤں کی زندگی شرکی زندگی سے بہت مختلف ہوتی ہے انکل۔“ راجہ نے

یہ کڑی بند تھی اور جب وہ نوجوان مجھے ہاتھ سے پکڑ کر لے جانے لگا تو کڑی خود بخود ہی کھل گئی تھی اور اب بھی کھلی ہوئی ہے۔“

”تمارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ٹاپ!“ راجہ نے اسے ٹھورا۔ ”کڑی میں لوہے کا جنگھ لگا ہوا ہے۔ کوئی اندر کیسے آسکتا ہے۔“

”مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ اندر کیسے آیا تھا لیکن وہ مجھے اس کڑی سے لے گیا تھا اور کسی چپڑے نے ہمارا راستہ نہیں روکا تھا۔“

”ٹاپ!“ راجہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اب تم سے واقعی ڈر لگنے لگا ہے؟“

”کیوں؟ یہی صورت اتنی ڈراؤنی ہوگئی ہے کیا؟“ ٹاپ بولی۔

”نہیں۔ یہ بات نہیں۔“ راجہ نے جواب دیا۔ اس کے لیے میں تشویش تھی۔

”گاؤں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس سے میں واقف ہوں۔ چلو مان لیا کہ وہ کوئی ہوائی چڑ ہے جو تمہاری مدد کر رہی ہے لیکن وہ تادیہ آدمی جو بقتل تمہارے پہلے تمہیں حویلی کے جھروکے میں نظر آیا تھا اور اب وہ تمہاری خواب گاہ میں بھی گھس آیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ کہیں تم پر بھی تو کسی ہوائی چڑ کا اثر نہیں ہو گیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم اس شخص کے ساتھ اس کڑی کے راستے باہر گئی تھی۔ اسے سلاخوں نے تمہارا راستہ نہیں روکا تھا یا تو وہ صرف خواب تھا اور یا۔۔۔“

”کچھ نہیں۔“ ٹاپ نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی۔ ”نہ تو ہمیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجھے کچھ ہوگا۔ چلو۔ اب سو جاؤ اور سنو۔ تم ایسا کوئی خواب مت دیکھنا۔“

ٹاپ بستر پر لیٹ گئی۔ راجہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔ پھر وہ بھی لیٹ گئی۔ ٹاپ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی ہانپوں میں لپیٹ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

راجہ خاموش لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ ٹاپ کے بارے میں اسے واقعی تشویش ہو رہی تھی۔ گاؤں سے نکلے ہوئے کیتھن میں گاڑی رکوا کر ٹاپ نے جب بتایا تھا کہ حویلی کے جھروکے میں کوئی نوجوان کھڑا ہے تو وہ اسے ٹاپ کا واپس ہی سمجھی تھی۔ لیکن خواب گاہ میں اس نوجوان کی آمد کا سن کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے ٹاپ کو بستر پر جس

آئے والے پر اسرار واقعات کے بارے میں بتایا ہے، میری پریشانی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ لیکن کیا رابعہ بیٹی۔۔۔ وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے اور چند لمحوں کے بدلے۔ ”کیا یہ سب کچھ واقعی ہجما ہے؟“

”جی انکل۔۔۔“ رابعہ بولی۔ ”اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ ٹایاب نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔ اس کی ایک مثال تو آپ نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لی۔“

”کوئی مثال؟“ ارشاد صاحب نے پوچھا۔

”کل عدالت جاتے ہوئے ان لوگوں نے ٹایاب پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن تینوں حملہ آوروں کی رائفلیں جام ہو گئی تھیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا انکل۔ آپ کو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ کوئی ناپیدہ قوت ٹایاب کی حفاظت کر رہی ہے۔“ رابعہ نے کہا۔

”یہی بات تو اب مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہے۔“ ارشاد صاحب کے لیے میں تشویش تھی۔ ”وہ ناپیدہ قوت کون ہو سکتی ہے اور وہ ٹایاب کی مدد کیوں کر رہی ہے۔ ٹایاب سے اس کا کیا مفاد وابستہ ہے؟“

”سانپ اور نولے کی لڑائی کے بارے میں آپ کو بتایا تھا نا۔“ رابعہ نے کہا۔ ”وہ سانپ ہی دراصل رابعہ کی مدد کر رہا ہے۔“

”کیا کسی سانپ کے پاس اتنی طاقت ہو سکتی ہے؟ نہیں بیٹی۔“ ارشاد صاحب بولے۔ ”روحوں کے بارے میں اگرچہ میرا یقین نہیں ہے لیکن سنا ضرور ہے۔ ناقابل یقین اور پر اسرار قصے کہانیاں اور اس سے پہلے کہ ٹایاب بھی کسی ایسی ہی پر اسرار کہانی کا کردار بن جائے، میں اس معاملے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اسے یا تو شادی کے لئے ہاں کرنی ہوگی یا میں اسے ملک سے باہر بھیج دوں گا۔ بہر حال، تم اس سے بات ضرور کرنا۔ اچھا بیٹی۔ اب میں دفتر جانے کی تیاری کروں۔ تم بیٹھو تازہ ہوا میں۔“

ارشاد صاحب نے خالی کپ کرسی کے قریب گھاس پر رکھ دیا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

رابعہ کرسی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ ارشاد صاحب ٹایاب کے لئے پریشان تھے اور رابعہ کے خیال میں ٹایاب ایک ایسے پر اسرار پکر میں پھنس چکی تھی جس سے لکھنا اگر ناممکن

جواب دیا۔ ”گاؤں کی صبح تو سورج نکلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر کے تمام لوگ جاگ چکے ہوں، خوب گھما گھمی ہو تو کسی ایک فرد کے لئے سوئے رہتا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہاں تو رات کو بھی لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔ ٹایاب چند روز وہاں رہی تو اس ماحول کی عادی ہو گئی تھی۔ یہاں آکر پھر اس کا معمول بدل گیا ہے۔“

”کوئی مصروفیت نہیں ہے نا۔“ ارشاد صاحب نے کہا۔ ”اسی لئے تو میں نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شادی کرلو۔ تاکہ زندگی کا کوئی راستہ تو متعین ہو سکے لیکن وہ میری بات کسی طرح ماننے کو تیار ہی نہیں اور بیٹی۔۔۔“ وہ رابعہ کے قریب رک گئے۔ ”ان دو چار دنوں میں، میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں آپس میں خاصی بے تکلف ہو۔ ذرا تم ہی اسے ٹھول کر دیکھو کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ اس وقت بھی دو چار ایسے رشتے موجود ہیں۔ اگر وہ ہاں کر دے تو کسی ایک جگہ بات چلائی جائے۔“

”انکل۔۔۔“ رابعہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ ٹایاب اب کبھی شادی کا خیال دل میں لانے گی۔ ویسے میں باتوں ہی باتوں میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”اگر وہ مان جائے تو میرے سرے بڑا بوجھ اتر جائے۔ اور۔۔۔“ وہ صغریٰ کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ ایک رُے میں چائے کے دو کپ لئے برآمدے والے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ ”لو چائے پیو۔“ وہ رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”شیر اور گاؤں کی زندگی میں واقعی بہت فرق ہے۔ گاؤں میں صبح سویرے مٹھنڈی لپی پیتے ہیں تو پینے میں مٹھنڈی سی پڑ جاتی ہے اور یہاں شرم میں چائے سینہ جلا دیتی ہے۔ لیکن ہم بھر بھی چائے پیتے ہیں اور اپنا سینہ جلاتے ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے رابعہ کے قریب ہی ایک اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

صغریٰ انہیں چائے دے کر واپس چلی گئی تھی۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے بھی باتیں کرتے رہے۔ ارشاد صاحب کی باتوں سے رابعہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ٹایاب کے لئے پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ٹایاب شادی کر لے تو ان کے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

”اب کل کا واقعہ تمہارے سامنے ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”اگر یہ شادی کر کے اپنا گھر آباد کر چکی ہوتی تو یہ سب پریشانیوں تو نہ ہوتیں۔ ٹایاب نے جب سے گاؤں میں پیش

بوڑھا سنہری ناگ کا دوسرا روپ ہو سکتا ہے لیکن وہ نوجوان جو صرف ٹایاب ہی کو دکھائی دیتا تھا، راہب کے لئے خطرے کی گھنٹی بن گیا تھا۔ راہب نے ارشاد صاحب سے ٹایاب کے اس ”خواب“ کا تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ خود پریشان ہو گئی تھی۔

”راہب لی۔بی۔“ مغربی کی آواز سن کر راہب کے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آپ کے لئے بھی ناشتہ گا دلوں یا بعد میں کریں گی۔“

”میں ناشتہ ٹایاب کے ساتھ کروں گی۔“ راہب نے جواب دیا۔

مغربی کے جانے کے بعد بھی راہب چند منٹ وہاں بیٹھی رہی۔ اس وقت دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ راہب اٹھ کر اندر آئی۔ ارشاد صاحب ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ راہب نے ٹایاب کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، وہ سو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تو ارشاد صاحب دفتر جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

”راہب بیٹی۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میں نے تم سے جو بات کہی ہے اسے ذہن میں رکھنا۔ ایک دن دن میں یا جب بھی موقع ملے، اس سے بات کر کے دیکھنا۔“

”جی ہمت۔ میں بات کروں گی۔“ راہب نے جواب دیا۔ ارشاد صاحب کے جانے کے بعد راہب ٹایاب کے کمرے میں آگئی۔ ٹایاب کمری نیند سو رہی تھی۔ بال چہرے پر ٹھکڑے ہوئے تھے۔ نیند میں وہ زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ چہرے پر پہ پہاڑ معصومیت تھی۔

ٹایاب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے راہب کی نظر اس کی گردن پر پڑ گئی۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ دوچوگے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ گردن پر تقریباً نصف انچ چوڑی سترے رنگ کی ایک لکیر سی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اشتان چمڑک دی گئی ہو۔

راہب کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ اس نے ٹایاب کی ٹانگوں کی طرف دیکھا جن پر سے ٹانگی سنبھلی ہوئی تھی۔ دونوں ٹانگوں پر بھی ایسی سنہری لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دوبارہ اس کی گردن کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ راہب نے ایک لکیر کو انگلی کی پور سے چھو کر دیکھا۔ انگلی کی پور پر بھی ہلکا سا سترہا پن آیا

نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ بات اگر گاؤں کی پرانی حویلی اور اس بوڑھے تک محدود رہتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن اب وہ پراسرار نوجوان بچ میں ٹھک پڑا تھا اور راہب کے خیال میں وہ نوجوان محض ٹایاب کا تصور نہیں تھا۔ اس نے اس قسم کے سبت سے پراسرار قصے سن رکھے تھے۔ کسی مرد یا عورت کے پراسرار تعلقات کے حوالے سے کئی پراسرار داستانیں شہرت پا چکی تھیں۔ ٹایاب کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی پراسرار نوجوان داخل ہو چکا تھا جو دوسروں کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ نوجوان پہلی مرتبہ ٹایاب کے بیڈ روم میں پہنچ گیا تھا۔ اسے اگرچہ خواب ہی کا جاسکتا تھا لیکن اس خواب کے حوالے سے جو صورت حال سامنے آئی تھی اس سے راہب اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ راہب جانتی تھی کہ ٹایاب جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ رات کو وہ کمرے کی کڑکی بند کر کے سوئی تھی۔ لیکن بعد میں وہ کڑکی کھلی ہوئی ملی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے راہب خود بھی ٹایاب کے بارے میں پریشان ہو رہی تھی۔ وہ پراسرار سنہرا ناگ اسے کھنڈرات کے نیچے ایک سبت پرے خزانے تک لے گیا تھا۔ سانپوں کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر گزرنے کے بعد انہیں کچھ پراسرار قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ اپنا روپ بدلے پر بھی قادر ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناگوں کو زمین میں چھپے ہوئے خزانوں کا بھی علم ہوتا ہے لیکن کسی انسان کے لئے ان خزانوں تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر کوئی انسان کسی طرح کسی دلفینے کا پیہ چلا جائے تو یہی ناگ اس دلفینے کے محافظ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہاں صورت حال قطعی مختلف تھی۔ وہ سنہرا سانپ خود ٹایاب کو اس خزانے تک لے گیا تھا اور ٹایاب اس خزانے میں سے چند ہیرے بھی نکال لائی تھی جن میں سے چند کو فروخت کر دیا گیا تھا۔

یہ بات کبھ میں آئی تھی کہ ٹایاب نے اس سانپ کی جان بچا کر اس پر احسان کیا تھا اور وہ سانپ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ وہ ٹایاب کو نہ صرف اس خزانے تک لے گیا تھا بلکہ اس نے کئی مرتبہ ٹایاب کی جان بھی بچائی تھی۔ چودہری قربان کے گاؤں سے آتے ہوئے جب ملنگی کے آدمیوں نے ان پر حملہ کیا تو اس پراسرار بوڑھے نے ان کی جان بچائی تھی۔ پرانی حویلی کے حوالے سے بھی ایسی کئی باتیں سامنے آئی تھیں۔ اس پراسرار بوڑھے نے کئی مرتبہ ٹایاب کی جان بچائی تھی۔ یہ سوچا جاسکتا تھا کہ وہ پراسرار

”میں ڈیڑی کے ایسے لپکھنے کی عادی ہو چکی ہوں۔“ ٹایاب نے مسکرا کر کہا۔
 ”چچا اب اٹھ جاؤ۔“ رابعہ بولی۔ ”اور یہ دیکھو۔ تمہارے جسم پر یہ نشان کیسے
 ہیں۔“
 ”کیسے نشان؟“ ٹایاب چونک گئی۔

”رات کو سونے سے پہلے کوئی کرم لگائی تھی کیا۔“ رابعہ نے کہا۔
 ”نہیں۔ میں نے تو رات کو کوئی کرم وغیرہ نہیں لگائی تھی۔“ ٹایاب نے تعجب سے
 کہا اور پھر ہاتھ روم کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اپنے بازوؤں وغیرہ پر
 سنہری لکیریں دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی۔ رابعہ بھی اس کے پیچھے ہی ہاتھ روم میں آئی
 تھی۔

ٹایاب کے پورے جسم پر سنہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی رسی کو
 سنہری رنگ میں بھگو کر اسے پورے جسم پر پھیر دیا گیا ہو۔
 ”یہ..... یہ کیا ہے رابعہ.....؟“ ٹایاب ہلکائی۔

”تمہیں معلوم ہوگا۔“ رابعہ بولی۔ ”میں تمہیں جگانے کے لئے میاں بیٹی تو پہلے
 گردن پر یہ نشان نظر آیا تھا۔ میں نے اس نشان کو چھو کر دیکھا۔ یہ دیکھو۔ میری انگلی پر
 بھی سنہری پن آگیا ہے اور بڑی عجیب سی خوشبو ہے اس میں۔“

ٹایاب نے جسم پر ایک نشان کو انگلی سے چھوا اور اسے سوچنے لگی۔
 ”عجیب سی مہک ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”میں نے زندگی میں اتنی عطر انگیز خوشبو کبھی
 نہیں سونگھی۔ لیکن..... میرے جسم پر یہ نشان کیسے لگے۔“
 ”ٹایاب۔“ رابعہ بولی۔ ”رات کو وہ نوجوان خواب میں تمہارے کمرے میں آیا تھا۔
 کیا وہ.....“

”میں کچھ نہیں جانتی رابعہ۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے لیے میں
 تشریش نمایاں تھی۔ ”وہ خواب تھا یا حقیقت..... مجھے اب کچھ احساس نہیں لیکن..... سکلی
 ہوئی کھڑکی اور جسم پر یہ نشان اب مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ..... وہ
 نوجوان.....“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ نوجوان مجھ
 سے لپٹ رہا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے جسم میں جیسے ہڈی نہ ہو۔ عجیب لچلچلا

تھا۔ وہ چند لمے انگلی کو دیکھتی رہی پھر اسے ناگ کے قریب لاکر سونگھا۔ بڑی عجیب سی مسور
 کن اور بھینٹی بھینٹی سی مہک تھی۔ ایسی خوشبو اس نے پہلے بھی نہیں سونگھی تھی۔
 اس کی انگلی کے لمس سے ٹایاب ذرا سی کسمائی تھی۔ رابعہ کے ذہن میں عجیب
 سے خیالات آرہے تھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ شاید رات کو سونے سے پہلے ٹایاب نے
 جسم پر کوئی خوشبو لگائی تھی۔ یہ شہر کی عورتیں بھی اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کے لئے
 عجیب و غریب چیزیں استعمال کرتی ہیں۔ اس نے ٹایاب کی ڈریسنگ ٹیبل پر بھی ایسی درجنوں
 چیزیں دیکھی تھیں۔ کئی طرح کی کربیں اور کئی طرح کے اسپرے تھے۔ وہ سوچتا ہے رات کو
 سونے سے پہلے اس نے ایسا کوئی اسپرے لگایا ہو۔ لیکن پھر یہ خیال اس نے ذہن سے بھٹک
 دیا۔ کوئی اسپرے ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح اپنا نشان چھوڑ دے۔

دھنٹا۔ ایک اور خیال رابعہ کے ذہن میں ابھرا۔ رات کو جب وہ ٹایاب کے بستر پر
 آئی تھی اس نے ٹایاب کو عجیب سے انداز میں چھلتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر وہ اس سے لپٹ
 گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی رابعہ کانپ اٹھی۔

”ٹایاب۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ٹایاب اٹھ جاؤ
 اب۔ نوب رے ہیں۔“
 ”کیا ہے بھئی۔ سونے دو نا۔“ ٹایاب کسمائی۔

”نوب کونے ہیں۔ اب اٹھ جاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتے کے لئے میں تمہارا
 انتظار کر رہی ہوں۔“ رابعہ نے کہا۔

ٹایاب نے ایک دو مرتبہ کسماکر آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر رابعہ کی طرف
 دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے کھینچے ہوئے تھے۔ اس نے اٹھاتے ہوئے اپنا
 سر رابعہ کی گود میں رکھ دیا۔

”آج صبح سی صبح اگلے تمہارے حوالے سے مجھے لپکھو دے کر گئے ہیں۔“ رابعہ نے
 اس کے بالوں میں انگلیاں پیچرتے ہوئے کہا۔

”کیسا لپکھ؟“ ٹایاب نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں کہ رات کو جلدی سونا
 اور صبح جلدی اٹھنا صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ لیکن تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔
 تم رات کو دیر تک سوئی اور صبح دیر تک سوئی رہتی ہو۔“ رابعہ نے کہا۔

ناشتے کے بعد وہ ٹایاب والے کمرے میں آگئیں۔ ٹایاب بیڑ کی پٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی اور راجہ نے اس کے سامنے کرسی منبعلی لی تھی۔

”بڑی عجیب بات ہے راجہ۔“ ٹایاب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے سنری ہانگ کے بارے میں بات کی تھی۔ میں نے اس پتلو پر بھی سوچا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ رات کو میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا لیکن میں نے کہا تھا کہ وہ خواب نہیں تھا اور میں اب بھی کہتی ہوں کہ میں کوئی خواب نہیں تھا۔“

”تو کیا وہ پر اسرار نوجوان.....“

”ہاں۔“ ٹایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ انسان نہیں، سنری ہانگ تھا۔ میرے جسم پر سنری لکیریں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ”بات تو شرم کی ہے مگر میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ گاؤں سے آتے ہوئے میں نے حوٹلی کے جھروکے میں جس نوجوان کو دیکھا تھا وہ بے حد حسین اور خوبصورت تھا۔ تم اس کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر دیکھ لیتیں تو تمہاری کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔ بہر حال، اسے دیکھنے کے بعد میں ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ کوشش کے باوجود ایک لمحہ کو بھی اس کا خیال ذہن سے نہ نکال سکی۔“

گزشتہ رات میں مری نیند میں تھی کہ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں نے اس نوجوان کو اپنے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ تھی۔ وہ میرے قریب آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھالیا۔ ہم دونوں ہوا میں معلق تھے۔ کھڑکی خود بخود کھل گئی اور وہ مجھے ساتھ لے کر کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں پادلوں میں تیرتے رہے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں اس سے پشیم گئی اور پھر ہم زمین پر اتر آئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا لیکن میں ان لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور پھر تم نے مجھے جگا دیا۔ آنکھ کھل جانے کے بعد بھی میں دیر تک اسی تصور میں مگم رہی۔ اب اپنے جسم پر ان سنری لکیروں کو دیکھنے کے بعد مجھے یاد آ رہا ہے

”ہاں!“ راجہ چونک گئی۔ وہ چند لمحے گھورتی ہوئی لگاؤں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”تمہارے بیان پر یہ سنری لکیریں اور وہ سنرا ناگ.....“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

”نہیں راجہ۔“ ٹایاب جلدی سے بولی۔ ”مجھے اس طرح مت ڈراؤ۔“

”ڈر تو ہمیں لگ رہا ہے۔“ راجہ بولی۔ ”تم اس دلدل میں دھنسی جا رہی ہو۔ میرا خیال ہے اب بھی موقع ہے ٹایاب..... پیچھا چھڑا لو ان چیزوں سے۔ ورنہ آگے چل کر یہ تمہارے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

ٹایاب کی آنکھوں میں اور چہرے پر تشویش کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

”ٹیک ہے۔ تم باہر نکلو۔ میں ناکر آتی ہوں۔ پھر بات کریں گے۔“

راجہ ہاتھ روم سے باہر آگئی۔ ٹایاب کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کیا وہ حسین و خوبصورت نوجوان دراصل سنری ہانگ ہی تھا جو اس کے جسم پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ ٹایاب کانپ اٹھی۔ وہ اس سے آگے نہیں سوچ سکتی تھی۔ اس کا دماغ سٹپ لگا۔ اس نے شاور کھول دیا۔

وہ دیر تک شاور کے نیچے کھڑی رہی اور جب اس نے دوبارہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو جسم پر سے وہ سنری نشان غائب ہو چکے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہاتھ روم سے نکل اور تیار ہو کر کمرے سے باہر آگئی۔ وہ عام طور پر نہانے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتے لگتی تھی لیکن آج اس کا دماغ بو بھل سا ہو رہا تھا۔ اسے بار بار یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے جسم پر کوئی سانپ رینگ رہا ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ کیفیت بتدریج ختم ہوئی چلی گئی اور وہ اپنے آپ کو پرسکون سا محسوس کرنے لگی۔

راجہ بھی اپنے کمرے سے آگئی تھی۔ مغز نے ان دونوں کے لئے ناشتہ لگا دیا اور وہ دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگیں۔ دونوں کن آنکھیں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ لیکن زبان کسی نے نہیں کھولی تھی۔

چوہدریوں کے ہاتھ نقصان اٹھانا پڑا ہے اور پھر میں چوہدری سعادت کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس کی کمائی شروع ہو چکی ہے اور اگر اسے پابند پھیل تک نہ پہنچایا گیا تو وہ ایسے غریب اور معصوم لوگوں پر پہلے سے زیادہ ظلم ڈھائے گا۔“

”دوسروں کی بھلائی سوچتے ہوئے تم اپنا نقصان کر بیٹھو گی۔“ رابعہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”بھول جاؤ سب کچھ۔ گاؤں دیہاتوں میں تو یہ سب کچھ صدیوں سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ تم ایسی ظلم کی ان داستانوں کو ختم نہیں کر سکتیں۔ ظلم سستا تو نہیں کا مقدر بن چکا ہے اور مقدر کو بدلائیں جاسکتا۔“

”میاں میں تم سے اختلاف کروں گی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”مقدر بنانا انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ ظلم تو وہ سیلاب ہے جس کے آگے اگر بند نہ بنادھا جائے تو وہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ میں ساری دنیا سے ظلم کو خاتمہ نہیں کر سکتی لیکن کم از کم ایک ایسی مثال قائم ہو جائے تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔“

”تو گویا تم گاؤں ضرور جاؤ گی۔“ رابعہ نے اسے گھورا۔

”ہاں۔“ میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہے۔“ ثایاب نے کہا۔ ”تم یہ بھول رہی ہو کہ وہاں بہت برا خزانہ بھی موجود ہے اور مجھے اس خزانے کو کام میں لانا ہے۔“

”بہت مشکل ہے۔“ رابعہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”کیسا مشکل ہے؟“ ثایاب پوچھی۔

”تمہارا ان پر اسرار قوتوں سے نجات حاصل کرنا۔“ رابعہ نے جواب دیا۔ ”وہ خزانہ ان کھنڈرات کے نیچے ہے جہاں سترے ناگ کا بھی ڈیرا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس سے الگ رکھ سکو گی؟“

”کوشش کروں گی کہ ان معاملات میں اب زیادہ دلچسپی نہ لوں۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ ”مقدسے کا فیصلہ ہونے کے بعد زمین حاصل کرنے کے بعد غریب کسانوں میں بانٹنی ہے۔ اور سکندر بھائی سے مل کر وہ خزانہ وہاں سے نکالنا ہے۔ اس کے بعد میرا اس سترے ناگ سے تعلق ختم ہو جائے گا۔“

”اور اگر اس دردان کچھ ہو گیا تو؟“ رابعہ نے اسے گھورا۔

”کوشش کروں گی کہ کوئی ایسی بات نہ ہوئے پائے۔“ ثایاب نے جواب دیا۔ وہ مزید

کہ وہ بار بار مجھ سے پلٹتا رہا تھا لیکن اس کے جسم میں ایک عجیب سی زہانت اور گداز پن تھا۔ جیسے اس کے جسم میں ہڈی نہ ہو اور سانپ.....“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آتے تھے۔ ”سانپ کے جسم میں بھی ہڈی نہیں ہوتی..... یہ..... سب کیا ہے رابعہ..... پہلے میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن رات کے تجربے کے بعد مجھے خوف آنے لگا ہے۔ کیا وہ سترنا ناگ ہی اس پر اسرار نوجوان کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا؟“

”تمہارے جسم پر ستری نشان تو یہی ثابت کرتے ہیں۔“ رابعہ نے کہا۔ ”اب تک گاؤں میں اور میاں جو سی واقعات پیش آئے ہیں ان سے تو اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ سترنا سانپ پر اسرار قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ہر روپ اپنا سکتا ہے۔ اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ پر اسرار بوڑھا بھی وہی سترنا ناگ ہے جو ہر قدم پر تمہاری مدد کرتا رہا ہے اور یہ حسین نوجوان وہی سانپ ہے جو بند کرے میں تمہارے پاس آگیا اور تمہیں ساتھ لے کر کھڑکی کی سلاخوں سے باہر چلا گیا۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ تمہیں ساتھ لے کر اس کمرے سے باہر گیا تھا اور تم اسی کمرے میں موجود تھیں۔ ہاں ثایاب! ایسے کام تو کوئی پر اسرار قوت ہی کر سکتی ہے اور وہ سترنا ناگ پر اسرار قوتوں کا مالک ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے پوچھی۔ ”اب تو وہ تمہارا دوست ہے۔ تمہارا محافظ ہے۔ لیکن ایسی پر اسرار چیزوں کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کل وہ تمہاری کسی حرکت پر ناراض ہو گیا تو تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ وہ مثل تو بہت مشہور ہے کہ سانپ کو دودھ پلاتے رہو تو بھی وہ ڈسنے سے باز نہیں آتا۔“

”مقدسے کا فیصلہ ہونے میں ایک مہینہ باقی ہے۔“

رابعہ نے کہا۔ ”اور اگر مقدسے کا فیصلہ ہو گیا تو تم یقیناً گاؤں بھی جاؤ گی اپنی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے اور وہ ناگ، ناگ مہاراج بھی وہیں رہتے ہیں۔ اگر پھر سے کوئی پتھر چل گیا تو....“

”گاؤں تو مجھے جانا ہی پڑے گا اور پتھر بھی چل ہی رہا ہے۔“ ثایاب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ اگر مقدسے کا فیصلہ میرے حق میں ہوا اور زمین مجھے مل گئی تو میں اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ ان غریب کسانوں میں تقسیم کروں گی۔ جنہیں

وہ کمرے میں آکر رابعہ کو ڈی ایئر پی سے ہونے والی مہنگو کے بارے میں بتانے لگی۔

”کیا نام بتایا ہے اس نے؟“ رابعہ نے پوچھا۔

”گامی۔“ رابعہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”گاؤں میں تو اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے چوہدری کے ڈیرے میں کوئی آدمی رہتا ہو۔ اس نے ڈیرے پر بھی تو بہت سے آدمی رکھے ہوئے ہیں جن کا گاؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”جمل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہ ڈیرے پر بھی رہتا ہے تو گاؤں میں اس کی آمد و رفت تو ہوگی۔ ہو سکتا ہے کبھی تسماری نظروں میں آیا ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ چلو۔“ رابعہ کرسی سے اٹھ گئی۔

”بھرنے تو دل لو۔ میں بھی ذرا تیار ہو لوں۔ بازار میں کچھ شاپنگ بھی کر لیں گے۔“

رابعہ نے کہا۔

رابعہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ بند کر کے تیار ہونے لگی اور پھر تقریباً چالیس منٹ بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں۔ پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر جمال ان کا خیر تھا۔

”آپ کو جو زحمت ہو رہی ہے اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔“ انسپکٹر جمال نے کہا۔ ”عوام اگر پولیس سے تعاون کریں تو جرائم میں نمایاں کمی ہو سکتی ہے۔“

”عوام تو پولیس سے تعاون کرنے کو تیار رہتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات نہیں بلکہ اکثر قانون کی مدد کرنے والوں کو ہی دھریا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ سامنے آنے سے کتراتے ہیں۔“ رابعہ نے کہا۔

”آپ بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“ انسپکٹر جمال نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”غلطیاں کچھ ہماری بھی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پولیس میں آنے کے بعد بعض لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ قانون کے محافظ نہیں، مالک بن گئے ہیں۔ وہ اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس کا غیازہ پورے محکمہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بہر حال، میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آئیے۔ ایک نظر ان دونوں کو دیکھ لیں۔“

کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ مغربی میں دروازے میں آکر کسی کی فون کال کی اطلاع دی۔ رابعہ نے اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔

ٹیلی فون کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ ڈی ایئر پی کی کال تھی۔

”مس ٹایاب۔“ ڈی ایئر پی نے اس کی ہیلو کے جواب میں کہا۔ ”آج صبح سویرے پولیس نے چھاپہ مار کر دو آدمیوں کو حراست میں لے لیا ہے جنہوں نے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ وہ اس بارانی میں شامل تھے جس نے کل آپ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کون ہیں وہ لوگ؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”ان میں ایک تو ای شر کا قہر ڈرٹ غنڈہ ہے اور دوسرا کوئی دیہاتی ہے جو اپنا نام گامی بتاتا ہے۔ ابھی ان سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے کس کے کہنے پر آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر آپ اسے شناخت کر لیتیں تو پولیس کو اپنی تحقیق میں آسانی ہو جائے گی۔“

”میں اسے کیسے شناخت کر سکتی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ وہ کون ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”جو آدمی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا اسے آپ کی دوست نے شناخت کر لیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے بھی پہچانتی ہوں۔ اس لئے اگر آپ مناسب تبصیریں تو۔“

”ٹھیک ہے۔ انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں۔ انسپکٹر جمال وہاں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ ڈی ایئر پی نے کہا۔

”میں ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتی ہوں۔ لیکن میں نے اپنی کوٹھی کی آتش زدگی کے سلسلے میں جس شخص کے بارے میں بتایا تھا اس کا آپ نے کیا کیا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”پولیس ہاسٹل آج صبح نور پور کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ کل شام تک وہ لوگ ملزم کو یہاں لے آئیں گے۔“ ڈی ایئر پی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ایک گھنٹے میں پولیس اسٹیشن پہنچ رہی ہوں۔“ ٹایاب نے کہنے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

وہ دفتر والے کمرے سے باہر آگئے۔ عمارت کے دائیں طرف راہداری میں حوالات تھا۔ تین کونگیاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخوں والے دروازے لگے ہوئے تھے۔ پہلی کوفری میں تین آدمی تھے۔ ان میں ایک تو اوجیز تھا اور دو کی عمریں بیس سے پچیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ وہ تینوں صورتوں ہی سے جرائم پیشہ لگتے تھے۔ اس سے آگے والی کوفری میں دو آدمی تھے۔ ایک فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور دوسرا دیوار سے ٹیک لگائے ٹانگیں پیارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شکل ہی سے چمٹا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔

وہ تینوں اسی کوفری کے سامنے رک گیا۔ انسپکٹر جمال نے ٹایپ اور راجہ کی طرف دیکھا۔ ان دونوں نے نفی میں سر ہلادیا۔
 ”اس کو اٹھاؤ.....“ انسپکٹر جمال نے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے بد معاش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے فرش پر لیٹے ہوئے شخص کو جھنجھوڑ دیا۔
 ”اٹھ اؤ۔“ باپ کا گھر سمجھ کر سو رہا ہے۔ پتہ نہیں تجھے یہ مقام ہے۔ اٹھ۔
 جلدی کر.....“

وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجہ کے لئے تو وہ چہرہ اچھی تھا لیکن ٹایپ اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ چہرہ اسے جانا پہچانا سا لگا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

انسپکٹر جمال نے گردن گھما کر راجہ اور ٹایپ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے تو نفی میں سر ہلادیا لیکن ٹایپ کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔
 ”لگتا ہے آپ اس شخص کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔“ انسپکٹر جمال نے ٹایپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ذرا سوچتے دیں کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔“
 ٹایپ نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد وہ اچھل پڑی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس شخص کو کہاں دیکھا تھا۔

کئی روز پہلے جب وہ کھیتوں میں اپنے اوپر فائرنگ ہونے کے بعد نور پور تھانے گئی

تھی تو اس شخص کو اس نے تھانے میں دیکھا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شخص کو کس جرم میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی پٹائی ہو رہی تھی اور ٹایپ نے اب اسے پہچان لیا تھا۔

”ہاں۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔“ ٹایپ نے انسپکٹر جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے میں نے نور پور تھانے میں دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں اسے کس جرم میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔ آپ اس کے بارے میں نور پور پولیس سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ویسے ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔ جس طرح پولیس مقابلے میں مارا جائے والا رمضان ثانی وہ شخص چوہدری سعادت کا کارندہ تھا، اس کا بھی چوہدری سعادت سے کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ اسی نے اس کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم معلوم کر لیں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لئے میں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر جمال نے کہا۔
 وہ دفتر میں آکر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر جمال نے ان کے لئے چائے منگوا لی۔ چائے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں اور پھر ٹایپ اور راجہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن سے باہر آگئیں۔

ٹایپ تقریباً ”آٹھ بجے تک گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتی رہی پھر اس نے گاڑی ایک شاہنگ ایریا میں روک لی اور الٹنی بند کر دیا وہ دونوں گاڑی سے اتر آئیں۔ ٹایپ نے دروازہ لاک کر دیا اور پھر وہ دونوں مختلف دکانوں میں گھومنے لگیں۔
 وہ تقریباً ”تین گھنٹوں تک شاہنگ کرتی رہیں۔ ٹایپ نے اپنے اور راجہ کے علاوہ کپڑوں کے چند جوڑے اور بھی خریدے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں خریدی گئی تھیں۔

جب وہ گھر پہنچیں تو تین بج رہے تھے۔ بھوک سے دونوں کی بری حالت ہو رہی تھی۔ صغریٰ نے ان کے لئے کھانا لگا دیا اور وہ دونوں اس طرح کھانے پر نوٹ پڑیں جیسے کئی دن کی بھوکی ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں راجہ والے کمرے میں آگئیں۔ ادھر پٹنگ پر بیٹھے باتیں کرتے کرتے دونوں پر غصہ کی سی غباری ہو گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں پٹنگ پر

کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ریاض چیخے بیٹھ گیا۔ اس کا چھوٹا ماسوٹ کیس ڈگی میں رکھ دیا گیا تھا۔

چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا۔ ٹایاب پوری تیاری کر کے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ شہر کی حدود سے نکل کر پائی دے پر آتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ کشادہ پائی دے پر اگرچہ یہی ٹریفک کی بھربار تھی لیکن ٹایاب کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب اس نے ایک چھوٹی سی بسٹی کے قریب گاڑی روک لی۔ یہاں چند دکانیں تھیں۔ اور تین چار ہوٹل تھے۔ بیس اور ٹرک وغیرہ عام طور پر یہاں رک جایا کرتے تھے۔ اس اڑے کے قریب ہی ایک منہر بھی تھی۔ دو ہوٹل منہر کی طرف تھے۔ ٹائیبل کے درختوں کے نیچے چارپائیاں بھی بچھی ہوئی تھیں اور میزیں کرسیاں بھی۔

ٹایاب نے گاڑی منہر کے کنارے ایک درخت کے نیچے روک لی اور وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ چارپائیوں اور میزوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ ان بسوں کے مسافر تھے جو یہاں رکی ہوئی تھیں۔ دیہر کے کھانے کے وقت دونوں طرف سے آنے والی بیس یہاں رک جایا کرتی تھیں اور ہوٹل والوں کی چاندی ہو جاتی تھی۔

ٹایاب وغیرہ بھی ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی میٹلے کپیلے لباس میں ہونٹ کا ملازم لڑکا ان کے پاس آیا۔ ٹایاب نے کھانا لانے کے لئے کمر دیا۔ کھانے کے بعد بھی وہ ہیں بچتیں منٹ تک یہاں رکے رہے۔ پھر آگے روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

”میڈم آپ ڈرائیونگ کرتے ہوئے تھک گئی ہوئی گی۔ آپ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیے۔ میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“ ریاض نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے بھی تھوڑا سا رستہ مل جائے گا۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔
ٹایاب اور راہبہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور ریاض نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور اس طرح ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

نور پور اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کا راستہ تھا۔ نور پور سے چھ سات میل پہلے ہی انہیں گاڑوں کی طرف جانے والے راستے پر مڑ جانا تھا۔ ریاض بڑی

آڑی ترجمی پڑی خراٹے لے رہی تھیں۔

ٹایاب گاڑوں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے آرکیٹیکٹ سے راہبہ کے مکان کا نقشہ بھی لے لیا تھا اور اس کا ایک اسسٹنٹ ریاض بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار تھا تاکہ مکان کی تعمیر شروع کرنے کے انتظامات کا جائزہ لے سکے۔

پولیس پائی نور پور سے ملنے کو لے کر آئی تھی۔ نرسن کی کوٹھی کے چوکیدار نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو اس رات ٹایاب کی کوٹھی کے سامنے سب سے پہلے کار سے اتر ا تھا اور پھر وہ لوگ کوٹھی کو آگ لگا کر فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے تھے۔ پولیس اس نے اس کے خلاف کیس درج کر لیا تھا۔ نور پور میں بھی ملنے کے خلاف قتل اور دیگر سنگین جرائم کے تحت کئی مقدمات درج تھے۔ اس لئے ملنے کو دوبارہ نور پور پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

اس مرتبہ ٹایاب نے نرسن یا بس پر سفر کرنے کے بجائے اپنی گاڑی پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارشاد صاحب نے ٹایاب سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ گاڑوں میں چند روز سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ راہبہ کو زیادہ پریشان تھی۔ اس نے دپے لفظوں میں ٹایاب کے گاڑوں جانے کی مخالفت کی تھی لیکن ٹایاب نہیں مانتی تھی۔

”تم پریشان مت ہو میری بنو۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنا خیال رکھوں گی۔“

”ایک بات ذہن میں رکھ لو ٹایاب!“ راہبہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں دو چار روز سے زیادہ وہاں نہیں سکتے دوں گی۔ یا تو تمہیں زبردستی واپس بھیج دوں گی یا خود لے کر آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری یہ بات ذہن میں رکھوں گی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر اگلے روز صبح ٹھیک چھ بجے وہ کوٹھی سے روانہ ہو گئیں۔ ریاض کا گھر راستے ہی میں تھا۔ وہ تقریباً ”پندرہ منٹ بعد وہاں پہنچ گئیں۔ ریاض بھی تیار ہی تھا۔ راہبہ ٹایاب

رابرہ کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ موت ان کے بہت قریب سے گزری تھی اور ان کا خوفزدہ ہونا فطری بات تھی۔

”پھوٹی لی بی۔“ کار کے قریب کھڑے ہوئے گاؤں کے خیردین نائی شخص نے کہا۔

”آپ لوگ ٹھیک ہیں نا؟ کوئی چٹ تو نہیں لگی۔“

”ہاں ہم ٹھیک ہیں۔“ ٹایاب نے ٹھکڑی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کار کے قریب کھڑے ہوئے کچھ اور لوگ بھی ان کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ دیے ان سب کو حیرت اس بات پر تھی کہ ٹرک اور کار میں تصادم کیوں نہیں ہوا تھا۔ ٹرک کے ساتھ ساتھ آنے والی بس کے مسافروں نے تو یہ دلچسپ منظر بھی دیکھا تھا کہ کار کے قریب پہنچ کر ٹرک ہوا میں اٹھ گیا تھا اور کار کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا کر گرنا تھا۔ ان لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ٹایاب نے مڑ کر معنی خیز نگاہوں سے رابرہ کی طرف دیکھا۔ ان کے مرے میں کوئی سر نہیں رہ گئی تھی لیکن ٹرک اس طرح اڑتا ہوا کار کے اوپر سے گزر گیا تھا جیسے اس کے پر نکل آئے ہوں۔ ان دونوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ اسی ناپیدہ قوت کا کام تھا جو پہلے بھی ٹایاب کو حادثات سے بچاتی رہی ہے۔

”حیرت انگیز اور ناقابل یقین۔“ ربابؔ کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔ ”میں نے تو کبھی پڑھ لیا تھا۔ لیکن وہ ٹرک کار سے ٹکرانے کی بجائے ہوا میں اڑتا ہوا اوپر سے گزر گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”ابھی ہمارا وقت نہیں آیا تھا ربابؔ صاحب! دیے گاؤں میں رہتے ہوئے کلمہ پڑھنے کے بہت سے مواقع آئیں گے اور بہت سی ایسی باتیں ہوں گی جن پر آپ یقین نہیں کریں گے۔“ رابرہ نے کہا اور پھر ٹایاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”یہاں تو جمع لگ گیا ہے ٹایاب! ٹرک بند ہو رہا ہے۔ گاڑی راستے سے ہٹاؤ۔“

ٹایاب نے انجین اسٹارٹ کر دیا اور ہمارا بنجانے لگی۔ لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ ٹایاب نے گاڑی کو سڑک سے انار کر دکاؤں کے سامنے روک کر انجین بند کر دیا اور ربابؔ کو اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر آئی۔ رابرہ کار ہی میں بیٹھی رہی تھی۔

کچھ لوگ ابھی کار کے قریب آ کر اسے چاروں طرف سے دیکھ رہے تھے اور کچھ

ریاض اور بچھلی سیٹ پر بیٹھی رابرہ بھی بیٹھی بیٹھی ہی نظروں سے اس ٹرک کو اوپر اٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ٹرک کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے اس نے گاڑی سے ٹکرانے کا ارادہ ترک کر دیا ہو اور ہائی سپ لگا کر گاڑی کے اوپر سے گزر جانا چاہتا ہو۔

ٹرک ان کے سامنے گاڑی کے اوپر سے اڑتا ہوا گزر گیا اور پھر ایک زور دار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ان تینوں نے نیک وقت مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ٹرک بالکل سیدھا پیسوں کے بل سڑک پر گرا تھا وہ دو تین مرتبہ اچھلا اور پھر اٹ گیا اور دو قلاباڑیاں کھا کر سڑک سے چند فٹ دور ایک کھیت میں اس طرح گرا کہ اس کے پٹے اوپر کی طرف تھے۔ ٹرک میں اناج کی بوریاں بھری ہوئی تھیں جو ٹکڑ ٹکڑ تھیں۔

سڑک کے سوز کے قریب ہی دو تین پھوٹی دکائیں تھیں۔ ان دکاؤں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اور سڑک پر سے گزرتی ہوئی بسوں اور دیگر سواروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے یہ حیرت انگیز اور خوفناک منظر دیکھا تھا۔ کئی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ دکاؤں پر بیٹھے ہوئے لوگ ٹایاب کی کار کی طرف دوڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کار کبھی مٹی ہوگی اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی قید بن گئے ہوں گے۔ لیکن کار اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی ٹایاب وغیرہ کو دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ٹرک کار سے ٹکرا کر اوپر سے قلاباڑی کھاتے ہوئے دوسری طرف سڑک پر گرا تھا لیکن نہ تو کار کو کوئی گزند پہنچی تھی اور نہ ہی اس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو۔

دوبیس بھی رک گئی تھیں۔ مسافر اتر کر کار کی طرف دوڑے۔ پھر کار اور اس کے مسافروں کو محفوظ دیکھ کر کھیت میں اٹلے ہوئے ٹرک کی طرف دوڑے۔ ڈھمی ڈرائیور اور کلینر کو بوروں کے پیچھے سے نکالا گیا۔

بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ دونوں طرف کا ٹریفک رک گیا تھا۔ دکان پر بیٹھے ہوئے دو آدمی کار کی طرف بھی دوڑے تھے۔ وہ دونوں اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ٹایاب اور رابرہ کو پہچان لیا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتا رہے تھے کہ اس کار میں پھوٹی لی بی اور رابرہ بیٹھی ہوئی ہیں۔

ٹایاب اور رابرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ریاض کی طرف دیکھنے لگیں۔ ریاض کے چہرے پر اب بھی خوف و وحشت کے تاثرات نمایاں تھے۔ ٹایاب اور

آفیسر ہیں۔ راستے سے ہٹ جائیے ورنہ گاڑی اوپر چڑھا دوں گی۔“
 ”یہ خاتون ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ وہ بھی اسی بس کا مسافر تھا جس میں وہ پولیس آفیسر سڑک پر تھا۔ وہ پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”میں بھی اس حادثے کا چشم دید گواہ ہوں۔ وہ ٹرک خود بخود ہوا میں اچھل گیا تھا۔ یہ کس طرح ہوا لیکن ہر حال اچھا ہی ہوا۔ اگر ٹرک ہو جاتی تو کار اور اس میں بیٹھے ہوئے ان تینوں افراد کا قیہ بن چکا ہوتا۔ اس خاتون پر حادثے کی ذمہ داری کس طرح بھی عائد نہیں کی جاسکتی۔ آپ بلادچ بات کو ابھانے کی کوشش نہ کریں جنتاب!“
 ”ارے بھی۔ ان کا تعلق پولیس سے ہے۔ یہ چاہے ڈیوٹی پر ہوں یا چھٹی پر۔ ہر معاملے میں ٹانگ تو اڑانی ہی پڑتی ہے نا ان لوگوں کو۔“ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

وہ پولیس آفیسر اسے گھور کر رہ گیا۔ کچھ اور آدمی بھی بولنے لگے تھے۔ اس پولیس آفیسر کو بالکل نخواستہ کار کے سامنے سے ہٹا دیا۔
 ”دیسے میں اس قریبی گاؤں میں رہتی ہوں۔“ ٹیاب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ دکان والے مجھے جانتے ہیں اور نور پور کے پولیس آفیسر بھی میرے نام سے واقف ہیں۔ اگر پولیس یہاں آجائے تو یہ دکان والے انہیں میرا نام اور پتہ بتا دیں گے۔“
 ”آہو جی۔ ہم چھوٹی لی لی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ تھانے کے سپاہی آئیں گے تو ہم انہیں بتا دیں گے۔“ خیر دی نے آگے بڑھ کر کہا۔

ٹیاب نے گاڑی آگے بڑھا دی اور پھر دکانوں کے قریب پہنچ کر اسے گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔
 ”یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔“ ریاض نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ وہ ٹرک ہوا میں کس طرح اٹھ گیا تھا۔“

”ریاض صاحب! راجہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔“ آپ چند روز یہاں رہیں گے تو بہت سے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعات دیکھیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ حیران ہوتے ہوئے پریشان نہ ہو جائیں۔“
 ”کیا یہ کوئی طلسمی دنیا ہے؟“ ریاض بولا۔

لوگ کھیت میں اٹلے ہوئے ٹرک کے قریب جمع تھے۔ ڈھمی ڈرائیور اور کینز کو ایک کار میں ڈال کر نور پور بھیج دیا گیا تھا۔
 ٹیاب بڑی گہری نظروں سے صورتحال کا جائزہ لے رہی تھی۔ جن لوگوں نے ٹرک کو کار کے اوپر سے اچھٹے ہوئے دیکھا تھا وہ ٹیاب اور قریب کھڑے ہوئے ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے چہ بیگوئیاں کر رہے تھے۔

ٹیاب کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر اپنی کار کے پاس آگئی۔ اس نے کار میں بیٹھ کر انجن اشارت کیا یہ تھا کہ ایک اویسر عمر آدمی کار کے سامنے آگیا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس شخص کے چہرے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے۔ ٹیاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بارن بجا دیا۔

”ہیلو۔ آپ سامنے سے تو ہٹ جائیے۔“ ٹیاب نے کھڑکی سے گردن نکال کر اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ بارن بجانے کے باوجود وہ سامنے سے نہیں ہٹا تھا۔
 ”محترمہ! آپ پولیس کے آنے سے پہلے نہیں جاسکتیں۔ زمینوں کے ساتھ ایک آدمی گیا ہے۔ وہ پولیس کو اطلاع دیدے گا۔ پولیس کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ نور پور کا یہاں سے فاصلہ ہی کتنا ہے۔ صرف چھ سات میل!“

”آپ کون ہیں اور پولیس کے آنے تک مجھے کیوں روکنا چاہتے ہیں۔“ ٹیاب نے اس شخص کو گھورا۔

”میں شاہ پور پولیس کا سب انسپکٹر ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہ حادثہ آپ کی وجہ سے پیش آیا ہے اس لیے آپ کو پولیس کے آنے تک روکنا پڑے گا۔“
 ”کیا آپ نے یہ حادثہ ہوتے دیکھا تھا؟“ ٹیاب نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میں اس بس میں تھا اور بس کے دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی اس حادثے کا چشم دید گواہ ہوں۔“

”تو گویا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس ٹرک کو اٹھا کر کار کے اوپر سے پھینکا تھا۔ آپ نے یہ تو نہیں دیکھا ہو گا کہ وہ ٹرک کس قدر تیز رفتاری سے بس کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ ٹرک ہماری گاڑی سے ٹکرا جاتا تو جانتے ہیں ہمارا کیا شہر ہوتا۔“ ٹیاب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ واقعی ذمہ دار اور فرض شناس پولیس

ملک صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے لیکن پانچ منٹ بعد سکندر آگیا۔ وہ بھی

ہو تو چلے جاؤ۔“

نایاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”سکندر بھائی، میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ اس وقت تو وہ بیٹھک میں بیٹھا ہوا ہے لیکن مہمان خانے میں اس کا بندوبست کرنا ہے۔“ نایاب نے کہا۔

”ہو جائے گا بندوبست۔“ ابھی اسے دو منٹ بیٹھنے تو دو۔ منہ ہاتھ دھوئے، چائے وغیرہ پئے تو مہمان خانے میں بندوبست کر دیں گے۔“ سکندر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”پھر گاڑی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اسی گاڑی پر آئے ہو۔“

”آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“ نایاب مسکرائی۔
”اور تم کیسی ہو رابعہ۔“ سکندر رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیسا لگا شرمیں؟“

”شرم کی تو دنیا ہی ہم سے الگ ہے سکندر بھائی۔“ رابعہ نے جواب دیا۔ ”ہر چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔“

”اور یہاں کی صورت حال کیا ہے۔“ نایاب نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”یہاں سب خیریت تو ہے نا؟“

”یہاں سعادت جیسے لوگ ہوں وہاں خیریت کہاں۔“ سکندر نے کہا۔ ”بہر حال تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو۔ رات کو کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔“

شام ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ رسول بخش بھی دھو کر ہانکنا ہوا آگیا۔
”اوائے رسول بخش۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھک میں ایک مہمان بیٹھا ہوا ہے۔“

”مہمان بیٹھا ہوا ہے۔“ بیٹھنوں کو باندھ کر اس کا منہ ہاتھ دھلا دو۔“
”اچھا ملک جی۔“ رسول بخش نے جواب دیا اور بیٹھنوں کو کھونٹوں سے باندھ کر

بیٹھک کی طرف چلا گیا۔

”تقریباً“ دس منٹ برسے۔ ملک صاحب بھی آگئے۔ انہوں نے نایاب اور رابعہ کی خیریت دریافت کی اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

چائے تیار ہو گئی تھی۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک سکندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں بیٹھک میں جا رہا ہوں۔ وہ خدا کا بندہ اکیلا بیٹھا کیا سوچ رہا ہوگا۔ میری چائے

بھی وہیں بھیج دیتا۔“ اس نے سکیڑنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور بیٹھک میں چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد رسول بخش بھی ان کے لئے چائے لے کر بیٹھک میں چلا گیا تھا۔

بڑے ملک صاحب بھی چائے کے لئے برآمدے میں آگئے تھے۔ چائے کے دوران خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ رابعہ بڑے دلولہ انگیز انداز میں اپنے شر کے تجربات بیان کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”وہاں کی بڑی بڑی عمارتوں میں ایسے کمرے میں بھی ہیں جن میں کھڑے ہو تو چند سیکنڈ میں اوپر لے جاتے ہیں اور پھر نیچے لے آتے ہیں۔“

”تم ایسے ڈسٹ پارک بھی گئی تھیں؟“ غدرہ نے پوچھا۔
”نہیں بھئی۔“ رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دراصل شرم جانے کے دوسرے تیسرے

روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا کہ ہم نے گھر سے لکنا کم کر دیا۔ بہت ضروری کام ہوتا تھا تو باہر جاتے تھے روز گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔“

”کوئی خاص واقعہ؟“ نرگس نے سوالیہ نگاہوں سے نایاب کی طرف دیکھا۔
”ہاں..... کوئی ایسی ہی بات تھی۔“ نایاب نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”چھوہری سعادت نے شرم میں بھی مجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ بچ گئے۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ سکیڑنے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس بد بخت نے وہاں بھی تمہارا چہچہا نہیں چھوڑا۔“

”وہ ہر قیمت پر میری موت چاہتا ہے۔“ نایاب نے کہا۔ ”اس روز میں ڈیڑی کے ساتھ عدالت میں پیشی کے لئے جا رہی تھی کہ ایک گاڑی نے ہمارا راستہ روک لیا اور تین

نقاب پوشوں نے ہم پر فائرنگ کر دی۔“ وہ ایک لمحہ روکی پھر بولی۔ ”لیکن۔“ فائرنگ نہیں ہوئی۔ ان تینوں کی رائفلیں جام ہو گئی تھیں۔ کسی رائفل سے گولی نہیں چل سکی۔ اس طرح ہم بچ گئے۔ پولیس نے ان کا تعاقب کیا تو ان میں سے ایک مقابلے میں مارا گیا۔ وہ

رمضان تھا، چھوہری سعادت کا بندہ۔“

”وہی رمضان جس نے دکاندار اکرم کو برف توڑنے والا سوا مار کر زخمی کیا تھا اور

بھاگ گیا تھا؟“ نرگس بولی۔

کیا کارروائی کر رہی ہے۔“

”اس کے خلاف کارروائی شروع ہو چکی ہے۔“ ملک صاحب نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ ثایاب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”چار دن پہلے وہ گاؤں آیا تھا۔ اس کے ایک

کھیتے بعد پولیس بھی پہنچ گئی تھی۔ پولیس پابلی تقریباً دو گھنٹے کی حویلی میں رہی تھی۔ پھر

پولیس والے چلے گئے اور اسی رات سعادت بھی کہیں چلا گیا۔“

”پولیس پابلی کا انچارج کون تھا۔ انسپکٹر یا سب انسپکٹر؟“ ثایاب نے سوالیہ نگاہوں

سے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔

”انسپکٹر ہی تھا۔“ ملک صاحب نے بتایا۔ ”بعد میں بمن اللہ رکھی سے معلوم ہوا تھا

کہ انسپکٹر اور سعادت میں بڑی گرگراہٹ ہوئی تھی۔ چوہدری امانت علی بھی انسپکٹر سے بحث

کر رہا تھا۔ انسپکٹر نے سعادت کو گرفتار کر کے لے جانا چاہتا تھا لیکن پھر شاید کوئی کد

ہو گیا تھا۔ کیونکہ پولیس اسے گرفتار کئے بغیر چلی گئی تھی اور اسی رات سعادت بھی گاؤں

سے چلا گیا تھا۔ اس کے باپ کو شاید معلوم ہو لیکن گاؤں کا کوئی آدمی یا اس کے گھر کا کوئی

دوسرا فرد نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا ہے۔“

”غیر ٹھیک ہے۔ ثایاب نے گمراہی سے لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس انسپکٹر نے رشوت

لے کر اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ٹکڑے میں

ابھی ایسے زور دار اور فرض شناس آفیسر موجود ہیں جو جرموں کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتے

ہیں۔ چوہدری سعادت بھی زیادہ عرصہ تک چھپا نہیں رہ سکے گا۔ بہر حال، چھوڑیے ان باتوں

کو ڈیڑی سے آپ کے لئے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ میں ابھی آپ کو دیتی ہوں۔“

ثایاب اٹھ کر کمرے میں آگئی اور اپنا سوٹ کیس کھول کر چیزیں بند پر پھیلائے گی۔

عذرہ، راجہ اور زمرس بھی وہیں آگئی تھیں۔ ثایاب نے پہلے کچھ چیزیں نکال کر ملک صاحب

کو دیں اور پھر زمرس اور عذرہ میں تقاضا کرتے ہوئے لے گئے۔ آخر میں وہ کچھ

چیزیں لے کر باہر نکلے کہ پاس آگئی جو کام میں مصروف تھی۔

”بھابھی، میں آپ کے لئے کچھ چیزیں لائی ہوں۔ یہ سنبھال لیجئے۔“

”اے۔۔۔ ان کی کیا ضرورت تھی؟“ سیکنڈ نے کہا اور وہ چیزیں دیکھنے لگی۔ ثایاب

”ہاں دہی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”وہ چوہدری سعادت کی شہرہ وانی کوٹھی میں پناہ

ہوئے تھا۔ ہم پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک آدمی کو پولیس نے گرفتار بھی کیا ہے۔ اس

کا نام گامی ہے اور شاید وہ نور پور کا رہنے والا ہے۔ شہر جانے سے پہلے ایک روز میں

اسے نور پور تھا میں نے دیکھا تھا۔ پولیس نے اسے کسی جرم میں پکڑا تھا۔“

”اوہ گامی۔“ ملک صاحب چونک کر بولے۔

”آپ جانتے ہیں اسے انکل؟“ ثایاب نے پوچھا۔

”وہ پہلے بھائی فضل دین کے پاس ملازم تھے۔ تقریباً چھ مہینے پہلے دکان میں چوری

کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے نکال دیا تھا۔ چوہدری سعادت نے اسے تاج دین کے پاس

رکھوا دیا تھا۔ لیکن سنا تھا کہ تاج دین نے بھی اسے نکال دیا تھا۔“ ملک صاحب نے جواب

دیا۔ ”اس کے بعد وہ پتہ نہیں کیا کرتا رہا۔ اسے چوری کی عادت پڑ گئی تھی۔ دو مرتبہ پہلے

بھی پکڑا گیا تھا۔ پولیس اس کے خلاف پھرچہ درج کرنے کے بجائے کسی نہ کسی کی سفارش

پر اسے چھوڑ دیتی تھی۔“

”اور میرا خیال ہے اس کی سفارش کرنے والا بھی چوہدری سعادت یا اس جیسا ہی

کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔“ ثایاب نے کہا۔

”ظاہر ہے۔ ایسے لوگوں کی سرپرستی اسی قسم کے لوگ کرتے ہیں۔“ ملک صاحب

نے کہا۔ ”تم بتاؤ۔ تمہارے بھگے کا کیا ہوا۔ کچھ پتہ چلا آگ کس نے لگائی تھی۔“

”جی ہاں۔“ ثایاب نے گمراہی سے لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور اتفاق سے اس

واردات کے پس پردہ بھی چوہدری سعادت شامل ہے۔“

”ہائے میں مرگئی۔“ سیکنڈ بولی۔ ”وہ بدبخت ہر جگہ تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

”جی بھابھی۔“ ثایاب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”مجھے ہر لحاظ سے

تیار اور ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میری کوٹھی کو بھی آگ اس کے آدمیوں نے لگائی تھی۔ پردوس

کی کوٹھی کے چوکیدار نے ایک آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا بتایا ہوا حلیہ سن کر میں چونگی

تھی۔ وہ حلیہ ملنگی کا تھا۔ میری درخواست پر ملنگی کو نور پور سے شاہ پور لے جایا گیا۔

جہاں کوٹھی کے چوکیدار نے اسے شناخت کر لیا۔ اس نے اپنے بیان میں چوہدری سعادت کا

نام لیا ہے اور اب مجھے معلوم نہیں کہ چوہدری سعادت کہاں ہے اور پولیس اس کے خلاف

سے ایک آدمی کو ماسٹر محمد علی کے پاس لے آیا تھا۔ ماسٹر محمد علی ان کاغذات سے مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ اس آدمی کو سکندر بھائی کے پاس لے گئے۔ سکندر بھائی نے آکر بتایا تھا کہ اس آدمی کے کہنے کے مطابق چوہدری سعادت نے دو سال پہلے اس سے دو لاکھ روپے قرض لئے تھے جسے وہ ادا نہیں کر سکا اور وہ قرضہ چکانے کے لئے اس نے وہ حویلی احمد رضا نامی اس آدمی کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اس روز علی رضا حویلی کا قبضہ لینے آیا تھا۔

”گھوٹا ایک نیا ڈرامہ!“ ٹایپ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”یہاں بات سکندر بھائی نے بھی کہی تھی۔“ زمزم بولی۔ ”ان کے کہنے مطابق احمد رضا کے پاس صرف ایک اسٹامپ تھا۔ جس پر سعادت کی پینٹر رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا کہ اس نے حویلی قرصے کے عوض احمد رضا کو دیدی ہے۔ اور اب وہ ہی اس کا مالک ہے۔“

”گلتا ہے احمد رضا بھی کوئی جاہل آدمی ہے اور اس تحریر کی بنیاد پر حویلی پر قبضہ کرنے کے لئے آیا تھا۔“ ٹایپ بولی۔

”جاہل نہیں فراڈ کہو۔“ زمزم نے کہا۔ ”سکندر بھائی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ چوہدری فیملی کی ساری جائیداد اس وقت متاثر ہے اور قبضے کے لئے عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ اس لئے اس تحریر کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ خود بھی جہنم سکتا ہے اس لئے اس پگھلائے تحریر پر بات کو بڑھانے کی کوشش نہ کرے۔ ماسٹر محمد علی نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھند تھا کہ وہ تو حویلی پر قبضہ کرنے آیا ہے۔ البتہ اگر چوہدری سعادت کا قرضہ ہم لوگ ادا کریں تو وہ خاموشی سے واپس چلا جائے گا۔“

”پھر کیا ہو؟“ ٹایپ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”سکندر بھائی نے شک آکر کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حویلی پر قبضہ کر لے، ہم لوگ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے۔“ زمزم نے کہا۔ ”قیوم وغیرہ کو بھی واپس بلا لیا گیا تھا۔ وہ آدمی اور اس کے ساتھی دن بھر حویلی کے آس پاس رہے تھے۔ شاید وہ پورا بندوبست کر کے آئے تھے۔ وہ لوگ دن کے وقت حویلی کے اندر کا چکر بھی لگا کر آئے تھے۔ سنا ہے رات کو انہوں نے حویلی کے اوپر والی منزل کے برآمدے میں بسز لگائے تھے اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ تو کسی کو معلوم نہیں البتہ صبح چلا کہ احمد رضا دوسری منزل سے گر کر

کچھ چیزیں سکندر کے لئے بھی لائی تھی وہ بھی اس نے سکنے کے حوالے کریں۔

تھوڑی دیر بعد ملک صاحب بھی اٹھ کر بیٹھک میں چلے گئے جہاں سکندر اور ریاض بیٹھے ہوئے تھے۔

ریاض کے لئے حویلی سے متصل مسمان خانے میں بندوبست کر دیا گیا تھا۔ رسول بخش اسے وہاں چھوڑ آیا تھا۔

ٹایپ گاؤں کی کچھ اور عورتوں کے لئے بھی شر سے تحائف لائی تھی۔ وہ عذرہ کو ساتھ لے کر تحائف بانٹنے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی رابعہ ماسٹر محمد علی کے گھر میں ان سے جا کر ملی۔ قیوم ابھی تک ماسٹر محمد علی کے گھر ہی رہ رہا تھا اور کچھ دیر پہلے ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔ ماسٹر محمد علی کی بیوی ٹایپ اور رابعہ سے بڑے تپاک سے ملی تھی۔ ماسٹر محمد علی اس وقت گھر نہیں تھا۔

ٹایپ جب حویلی واپس پہنچی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ زمزم وغیرہ کے ساتھ کمرے میں آگئی اور رابعہ ایک بار پھر شر کے قصے سنانے لگی۔

”رابعہ۔ یہ قصے تم بعد میں بھی سنا سکتی ہو۔“ ٹایپ نے کہا۔ ”مجھے زمزم سے یہاں کے حالات تو پوچھ لینے دو۔ ہاں تو زمزم، میرے بعد یہاں کیا کیا ہوا ہے؟“

”بہت کچھ۔“ زمزم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ابائی نے آپ کو بتا ہی دیا تھا کہ پولیس والے چوہدری سعادت کو پکڑنے آئے تھے لیکن رشوت لے کر واپس چلے گئے اور اس رات سے چوہدری سعادت بھی غائب ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہاں ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا جس کے بارے میں ابائی نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔“

”اگر کوئی دلچسپ واقعہ ہے تو تفصیل سے بتانا۔“ ٹایپ نے کہا۔

”واقعہ دلچسپ ہے۔ اس کی میں گارنٹی دیتی ہوں۔“ زمزم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔ ”رابعہ کا بھائی قیوم تین چار آدمیوں کے ساتھ حویلی کی صفائی کر رہا تھا کہ ایک کار میں دو تین آدمی وہاں آگئے۔ وہ شر سے آئے تھے۔ انہوں نے قیوم وغیرہ کو کام کرنے سے روک دیا اور کہا کہ یہ حویلی انہوں نے چوہدری سعادت سے خرید لی ہے۔ انہوں نے قیوم کو کچھ کاغذات بھی دکھائے تھے۔ قیوم ان میں

”جی سکندر بھائی۔“ ٹایاب اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے بولی۔
 ”تمہیں کچھ باتیں تو معلوم ہوگئی ہوں گی۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو کسی نے نہیں
 بتائی ہوگی اور میرا خیال ہے کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں ہے۔“ سکندر بولا۔
 ”وہ کیا؟“ ٹایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دکھا۔
 ”میرا خیال ہے کچھ اور لوگوں کو بھی کھنڈرات میں اس خزانے کا پتہ چل گیا ہے۔“
 سکندر بولا۔

”کیا؟“ ٹایاب اچھل پڑی۔

”تمہارے شہر جانے کے دوسرے دن میں کسی کام سے چوہدری فرمان کے گاؤں گیا
 تھا۔“ سکندر لگے۔ ”والیسی پر دیر ہوگئی۔ چوہدری فرمان نے کوشش تو بہت کی تھی کہ میں
 رات وہیں رک جاؤں لیکن صبح مجھے یہاں کچھ ضروری کام تھا اس لئے میں واپس چلا آیا۔
 اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ نیلے کے قریب پہنچا تو مجھے کھنڈروں میں روشنی دکھائی
 دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مھنٹ نارنج کی روشنی میں وہاں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پہلے تو
 میں اسے اپنا دہم سمجھا لیکن وہ روشنی دو تین مرتبہ دکھائی دی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی
 موجود ہے۔ میں نے گھوڑے کو کھینچ کر قریب ایک درخت سے باندھ دیا اور محتاط انداز
 میں چلتا ہوا نیلے پر آگیا۔ نارنج کی روشنی ایک دو مرتبہ پھر دکھائی دی تھی۔ لیکن بعد میں وہ
 روشنی نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی آدھی دکھائی دیا۔ میں ”تقریباً“ ایک گھنٹے تک وہاں گھومتا
 رہا۔ کبھی کبھی کوئی آہٹ یا چڑخندہ لڑکھنے کی آواز سنائی دے جاتی جس سے پتہ چلتا تھا کہ
 وہاں کوئی موجود ہے لیکن کوشش کے باوجود میں کسی کو تلاش نہیں کر سکا۔

پہلے تو میں ہی سمجھا تھا کہ چور یا ڈاکو ہوں جو کھنڈروں میں چھپے بیٹھے تھے لیکن
 بعد میں اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ہو سکتا ہے کسی کو خزانے کی بھک
 مل گئی ہو اور وہ اسے تلاش کر رہے ہوں۔ اس وقت میں خالی ہاتھ تھا۔ میرے پاس کوئی
 اسلحہ وغیرہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے مزید وہاں رکتا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آگیا۔

دوسرے دن صبح میں پھر کھنڈروں میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے ایسے آثار نظر آگئے۔ جن
 سے پتہ چلتا تھا کہ رات کو یہاں کوئی موجود تھا۔ ایک دو جگہ کھدائی بھی کی گئی تھی۔ پہلے
 بھی خزانے کی تلاش میں کچھ لوگ یہاں آتے رہے ہیں۔ لوگوں نے یہاں کھدائی بھی کی

ٹانگ تروا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر کار پر بھاگنے لگے تو کار میٹے پر سے
 قلابازیاں کھاتی ہوئی گری اور وہ دونوں بھی زخمی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا بازو ٹوٹ گیا
 تھا اور دوسرے کی دو پٹلیاں کرکٹ ہو گئی تھیں۔ کار اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی جیسے
 اسے ہتھوڑوں سے کوتا گیا ہو۔ صبح ان کی چیخوں کی آواز سن کر قوم وغیرہ وہاں پہنچ گئے اور
 ان تینوں کو نور پور ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ وہ تینوں اب بھی ہسپتال میں ہیں۔“
 ”انہوں نے الزام لگایا ہوگا کہ گاؤں والوں نے انہیں مارا چیتا ہے۔“ ٹایاب نے
 پوچھا۔

”نہیں۔“ زمرس نے جواب دیا۔ ”ان کے کہنے کے مطابق پٹائی کرنے والے نظر
 نہیں آ رہے تھے۔ احمد رضا کے ساتھی تو اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر تک پہنچے ہیں
 کامیاب ہو گئے اور احمد رضا کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ اسٹامپ پیپر اب پولیس کے قبضہ میں ہے
 جس کی بناء پر وہ جوہلی پر قبضہ کرنے آیا تھا۔“

”تھو تو واقعی دلچسپ ہے۔“ ٹایاب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”بہر حال“
 میں احمد رضا سے ملوں گی۔ دیکھوں گی وہ کون ہے۔“
 ”وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ جا کر مل لیتا۔“ زمرس نے کہا۔

ٹایاب مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سکندر دروازے میں نمودار ہوا۔
 ”میرا خیال ہے کوئی بات ایسی نہیں بچی ہوگی جو انہوں نے تمہیں نہ بتا دی ہو۔“
 سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں سکندر بھائی۔“ ٹایاب بھی مسکرا دی۔ ”کچھ دلچسپ باتیں تو معلوم ہوئی ہیں۔
 لیکن حیرت کی بات ہے کہ احمد رضا والی بات مجھے کسی نے نہیں بتائی۔ حالانکہ کئی گھروں
 میں جا چکی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کسی کو بات کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ بہر حال“ میں بھی تم سے کچھ باتیں
 کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے بیٹھک میں آجاؤ۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ سکندر
 نے کہا۔

ٹایاب سکندر کے ساتھ بیٹھک میں آگئی۔ دیے ٹایاب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی
 کہ کوئی خاص بات ہی ہوگی جس کیلئے سکندر اسے الگ لے جا رہا تھا۔

لگتا اور کھلے عام خزانہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن دن میں کبھی چھپے رہتا اور رات کو چوروں کی طرح تلاش کرتا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی گزیر ضرور ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور انہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں کوئی خزانہ موجود ہے۔

”میں نے اس سلسلے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔“ سکندر نے کہا۔ ”کھنڈروں میں خزانے کی کمانی تو بہت پرانی ہے۔ گاؤں کے سب ہی لوگ واقف ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ خزانے کی تلاش میں آتے رہے ہیں۔ گاؤں کے بعض بچے بھی خزانہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے جب دو آدمی پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے تھے تو اس کے بعد کھنڈروں میں ساری سرگرمیاں ختم ہو گئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے تو اس طرف جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ خاصی تشویشناک ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ جو کوئی بھی ہیں، انہیں یقین ہے کہ یہاں کوئی خزانہ موجود ہے۔ اسی لئے تو وہ راتوں کو چوری چھپے خزانہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں پتہ کیسے چلا؟“

”میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔“ سکندر نے کہا۔ ”ہم نے وہ ہیرے نور پور کے ایک جوہری کو دکھائے تھے۔ میں نے اس سے بھی بات کی تھی کہ ان ہیروں کے بارے میں اس نے تو کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا جس سے کسی قسم جوئے کوئی نتیجہ اخذ کر لیا ہو۔“

”پھر... کیا معلوم ہوا۔“ ثانیاب نے پوچھا۔

”اس نے یہاں تو کسی سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن چند روز پہلے وہ شہر کیا تھا، وہاں دوستوں کی کسی محفل میں ہیروں کا ذکر نکلا تو اس نے ان ہیروں کی بات بھی کی جو ہم نے اسے دکھائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کھنڈروں میں قدیم دلفینے کا بھی قصہ سنا دیا تھا۔ اس جوہری کے کہنے کے مطابق، ”ہوسکا ہے اس محفل میں موجود کسی شخص نے باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہو کہ ان کھنڈروں میں واقعی کوئی خزانہ موجود ہے اور وہ جتنی ہیرے وہیں سے نکالے گئے تھے۔“

”ہوسکا ہے اس کا یہ تجربہ درست ہو۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”بہر حال، ہمیں یہ معلوم

ہے۔ لیکن اس طرح چھپ کر کبھی کسی نے کوئی کام نہیں کیا۔

میں نے نیلے کے آس پاس کا علاقہ بھی دیکھ ڈالا۔ شاید کسی نے کبھی کوئی پگھلے گا رکھا ہو۔ لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ البتہ نیلے کے شمال میں وہ جگہ جہاں رانی شہا کے مندر والا چوتھو ہوا کرتا تھا، وہاں کچھ آثار ملے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے ایک جگہ تین چار سرگرت کے کلوے ملے تھے۔ دو سرگرت کے فلٹر پر معمولی سے سرخ دھبے بھی موجود تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ سرگرت کسی عورت نے پئے تھے جس نے ہونٹوں پر سرفی لگا رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کم از کم دو آدمی موجود رہے تھے۔ جن میں ایک عورت تھی اور دوسرا مرد۔ لیکن سرگرت کے ان کلوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ملی۔“

”ہوسکا ہے ان کا تعلق گاؤں ہی سے ہو اور وہ ٹھٹھے ہوئے اس طرف نکل گئے ہوں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔“ ثانیاب نے سکندر کے خاموش ہونے پر کہا۔

”گاؤں کی کوئی عورت سرگرت نہیں چلتی۔“ سکندر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”بہر حال میں نے ان لوگوں کی تلاش جاری رکھی۔ تیسرے دن رات کو مجھے پھر کھنڈروں میں تاریخ کی روشنی نظر آئی۔ میں انہیں کھنڈروں میں تلاش کرتا رہا لیکن کوئی ذی روح مجھے نظر نہیں آیا۔ میں ان کھنڈروں میں ایک طرف مڑا ہوا تھا کہ غار کی آواز گونج اٹھی۔ کسی نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ میں بال بال بچا تھا۔ گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔ اس وقت میری جیب میں بھی ہتھکڑی موجود تھا۔ میں نے بھی ایک فلتھ دیواری کی آڑ لیتے ہوئے جوالی غار کر دیا۔ لیکن دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ مجھ پر گولی کہاں سے چلائی گئی تھی۔ میں اپنی جگہ پر چھپا بیٹھا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے۔ میں اپنی کین گاہ سے باہر نکل آیا اور انہیں تلاش کرنے لگا لیکن ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ وہ لوگ کھنڈروں ہی میں کبیں غائب ہو گئے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کھنڈروں میں کوئی ایسی جگہ موجود ہے جہاں چھپا جاسکتا ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ اگر کوئی ان کھنڈروں میں کسی خزانے کے بارے میں سن کر آیا تھا تو وہ یہاں پگھل

قیوم نے چلے ہوئے مکان کا لمبہ ہٹا دیا تھا۔ اس پلاٹ کا رقبہ ہزار مربع گز کے گنگ بھگ تھا۔ جہاں داخلی دروازہ ہوا کرتا تھا اس سے ذرا آگے نیم کا ایک درخت بھی تھا جو مکان کو آگ لگنے کی وجہ سے جھلس چکا تھا۔ تاہم شاخیں سیاہ ہو چکی تھیں۔ کچھ شاخیں جو شعلوں کی لپیٹ میں آگئی تھیں، پھل چکی تھیں۔ قیوم نے یہ درخت نہیں کٹوایا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی اسے کٹوایا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ نیم کا یہ پودا ان کے باپ نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اب یہی ان کے باپ کی یادگار تھی جسے وہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ریاض اس پلاٹ کی جانچ کرتا رہا اور اپنی ڈائری میں لکھتا رہا۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو گیارہ بج گئے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر گاؤں کے کچھ لوگ اور بچے بھی جمع ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کو چل چلا گیا تھا کہ ٹایاب اپنے خراج پر یعقوب اور راجہ کو مکان بنا کر دے رہی ہے۔ سب لوگ چھوٹی بی بی کی تعریفیں کر رہے تھے۔

کام ختم کرنے کے بعد ٹایاب اور ریاض نیم کے درخت کے نیچے ہی بیٹھ گئے۔ قیوم، ماسٹر محمد علی کے گھر سے تین چار کرسیاں لے آیا تھا۔

”ریاض صاحب۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کام کب شروع ہو سکے گا؟“

”جب آپ کہیں۔“ ریاض نے جواب دیا۔ ”میں اگر لیبر دستیاب ہو تو کل ہی کام شروع کراد دوں گا۔ اس کے لئے کچھ سالان کی بھی ضرورت ہوگی۔“

”آپ ابھی میرے ساتھ نور پور چلے۔ جن چیزوں کی ضرورت ہو وہ خرید لیجئے۔ لیبر آپ کو یہاں مل جائے گی۔ البتہ اچھے مستری آپ کو شہر سے لانے ہوں گے۔ مکان کی تعمیر مکمل ہونے تک وہ یہیں رہیں گے۔ ان کی رہائش اور خوراک کا بندوبست بھی ہماری طرف سے ہوگا۔“

”تو ٹھیک ہے۔ ضرورت کی چند چیزیں لاکر کل قیوم کی گھرانی میں بنیادوں کی کھدائی کا کام شروع کراد دیں۔ سینٹ سرانڈیو بھی کل ہی ڈولا دیتے ہیں۔ میں پرسوں ہی شہر چلا جاتا ہوں۔ میری دایہی میں دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔“

کرنا پڑے گا کہ وہ کون لوگ ہیں اور جہاں تک خزانے کا سوال ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ خزانے کی حفاظت نیچو اور اس کی ماں کر رہی ہے۔ یہ خزانہ صدیوں سے یہاں موجود ہے۔ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکا۔ اب کیسے پہنچ سکتا ہے۔“

”یہ نیچو کون ہے؟“ سکندر نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہی سہرا ناگ۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”آپ شاید بھول گئے۔ اس کا نام نیچو ہے اور شیتا اس ناگن کا نام ہے۔ جس کی موتی آپ نے کھنڈروں کے تہ خانے میں دیکھی تھی۔ وہ صدیوں سے اس خزانے کی حفاظت کرتے چلے آ رہے ہیں اور اب وہ کسی کو وہاں تک کیسے پہنچنے دیں گے۔ البتہ یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ ہمیں ان کا سراغ لگانا ہوگا۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ اگر خزانے کی بات کس طرح حکومت تک پہنچ گئی تو گزربو ہو جائے گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش رہی پھر بولی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں یہ خزانہ اپنے استعمال میں نہیں لانا چاہتی۔ اس سے علاقے کے لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ کام کرنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ خزانہ حکومت کے قبضے میں چلا گیا تو ہمارے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ سکندر بولا۔ ”تم انشاء اللہ ان لوگوں کا پتہ چلائیں گے اور اب تم تازہ، جسٹس پٹیل کی آفرونگی والے معاملے کا کیا ہوا؟“

”پتہ چل گیا ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگی۔

”بڑا خبیث آدمی ہے یہ چوہدری سعادت۔“ سکندر بولا۔ ”اسے معلوم ہے کہ پولیس اس کے پیچھے لگ گئی ہے۔ اسی لئے وہ غائب ہو گیا ہے۔“

”بائے گا کہاں۔“ ٹایاب مسکرائی۔ ”اس کا بھی پتہ چلا چلا جائے گا۔“ سکندر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سیکرٹ انڈر وائل ہو گئی اور پھر ان کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

انٹرویو سلسلہ

ٹایاب، ریاض کے ساتھ گلی میں اس جگہ ٹھہری تھی جہاں صرف دو بھتے پہلے ٹایاب وہی باغی کا مکان ہوا کرتا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ چلے ہم یہ کام شروع کر ہی ڈالیں۔“ ٹایاب نے کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔ ”قوم۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہمیں تو معلوم ہوا کہ آج اس قسم کی چیزیں کمال سے خریدی جائیں گی۔“

”جی چھوٹی بی بی۔ مجھے ساری دکانوں کا پتہ ہے۔“ قوم نے جواب دیا۔

اور پھر اس کے آگے گئے بعد وہ ٹایاب کی کار پر نور پور کے لئے روانہ ہو گئے۔

قوم کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ چار بجے تک وہ لوگ مختلف دکانوں پر پھرتے رہے۔ ’سرا‘، ’سینٹ‘، ’ایٹینش اور ریت‘، ’بجری و فیرو کا بندوبست کر کے وہ چیزیں بھی خرید لی گئیں جن کی کل ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ تمام چیزیں ایک ہی سونڈی پک اپ میں لدوا کر قوم کو ساتھ کر دیا گیا اور ٹایاب ’ریاض کے ساتھ اپنی کار میں آگئی۔ اس طرح جب وہ ہسپتال پہنچے تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔

”آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں چند منٹ میں آتی ہوں۔“ ٹایاب کہتے ہوئے کار سے اتر گئی۔ وہ احمد رضا نامی اس شخص سے ملنا چاہتی تھی جو اس کی عدم موجودگی میں حویلی کا قبضہ لینے آیا تھا۔

سرجیکل وارڈ میں احمد رضا اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کرنے میں ٹایاب کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ تینوں لائن میں اپنے اپنے بیڈ پر پڑے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود نرس نے اشارے سے بتا دیا کہ ان میں احمد رضا کون ہے۔ وہ درمیان والے بیڈ پر تھا۔ ٹایاب اس کے بیڈ کے قریب رک گئی اور باری باری ان تینوں کی شکلیں دیکھنے لگی۔ صورتوں سے وہ پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں کے لگتے تھے۔ احمد رضا کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ قدرے بھاری بھر کم عمر دروازہ قامت آدمی تھا۔ کھین شیڈو تھا۔ لیکن اس وقت غالباً دو دن کا شیوہ برصا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ پر پلستر بڑھا ہوا تھا اور ٹانگہ ایک سلنگ کے سارے اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی تھی۔ سر اور کندھے پر بھی پٹیوں بندھی ہوئی تھیں۔

”تم مجھے نہیں جانتے۔“ ٹایاب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں تمہارے بارے میں تھوڑا بہت جان چکی ہوں۔ تمہارا نام احمد رضا ہے اور چند روز پہلے تم اس حویلی کا قبضہ لینے کے لئے آئے تھے جو بقتل تمہارے تم نے چوہدری سعادت سے دو لاکھ روپے

قرضے کے عوض خریدی تھی۔“

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں مس۔“ احمد رضا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن بڑھ گئی تھی۔

”اس سے پہلے تم نے کسی مجھے دیکھا ہی نہیں تو پہچانو گے کیسے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”دوپے تم کرتے کیا ہو مسٹر احمد رضا۔ میرا مطلب ہے کوئی ملازمت یا کسی قسم کا کاروبار؟“

”آپ کون ہیں اور یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ احمد رضا بولا۔

”میں یہ اندازہ لگانا چاہتی ہوں کہ کیا تم اس حیثیت کے مالک ہو کہ کسی کو دو لاکھ روپے قرض دو سکو۔“ ٹایاب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔“ احمد رضا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں لیکن میں پولیس کو اس سلسلے میں بتا چکا ہوں۔ آپ کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق یہ ہے کہ میں اس حویلی کی مالک ہوں جس پر تم قبضہ کرنے آئے تھے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”پولیس کو تم نے کیا بتایا ہے؟ یہ میں نہیں جانتی۔ میں تو تم سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ چوہدری سعادت کہاں ہے اور اس ڈرامے کے لئے ہمیں کتنے پیسے دینے گئے تھے؟“

”اب میں سمجھ گیا۔“ احمد رضا نے جواب دیا۔ ”آپ چوہدری سعادت کی بھانج ہیں جس نے جائیداد کی تقسیم کے لئے مقدمہ دائر کر رکھا ہے اور آپ کا نام شاید ٹایاب ہے۔“ ”ہاں۔ یہ درست ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”تم نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ہمارا جائیداد کی تقسیم پر مقدمہ چل رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم وہ ددی کاغذ لے کر حویلی پر قبضہ کرنے چلے آئے۔“

”اور شاید یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ لاچ میں آکر میں نے چوہدری سعادت کی بات مان لی تھی۔ میرا خیال تھا، گاؤں کے لوگ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ اسٹامپ پیپر دیکھ کر میری باتوں میں آجائیں گے۔ لیکن گاؤں کے جن دو تین آدمیوں سے میرا واسطہ پڑا۔ ان سے بات کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بیوقوف وہ نہیں، ہم ہیں۔ اس کے علاوہ حویلی میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی حیرت انگیز اور ناقابل بیان ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تو تھوڑا سا تو کیا اس کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا

سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔" احمد رضا چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اس جھگے کے بارے میں بتانے لگا۔

یہ ٹایاب کے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ اس نے جھگے کا پتہ ذہن نشین کر لیا۔
 "مس ٹایاب۔" احمد رضا بولا۔ "اگر آپ چاہیں تو مجھے پولیس سے پتا سکتی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔"
 "لیکن اگر پولیس نے ہمارے خلاف رپورٹ درج کر لی ہے تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتی گی۔" ٹایاب نے جواب دیا۔

"سب انسپکٹر اشرف نے بتایا تھا کہ میرے خلاف ابھی تک کچھ رپورٹ نہیں لکھی گئی۔ اس کی وجہ میں نہیں جانتا لیکن آپ کچھ کر سکتی ہیں تو ضرور کریں مس ٹایاب۔ پلیز! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" احمد رضا نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ جس میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔" ٹایاب نے کہا۔
 "بہرحال میں دیکھوں گی کہ ہمارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔"

احمد رضا مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ٹایاب وارڈ سے نکل کر ہسپتال سے باہر آگئی۔ ریاض کار سے ٹیک لگاتے کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔
 "سوری مسٹر ریاض۔" ٹایاب قریب پہنچ کر بولی۔ "کچھ دیر ہو گئی۔ اب تھوڑی دیر کے لئے پولیس اسٹیشن بھی جانا ہو گا۔ ایک جھوٹا سا کام ہے وہ بھی گئے ہاتھوں ہو ہی جائے۔"

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تقریباً دس منٹ بعد ٹایاب نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روک لی اور اس مرتبہ بھی ریاض کو گاڑی ہی میں چھوڑ کر اندر چلی گئی۔
 انسپکٹر تھانے میں موجود نہیں تھا لیکن سب انسپکٹر اشرف موجود تھا۔ چند لمحوں کے تبادلے کے بعد ٹایاب فوراً ہی اصل موضوع پر آگئی۔
 "میں ابھی احمد رضا سے مل کر آ رہی ہوں۔" ٹایاب نے کہا "اس کے خلاف کیا کیس بن سکتا ہے۔"

"کیس تو بہت بن سکتے ہیں۔ ملک سکندر صاحب نے ہمیں اس کے خلاف کسی کارروائی سے روک دیا تھا۔ وہ عادت کے دوسرے روز احمد رضا سے ہسپتال میں ملے تھے۔

پہر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی تھی جس کی مجھے سزا مل چکی ہے۔ مجھے معاف کر دیں مس ٹایاب۔" اس نے ٹایاب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں گریجویٹ ہوں۔ جس کمپنی میں ملازم تھا وہ بند ہو گئی۔ پچھلے ایک سال سے بے روزگار ہوں۔ میرے چار بچے ہیں۔ میں نے لالچ میں آکر چوہدری سعادت کی بات مان لی تھی۔ مجھے میرے لالچ کی سزا مل گئی ہے۔ اگر مجھ پر پولیس کیس بن گیا تو میں بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ میرے بچے خوار ہو جائیں گے۔ مجھے سب انسپکٹر اشرف نے بتایا تھا کہ آپ ایک ٹیک اور ہمدرد خاتون ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے پولیس سے پتا سکتی ہیں۔"

"سعادت نے ہمیں کتنے پیسے دیئے تھے اور اس کا مقصد کیا تھا؟" ٹایاب نے پوچھا۔
 "تین ہزار روپے۔" احمد رضا نے جواب دیا۔ "وہ صرف ہنگامہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسٹامپ بھی میری اسی لے تیار کیا تھا اور یہ یقین دلایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ میری مدد کرے گا۔"

"وہ تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے تمہاری کیا مدد کرے گا۔" ٹایاب بولی۔
 "مجھے پہلے یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا۔ اگر معلوم ہوتا تو اس کی بات کبھی نہ مانتا۔"
 احمد رضا نے کہا۔ "مجھے پولیس سے پتائیں مس ٹایاب!"
 "چوہدری سعادت سے تمہاری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟" ٹایاب نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً دو ہفتے پہلے شکر گڑھ میں۔" احمد رضا نے جواب دیا۔ "اس سے میری ملاقات ایک دوست کے ذریعے ہوئے تھی۔ چوہدری سعادت نے جب مجھے یہ پیشکش کی تو میں فوراً ہی مان گیا۔ اس وقت میری عقل پر چھڑ گئے تھے۔ آپ جانتی ہیں جب نوبت قانون تک پہنچ گئی ہو اور کسی طرف سے کوئی امید نہ ہو تو مجھ جیسا مجبور آدمی چند روپوں کے لئے ختم میں چھلانگ لگانے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔"

"شکر گڑھ میں کہاں ملاقات ہوئی تھی؟" ٹایاب نے پوچھا۔

"کل گھٹ کے ایک جھگے میں۔" سنا ہے وہ جھگہ اسی کا ہے اور وہ کبھی کبھی وہاں آتا رہتا ہے۔ اس جھگے کا نمبر تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں نشانی بتا دیتا ہوں۔ وہ جھگہ آسانی

اس سے کچھ باتیں ہوئی تھیں اور آپ کا انتظار تھا۔" اشرف نے کہا۔

"گویا۔ آپ بھی ایک ظلم کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے اسے چھوڑ دینے کا سوچ رہے ہیں۔" ثایاب نے کہا۔

"ہم بھی انسان ہیں مس ثایاب۔" سب انسپکٹر اشرف نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ اس سے ایک جرم سرزد ہوا ہے لیکن اس جرم سے کسی چھو نقصان نہیں پہنچا۔ اس نے ایک مجبوری کے تحت لالچ میں آکر یہ حرکت کی تھی۔ میں نے ذاتی طور پر شکرگزارہ جاکر اس کے بارے میں انکوائری کی ہے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ کبھی کسی معمولی سے جرم میں بھی لوٹ نہیں رہا۔ اس لئے ہم نے یہ سوچا تھا کہ اسے سنبھلنے کا ایک موقع دیا جائے۔ لیکن اگر آپ بند ہوں تو میں آج ہی اس کے خلاف پورے چاک کر سکتا ہوں۔ ویسے انسانی ہمدردی کے ناطے میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ اس کے بارے میں ہمدردی سے سوچیں۔"

"لیکن کیا آپ کو اندازہ ہے کہ اس کے خلاف کارروائی نہ کرنے سے مجھے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟" ثایاب نے کہا۔ "احمد رضا کو میرے اور سعادت کے کیس میں میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

"ہم نے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔" سب انسپکٹر اشرف نے کہا۔ "احمد رضا کے قبضے سے اسٹامپ پیپر پر ایک تحریر برآمد ہوئی ہے جس میں لکھا ہے چوہدری سعادت نے دو سال پہلے اس سے دو لاکھ روپے قرض لئے تھے لیکن وہ یہ قرضہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے اپنی حویلی احمد رضا کو دیدی ہے۔ آج سے وہ اس حویلی کا مالک و مختار ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "میں جانتا ہوں جائیداد کی خرید و فروخت کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ اس کا ایک الگ طریقہ کار ہے جس کے قانونی تقاضے بھی مختلف ہیں اور پھر مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے وہ اپنی جائیداد یا اس کا کوئی حصہ فروخت نہیں کر سکتا۔

اس کے خلاف کارروائی ہونا بہت معمولی بات ہے۔ لیکن دوسری طرف ہم نے یہ طے کیا ہے کہ احمد رضا سے ایک تحریر کھوئی جا چکی ہے کہ سعادت نے کچھ رقم دے کر اسے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اسٹامپ پیپر کی تحریر کو بنیاد بنا کر حویلی پر قبضہ کر لے لیکن احمد رضا نے معاملے میں کچھ گزباز اور چوہدری سعادت کی بددیانتی کو محسوس کرتے ہوئے پولیس

کو اطلاع دیدی۔ اس طرح احمد رضا کا خلیفہ بیان اور اسٹامپ پیپر چوہدری سعادت کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

"اور آپ کے انسپکٹر صاحب کا کیا خیال ہے؟" ثایاب نے کہا۔

"انسپکٹر صاحب نے چوہدری فیملی سے جو کچھ لیتا تھا وہ لے چکے۔" سب انسپکٹر اشرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب انہیں چوہدری سعادت سے دلچسپی صرف اس حد تک ہے کہ وہ اس کی تلاش میں ہیں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ چوہدری سعادت کہاں چھپا بیٹھا ہے؟" ثایاب نے پوچھا۔ "جی ہاں۔" سب انسپکٹر مسکرایا۔ "وہ شکرگزارہ میں ہے اور ہمارا ایک آدمی اس کی عمرانی کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ثایاب اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں احمد رضا کے بارے میں سوچ کر بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔"

وہ سب انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے تھانے سے باہر آگئی۔ ریاض کار میں بیٹھا بور ہو رہا تھا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ثایاب نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انجمن اشارت کیا اور کار آگے بڑھا دی۔

جب وہ گاؤں پہنچے تو سات بج چکے تھے۔ سیکنڈ وغیرہ پریشان ہو رہی تھیں۔ سکندر اس وقت ماسٹر عمر علی کے گھر گیا ہوا تھا۔ تقریباً "آٹھ بجے بعد وہ بھی آگیا۔

کھانے سے ذرا پہلے اس نے ثایاب کو بتایا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی اور ایک عورت کو کھنڈروں میں گھومتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

"کس نے دیکھا تھا انہیں؟" ثایاب نے چوک کر پوچھا۔

"ماسٹر عمر علی نے۔" سکندر نے کہا۔ "وہ کسی کام سے اپنی سائیکل پر پیر آباد ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ اس نے واپسی پر ان دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ عورت بھی پیٹنٹ اور فی شرت پہنے ہوئے تھی۔" ماسٹر عمر علی نے یہی بتانے کے لئے مجھے بلایا تھا۔"

"گھڑ۔" ثایاب کے ہونٹوں پر خفگی سی مسکراہٹ آگئی۔ "کیا خیال ہے آج رات کھنڈروں میں نہ گزاری جائے۔"

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ سکندر بولا۔ ”تقریباً“ گیارہ بجے ہم یہاں سے نکلیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔

اور پھر رات ٹھیک گیارہ بجے وہ دونوں حویلی سے نکل گئے۔ ٹایاب نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سکندر کے کپڑے بھی کمرے کے کمرے کے رنگ کے کپڑوں کی وجہ سے وہ تاریکی میں دوسروں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان دونوں کے پاس ٹارپیں تھیں اور سکندر کی جیب میں پتول بھی تھا۔

وہ بہت محتاط انداز میں چلتے ہوئے کھنڈروں میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں ایک خفیہ راستے سے وہ تہہ خانے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ خاموش بیٹھے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ کچھ دوسری کسر پتھر کے لڑکنے کی آواز سن کر چونک گئے۔ ان دونوں نے بیک وقت مڑ کر آواز کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ ان دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کسی طاقتور تاراج کی تیز روشنی نے ان دونوں کے چہروں کو اپنے چلتے ہی لے رکھا تھا۔



اس نے پتول نکالنے کیلئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روشنی کے پیچھے سے ایک غراہٹ سنائی دی۔

”نہیں مشر ملک! تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جو ہمارے اور اس لڑکی کیلئے نقصان دہ ثابت ہو سکے۔ تم دونوں اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“

سکندر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے جانتا تھا۔

”تم ان دونوں کی تلاشی لو نیچو۔“ روشنی کے پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”میں ان کا خیال رکھتی ہوں۔“

قدموں کی آہٹ ہوئی اور پھر نیچو، سکندر کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے سکندر کا جسم ٹٹول کر اس کی جیب سے پتول نکال لیا اور اس کے ہاتھ سے تاراج بھی لے لی اور پھر نیچو کا ہاتھ چسپے ہی ٹایاب کے جسم سے چھوا وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ وہ غرائی۔

”تمہاری زبان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ تمہاری تلاشی تو لینی ہو گی۔“ وہی نسوانی آواز سنائی دی۔

”تو پھر تلاشی تم خود لو۔“ ٹایاب نے کہا۔

اور پھر وہ عورت ٹایاب کے پیچھے پہنچ گئی اور اس کے جسم کو ٹٹولنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولی۔ ”اب تم دونوں ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہم یہاں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔

”کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ ہمیں۔“ سکندر بولا۔

اس نیلے کے اختتام پر برگرد کا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ وہاں ایک بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ ہم وہیں جا کر بات کریں گے۔ راستہ ہمیں معلوم ہی ہے۔ تم دونوں ہمارے آگے آگے چلو گے اور کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ تم لوگوں کو نقصان

چھوٹا سا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ نیچے سے اس خلا میں ہاتھ ڈال کر اندر گئے ہوئے لوہے کے ایک کڑے کو پکڑ کر باہر کی طرف کھینچ لیا۔

اس چوڑے پر ایک اور چھوٹا چوڑہ بنا ہوا تھا جس پر کسی زمانے میں کوئی مورچی نصب رہی ہوگی۔ دیوار کے اندر لوہے کا کارڈ کھینچنے سے اوپر والا چھوٹا چوڑہ اپنی جگہ سے تقریباً دو انچ اوپر اٹھ گیا اور پھر بائیں طرف سرکنا چلا گیا اور بالا خرابیک جگہ رک گیا۔

سکندر اور ٹایاب یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اوپر والا چوڑہ ہٹ جانے سے فرش پر چار پائی تین فٹ کا ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اور اس کے اندر گمرانی میں کیس دہم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

”اس کے اندر بیڑھیاں بی ہوئی ہیں۔ تم لوگ نیچے اترو۔ پہلے تم چلو مسٹر ملک۔“ نیچو نے سکندر کو اشارہ کیا۔

سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھا اور اس خلا میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے ہی ٹایاب بھی اتر گئی۔ نیچے تک سی بیڑھیاں تھیں۔ ان کے پیچھے ہی دہلی اور نیچو بھی آ رہے تھے۔ نیچو نے چوتھی بیڑھی پر رک کر چھت پر لگے ہوئے لوہے کے ایک کڑے کو کھینچ لیا۔ اوپر والا چھوٹا چوڑہ سرکنا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا۔

برگد کے نیچے یہ چوڑہ تقریباً تین فٹ لمبا اور میں فٹ چوڑا تھا مگر اس سے نیچے یہ تہ خانہ اس سے دو گنا لگ رہا تھا۔ اس میں تین کمرے بھی تھے۔ دو ایک طرف اور ایک سامنے کی طرف۔ ایک کمرہ ایسا تھا جہاں غالباً صفائی کی گئی تھی۔ وہاں فرش پر چٹائی اور اس کے اوپر قالین کا ایک کھڑا بچھا ہوا تھا ہال میں ایک پیڑو میسکل بل رہا تھا۔ اس کی روشنی بیڑھوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ پیڑو میسکل کے قریب ہی پانی کا ایک بڑا کولر، کیتلی، کیکرو سین کا چلہا اور کپ وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

”تم لوگوں کو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہو گی۔“ نیچو کی آواز سن کر ٹایاب اور سکندر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”یہ تہ خانہ ہم نے تقریباً تین مہینے پہلے دریافت کیا تھا۔ اس وقت ہم بھی دم دلفنی کی تلاش میں یہاں چوری چھپے آئے تھے لیکن کسی وجہ سے ہمیں واپس جانا پڑا۔ اس مرتبہ ہم پورا بندوبست کر کے آئے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس مرتبہ بھی کسی کو پتہ نہیں چلے گا لیکن تم لوگوں کی موجودگی نے ہمارا یہ خیال غلط ثابت کر

بچانے کا کافی الجھل ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اگر تم دونوں نے کوئی ہوشیاری دکھانے کو کوشش کی تو نقصان کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہو گی۔“

سکندر یا ٹایاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے آگے چل پڑے۔ ٹایاب والی عمارت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے تارخ روشن کر رکھی تھی۔ سکندر اس ساتھ ساتھ تھا۔ نیچو اور اس کی ساتھی ان سے دو تین قدم پیچھے تھے۔ ان دونوں تارخیں بھی روشن کر رکھی تھیں اور دونوں کے ہاتھوں میں پستول بھی تھے۔

وہ کھڑکوں میں آڑے ترے راستوں پر چلے ہوئے ٹیلے کے اختتام پر پہنچ گئے۔ آ ڈھلان تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ دھننا“ نیچو کا بھر کسی چتر پر ہٹ گیا۔ لڑکھوا کر گرا۔ اس کی ساتھی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سمارا دیا اور وہ ایک جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سکندر اور ٹایاب کیلئے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ بڑی آسانی سے اس وقت ان پر قابو رکھتے تھے لیکن وہ دونوں خاموشی سے کھڑے رہے۔

”تم لوگ کھڑے ہمارا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو آگے بڑھو۔“ نیچو پستول سے اشارہ کرتے ہوئے غرایا۔

سکندر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ٹایاب کی طرف دیکھا پھر وہ دونوں آگے چلے گئے۔

برگد کے درخت کے نیچے چوڑے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

”اس چوڑے پر بیٹھ کر بات کرو گے یا کہیں اور چلنا ہو گا۔“ سکندر نے نیچو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں ہم نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی ہے جہاں کسی دوسرے کی مداخلت کا اند

نہیں۔“ نیچو نے کہا اور پھر اپنی ساتھی کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”روہی تم انہیں کور

میں راستہ کھول دو۔“

وہ تارخ کی روشنی میں دیکھتا ہوا تقریباً دس قدم آگے چلا گیا اور چوڑے کے قریب

ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک اینٹ کو کنارے پر ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف

دھکیلا۔ وہ اینٹ اپنی جگہ پر گھوم گئی۔ اینٹ کے اس طرح گھوم جانے سے دیوار میں آ

لیکن ایک بیٹے کی کوشش کے بعد بھی ہم کوئی سراغ نہیں لگا سکے اور اب۔۔۔" وہ خاموش ہو کر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور اب مس خزانہ اس تک ہماری رہنمائی کرے گی۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" ٹایاب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ "میرے پاس ایسے بہت سے طریقے ہیں جس سے میں تمہیں اپنا ہر حکم ماننے پر مجبور کر سکتا ہوں۔" نیچے نے جواب دیا۔ "میں تم لوگوں کو بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ گاؤں کے لوگ تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میاں کوئی تہہ خانہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی تو اس خزانے میں تمہیں بھی حصہ مل سکتا ہے۔ بصورت دیگر تم اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔"

"کوشش کر دیکھو۔" ٹایاب مسکرائی۔ "تم خزانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہو یا اپنی جان بچانے میں۔"

نیچے نے دہلی کی طرف دیکھا اور آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ دہلی سکندر کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے اشارہ ہاتھ پیڑی پھرتی سے ہسپتال کا رستہ سکندر کے سر پر رسید کر دیا۔ سکندر کی کھوپڑی پر لگنے والی ضرب خاصی زور دار تھی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی جع لگی اور وہ تھورا کر پیچھے گر گیا۔ ضرب کھوپڑی کے نازک حصے پر لگی تھی اور سکندر بے ہوش ہو گیا تھا۔ دہلی نے کمرے میں پیڑی ہوتی ہی سے سکندر کے ہاتھ پیر ہانڈھ دینے اور ہسپتال لے کر ٹایاب کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں تو مس ٹایاب۔" نیچے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں سوچنے کیلئے صرف ایک منٹ دوں گا۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو تو پیڑی اچھی بات ہے بصورت دیگر مجھے اپنے طریقہ پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"تم جو چاہو کرو۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔" ٹایاب نے جواب دیا۔ نیچے ہسپتال تانے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ دہلی بھی سامنے آگئی تھی۔ اس کے ہسپتال کا رخ ٹایاب کی طرف تھا۔ ٹایاب باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نیچے کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ شکل و صورت سے وہ پڑھا لکھا اور شریف آدمی لگتا تھا لیکن اس کی حرکتیں شرطیانہ

دیا۔"

"تم لوگ کون ہو؟" سکندر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ "میرا نام نیچے ہے اور یہ میری دوست دہلی ہے۔" نیچے نے جواب دیا۔ "ہم نے لوگو سے سنا تھا اور پرانے قصبے کمانڈوں میں بھی پڑھا تھا کہ ان کھنڈروں کے نیچے کسی جگہ را شیا کا بہت بڑا خزانہ دفن ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ قسمت آزمائی کیلئے ہیں۔ بعض لوگ اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ پچھلی مرتبہ ہم یہاں آئے۔ تو ہمیں بھی ناکام لوٹنا پڑا تھا۔ لیکن۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہو پھر بات جاری رکھنے لگا۔ "لیکن چند روز پہلے ایک واقعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ میاں واقعی کوئی خزانہ موجود ہے۔"

"اور وہ واقعہ کیا تھا؟" سکندر نے پوچھا۔

"چند روز پہلے شرمیں چند میرے فروخت ہوئے تھے۔" نیچے نے جواب دیا۔

"وہ پانچ میرے کسی چوہری نے دس لاکھ میں خریدے تھے۔ چوہری نے وہ میرے ک اور کے ہاتھ چندہ لاکھ میں فروخت کر دیے اور پھر وہ میرے چند اور ہاتھوں سے ہوئے آخری مرتبہ پچاس لاکھ میں فروخت ہوئے۔ شرمیں ان ہیروں کا بہت چرچا تھا۔" نے تحقیقات کی تو خفیہ طور پر پتہ چلا کہ وہ میرے حکومت کے ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر مر ارشاد کی بیٹی ٹایاب نے فروخت کئے تھے۔" وہ خاموش ہو کر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا "ہم نے ٹایاب کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو کچھ عجیب اور ناقابل یقین سی بات سامنے آئیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ٹایاب تمہارے ہاں رہ رہی ہے۔ بحرال: اور دہلی اس مرتبہ مکمل تیار کی کے ساتھ یہاں آگئے۔ اس تہہ خانے کو ہم نے اپنی تہہ بنا لیا اور راتوں کو چھپ کر خزانے کی تلاش شروع کر دی۔ ہمیں یقین ہے کہ خزانہ یہا موجود ہے۔ جب ٹایاب اس خزانے تک پہنچ سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں پہنچ سکتے۔"

"تم لوگ زندگی بھر اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتے۔" اس مرتبہ ٹایاب نے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔" نیچے نے معنی خیز انداز میں مسکرا۔ ہوئے کلا۔ "ہمارا خیال تھا کہ ہم خاموشی سے وہ خزانہ تلاش کر کے واپس چلے جائیں۔"

پھیل گئے۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر ٹیپو اس پر ہتھول تانے کھڑا تھا۔

”اگر تم نے خزانے کا راستہ نہیں بتایا تو دوسری گولی تمہاری ٹانگ میں لگے گی اور میں اس وقت تک تمہارے جسم کے مختلف حصوں پر گولیاں چلاتا رہا ہوں گا جب تک تم خزانے کا راستہ نہیں بتاؤ گی۔ ملک کو بھی تمہارے پیچھے ہی اگلے جہاں روانہ کر دیا جائے گا اور پھر ہم اطمینان سے وہ خزانہ تلاش کر لیں گے۔ بتاؤ خزانے کا راستہ کس طرف سے ہے۔“ ٹیپو نے ہتھول کا حرکت دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر دھتتا۔ وہ پھکار کی ہلکی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے گردن ہٹھا کر دیکھا۔ سنری ٹانگ دائیں طرف دیوار کے قریب کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ تیزی سے رینگتا ہوا ٹیپو کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ ٹیپو کچھ بولتی سنری ٹانگ اپنی جگہ سے اٹھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا ٹیپو کے ہتھول والے ہاتھ سے ٹکرایا۔

ہتھول ٹیپو کے ہاتھ سے ٹکل کر گر گیا۔ ہتھول گرنے کے ساتھ دھب کی ایک اور آواز سنائی دی تھی۔ اس نے گردن ہٹھا کر آواز کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھیلنے لگیں۔ سنری رنگ کا سانپ بڑی تیزی سے اس کی طرف رینگ رہا تھا۔ ردلی نے بھی اس سنری ٹانگ کو دیکھ لیا اور جتنی ہوئی پیچھے دیوار کے ساتھ جا گئی۔ سنری ٹانگ بڑی تیزی سے ٹیپو کی طرف رینگ رہا تھا اور پھر چند فٹ کے فاصلے پر وہ رک گیا۔ اس کا جھن پھیل گیا۔ وہ ٹیپو پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

”بچو نہیں۔“ ٹیپو چیخا۔ ”تم ایسا نہیں کرو گے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

سنری ٹانگ کا جھن سٹ گیا اور پھر وہ رینگتا ہوا ٹیپو کی طرف آئے گا۔ قریب پہنچ کر وہ ٹیپو کی ٹانگ سے لپٹ گیا اور پھر پیر سے ہوتا ہوا چند فٹ دور جا کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ جھن کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے کبھی ٹیپو کی طرف دیکھتا اور کبھی ٹیپو کی طرف۔

”دیکھ لیا تم نے۔“ ٹیپو نے ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں سے نہ روکتی تو تمہاری لاش اب تک کوئلہ بن چکی ہوتی۔ اب تم دونوں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔ آرام سے کھڑے رہو۔“

نہیں تھیں۔ ردلی کی عمر ٹیپو کے خیال میں زیادہ سے زیادہ تیس سال تھی۔ اس نے چیز اور شرٹ پرز رکھی تھی۔ بال کئے ہوئے تھے اور کلاں پر طلائی ٹاپس تھے۔ وہ خاصی حسین تھی۔

”ایک منٹ گزر چکا ہے اس ٹیپو۔“ ٹیپو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”جیسے باپو سی ہو گی۔“ ٹیپو مسکرائی۔

”یہ ایسے نہیں مانے گی۔“ ردلی وہ قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں اس سے پوچھتی ہوں۔ کیسے نہیں بتائے گی۔“

اور پھر اس نے ٹیپو کو تھپڑ مارنے کیلئے اچانک ہی ہاتھ اٹھا دیا تھا مگر اس کا تھپڑ ٹیپو کو نہیں لگا۔ ردلی کا ہاتھ راستے ہی میں رک گیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ کلائی پر کسی کی بڑی سخت گرفت محسوس ہو رہی تھی۔

ردلی کا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا تھا۔ کلائی پر اب بھی کسی کی گرفت تھی۔ وہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے اپنے ہاتھ کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا لیکن کلائی پر گرفت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بڑی جتنی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ پیر زمین پر جمائے پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے زور لگا رہی تھی اور پھر دھتتا۔ اس کی کلائی پر گرفت ختم ہو گئی۔ اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لڑکھائی ہوئی پشت کے بل گر گئی۔

ٹیپو قریب کھڑا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشت سی بھرائی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر سارا دے کر ردلی کو اٹھایا اور ٹیپو پر ہتھول تان لیا۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کے حلق سے بھڑپنے کی سی غراہٹ نکلی۔
”جیسے خزانے کا راستہ بتانا ہو گا ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیپو کے پیر کے قریب گولی چلا دی۔

ملک سکندر ہوش میں آگیا۔ کھوپڑی پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کے دماغ میں ٹیسس سی اٹھ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ وحشت زدہ سی نظروں سے کبھی ٹیپو اور کبھی ٹیپو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹیپو کی آنکھوں میں وحشت سی ابھرائی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے سائے

”رات گاؤں میں گزار کر صبح نور پور وہاں سے شہر چلے جانا۔“
 ”ہیں ہمیں رہنے دو تو بستر ہے۔“ نیچے نے کہا۔ رات میں گزار کر صبح سویرے ہم ریلوے سٹیشن چلے جائیں گے۔ وہاں سے ہمیں ٹرین مل جائے گی۔“
 ”اب رات یہاں رہنا تم لوگوں کیلئے ٹھیک نہیں۔“ اس مرتبہ سکندر نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”بھو بھئی دو سہری ٹاگ تو وہاں چلا گیا ہے لیکن دوسرے سانپ ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ یہاں تم لوگ سانپوں سے اب تک کیسے بچے ہوئے ہو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور چلو۔“
 ”ہمارا سامان اتنا قیمتی نہیں ہے۔“ روہی نے کہا۔ ”یہ سب کچھ ہمیں چھوڑ دیں گے تو ہمیں کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ چلو ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“
 اس نے کمرے میں پڑا ہوا براؤن رنگ کا ایک بریف کیس کھول لیا اور بستر پر بکھرے ہوئے اپنے اور نیچو کے کپڑے سمیت کر بریف کیس میں ڈال لئے اور بریف کیس بند کر کے اٹھا لیا۔
 ان دونوں کے ہتھول فرش پر پڑے ہوئے تھے لیکن ہتھولوں کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ بالآخر وہ ہتھول سکندر نے اٹھا لئے۔ ان کی ٹارچیں بھی فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔ ٹایاب نے ایک ٹارچ اٹھا کر نیچو کے ہاتھ میں تھما دی، دوسری خود سنبھال لی اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے ہوئے وہ تہ خانے سے باہر آ گئے۔
 ”یہ تہ خانہ کیسے بند ہو گا۔“ سکندر نے نیچو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 نیچو بڑے چوتڑے کی اس دیوار کے قریب چلا گیا۔ اس نے اینٹ ٹھما کر اندر لگے ہوئے کنڈے کو کھینچ دیا۔ اوپر والا چھوٹا چوتڑہ سرکنا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا۔
 وہ لوگ نیچے پر چڑھ کر کھنڈروں میں چلنے رہے۔ سب سے آگے سکندر تھا جس نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ اس کے پیچھے نیچو، اس کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی اور آخر میں ٹایاب اور روہی پہلو پہلو رہی تھیں۔ ٹایاب کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی۔
 وہ نیچے کے دوسری طرف ڈھلان پر اتر کر گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر آ گئے۔
 ان کے آگے آگے چلنے ہوئے سکندر بار بار ایک ہاتھ سے کھوپڑی سلا رہا تھا جہاں

اس نے آگے بڑھ کر سکندر کو کھول دیا۔ وہ اٹھ کر اپنی کھوپڑی سلائے لگا۔
 ”مجھے افسوس ہے سکندر بھائی۔“ ٹایاب بولی۔ ”اس لڑکی نے آپ پر اچانک ہی وار کیا تھا اور مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی تھی۔“
 ”کوئی بات نہیں۔“ سکندر کھوپڑی سلائے ہوئے بولا۔ ”افسوس تو مجھے ان جیسے لوگوں پر ہوتا ہے جو دولت کے لالچ میں اندھے ہو جاتے ہیں اور کسی انسان کی زندگی ان کے نزدیک کی اہمیت نہیں رکھتی۔“
 ”میرا خیال ہے انہیں خزانے کا راستہ بتا دینا چاہئے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر یہاں آئے ہیں۔ میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ خاموش ہو کر نیچو کی طرف دیکھنے لگی۔ روہی بھی اس سے لپٹی ہوئی تھی۔
 ”میں ہمیں خزانے کا راستہ ضرور بتاؤں گی مگر ایک بات ذہن میں رکھ لو۔ اس جیسے درجنوں زہریلے ٹاگ اس خزانے کی حفاظت کر رہے ہیں اور وہ سانپ ایسے ڈھیر لے ہیں کہ کسی کو دس لیں تو اس کی لاش چند سیکنڈ میں راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔“
 ”نہن۔ نہیں۔ ہمیں خزانہ نہیں چاہئے۔“ نیچو بھلایا۔ ”میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں مگر مجھے ان باتوں کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان میں کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ خدا کے لئے ہمیں محتاف کر دوں۔ ٹایاب۔ لالچ نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کریں گے۔“
 ”اور ہمیں یہ وعدہ بھی کرنا ہو گا کہ واپس جانے کے بعد کسی سے ان واقعات کا ذکر نہیں کرو گے۔“ ٹایاب بولی۔
 ”وو۔ وو۔ وعدہ کرتے ہیں۔“ نیچو بھلایا۔
 ”تو پھر۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو۔“ ٹایاب نے کہا اور پھر سنہری ٹاگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھو۔ اب تم جاؤ کوئی خطرو نہیں ہے مجھے۔“
 سنہری ٹاگ رہنمائی ہوا دیوار میں ایک بل میں غائب ہو گیا۔ نیچو اور روہی وحشت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔
 چلو۔ اپنا سامان سمیٹو۔“ ٹایاب نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہماری بد قسمتی کے تم لوگوں سے آہنا سامنا ہو گیا۔“

”بد قسمتی نہیں۔ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھو۔“ سکندر نے کہا۔ ”ان نیلوں میں ہے شہر زہرے پر سانپ ہیں۔ تم دونوں کی قسمت ابھی قحی جو چاہے۔“

”ایک بات بتاؤ مسٹر ملک۔“ نیپو نے کہا۔ ”شہر میں فروخت ہونے والے دو ہیروں میں نے دیکھے تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہ ہیرو بہت ہی بڑے ہیں اور اسی لئے تو وہ اب تک پچاس لاکھ میں فروخت ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے قیمت اس سے بھی آگے بڑھے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی ان کھنڈروں میں کوئی خزانہ موجود ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ سکندر بولا۔

”ان ہیروں کے بارے میں تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا تھا کہ وہ مس ٹایاب نے فروخت کئے تھے اور مس ٹایاب کے بارے میں پتہ چلا کہ اس گاؤں میں اس کے ساتھ کچھ پراسرار اور ناقابل یقین قسم کے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ ان کھنڈروں کے حوالے سے بھی کچھ پراسرار قسم کی باتیں سنی تھیں۔ ان سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی خزانہ موجود ہے اور مس ٹایاب کو وہ خزانہ مل گیا ہے۔ اس لئے ہم یہاں آئے تھے۔ لیکن۔۔۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔“

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ گاؤں پر سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن اچانک ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز نے سناٹا توڑ دیا۔ تین چار کتے اچانک ہی کسی گلی سے نکل کر بھونکنے ہوئے ان کی طرف لپکے تھے۔ سکندر نے کتوں کو ڈانٹ دیا۔ وہ اس کی آواز پہچان کر پیچھے ہٹ گئے۔ دہلی اور نیپو کتوں کو دیکھ کر سم گئے تھے۔

دو تین گلیوں میں سے گزر کر وہ چوہلی کے سامنے آ گئے۔

”تم لوگ یہاں روکو۔ میں اندر سے دروازہ کھولتا ہوں۔“ سکندر کہتے ہوئے چوہلی کے بڑے چھانک کی طرف بڑھ گیا۔

دھک کے جواب میں چھانک کا ذیلی دروازہ رسول بخش نے ہی کھولا تھا۔ وہ آج کل چوہلی ہی میں رہ رہا تھا۔ سکندر اندر داخل ہو کر بیٹھک کی طرف مڑ گیا۔ بیٹھک میں داخل ہو کر اس نے گلی والا دروازہ کھول دیا اور ٹایاب اور نیپو وغیرہ اندر آ گئے۔

پتھوں کی ضرب سے گمراہ سا بن گیا تھا اور اس میں بھی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں کون تھے اور انہیں چھوڑنے کے نیچے اس تہ خانے کا پتہ کیسے چلا تھا؟

سکندر کی پوری زندگی اسی گاؤں میں گزری تھی۔ لڑکپن میں وہ لوگ کھیلنے کھیلنے انہی کھنڈروں میں آیا کرتے تھے۔ پھر جب جوان ہوئے تو انہوں نے کھنڈروں میں چھپے ہوئے خزانے کے بارے میں باتیں سنیں۔ وہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھنڈروں میں خزانہ تلاش کرنے آیا کرتا تھا۔ بیسیوں مرتبہ ہر گھر کے اس بوڑھے درخت اور چھوڑے کی طرف بھی آیا تھا۔ یہاں انہوں نے چھوڑے کی ایک ایک اینٹ کو ٹھوک بجا کر دیکھا تھا لیکن انہیں تہ خانے کا سراغ نہیں ملا تھا اور ان دونوں نے آتے ہی وہ تہ خانہ تلاش کر لیا تھا۔ سکندر نے اپنی رفتار کم کر دی اور نیپو کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے جس میں ان کھنڈروں میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ اس چھوڑے کے نیچے تہ خانے کا پتہ کیسے چلا؟“

”دراصل۔۔۔“ نیپو بولا۔ ”شہر میں جب ان تین ہیروں کے بارے میں پتہ چلا تو تحقیقات کے دوران ہماری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو چند سال پہلے خزانے کی تلاش میں ایک پارٹی کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ یہاں ان کے دو آدمی پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے تھے اور ان کے باقی ساتھی ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ سراج بھی ان میں سے ایک تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سراج کو جب یہ پتہ چلا کہ شہر خزانے کے چلر میں ہوں تو اس نے میرا بڑا مذاق اڑایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں کوئی خزانہ نہیں ہے۔ میں نے اسے انہی ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس نے مجھے باتوں ہی باتوں میں اس تہ خانے کے بارے میں بتایا۔ یہ تہ خانہ انہی لوگوں نے تلاش کیا تھا۔“

سراج نے نہیں گاؤں کے لوگوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ ہمارے لئے مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے یہاں اگر سب سے پہلے ہم نے یہ تہ خانہ تلاش کیا۔ یہاں اپنے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ دن میں ہم اس تہ خانہ میں پرے رہتے اور رات کو باہر نکل کر خزانے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں

تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ ہیرے کی قدیم خزانے کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں اس خزانے کا خیال آیا تھا۔ میں نے وہ کتاب تلاش کی اور ایک بار پھر توجہ سے وہ سب کچھ پڑھا اور جب میں تحقیقات کرتا ہوا اس گاؤں تک پہنچا تو یہاں کے حالات اور واقعات کے بارے میں جاننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی خزانہ موجود ہے۔ ہمیں پناہ کیلئے ایک اچھی جگہ مل گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور ہم وہ خزانہ تلاش کر لیں گے لیکن میں پھر وہی سوال کروں گا۔ کیا واقعی یہاں کوئی خزانہ موجود ہے یا یہ مٹھن قصے ہیں۔

”خزانہ موجود ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اور شہر میں فروخت کئے جانے والے ہیرے اسی خزانے سے حاصل کئے گئے تھے اور وہ خزانہ میرے قبضے میں ہے۔“

”لیکن حیرت ہے۔ آپ اس خزانے تک کیسے پہنچیں۔ میرا مطلب ہے وہ زہریلے ناگ؟“ ٹیپو خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ ناگ میرے دوست ہیں۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے دیکھ ہی لیا تھا کہ وہ سنہری ناگ میرا کماناں کر رہا تھا۔ اگر وہ ہمیں ڈس لیتا تو تمہاری لاش چند سینکڑوں اندر اندر جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بات ساری نیت کی ہے۔ ہمارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہم اس خزانے کا کوئی حصہ ذاتی تصرف میں لائیں گے۔ اس خزانے کے حوالے سے ہم نے لوگوں کی بھلائی کیلئے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“

”وہ تو درست ہے۔“ ٹیپو بولا۔ ”لیکن ان زہریلے سانپوں نے آپ کو خزانے تک پہنچنے سے نہیں روکا؟“

”یہ بہت لمبا قصہ ہے ٹیپو۔“ اس مرتبہ سکندر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بات احساس کی ہے۔ ٹایاب نے اس سنہری سانپ کی ایک ٹیولے سے بان بچائی تھی۔ اس نے ٹایاب کا یہ احسان مانا اور اسے خزانے تک لے گیا لیکن ٹایاب نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ اس خزانے کو لوگوں کی بھلائی کیلئے استعمال کرے گی۔“

”ملک صاحب!“ ٹیپو اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لاچ انسان سے پتہ نہیں کیا کچھ کدوا رہا ہے۔ خزانے کے لاچ نے ہمیں بھی اندھا کر دیا تھا لیکن اس تہ خانے میں جو کچھ

”تم لوگوں نے کھانا وغیرہ کھایا ہے یا نہیں؟“ سکندر نے باری باری دہلی اور ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کھانا تو ہم نے کھا لیا تھا لیکن اس وقت اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔“

”میں ابھی بخواتا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔ ”اس وقت تو میں بھی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔ اس لڑکی نے میرے سر پر جو چوٹ لگائی تھی اس سے میرا داغ اب تک گھوم رہا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے ملک صاحب!“ دہلی نے کہا۔ اس کے کہنے میں ندامت تھی۔

سکندر نے آواز دے کر رسول بخش کو بلایا اور اسے چائے بنانے کیلئے کہہ دیا۔ رسول بخش تقریباً بیس منٹ بعد چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ایک ایک کپ ان سب کے سامنے رکھ دیا۔

”ٹیک ہے۔ تم جا کر سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے۔“ سکندر نے کہا اور رسول بخش باہر چلا گیا۔

”تم لوگ کون ہو اور اس خزانے کے پتھر میں کیسے پڑ گئے۔“ سکندر نے ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں شہر کے ایک پرائیویٹ کالج میں لیچرار ہوں۔“ ٹیپو نے جواب دیا۔ ”اور یہ میری دوست دہلی ہے۔ ایک پرائیویٹ کیمپنی میں ایگزیکٹو ہے۔“

”مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”تم ایک لیچرار اور یہ ایک کیمپنی میں ایگزیکٹو۔ دونوں پڑھے لکھے ہو۔ ان لغویات میں کیسے پھنس گئے۔“

”لاچ۔“ ٹیپو نے گمراہ ساٹن لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”دراصل میں نے کسی کتاب میں ان کھنڈرات کے بارے میں پڑھا تھا۔ رانی شیا کی ریاست کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ رانی شیا کو اس کے اپنے ہی لوگوں نے زندہ جلا دیا تھا اور یہ بھی کہ رانی شیا کا خزانہ اب بھی کھنڈرات میں کہیں موجود ہے۔ میں نے پہلے خزانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا لیکن بعد میں دن ”فوق“ اخبارات میں کچھ ایسی خبریں پڑھتا رہا کہ بعض لوگ اس خزانے کی تلاش میں ہیں اور پھر جب وہ ہیرے فروخت ہوئے تو ان کے بارے میں سنا گیا کہ ایسے ہیروں کے بارے میں آج تک کچھ نہیں سنا گیا

ہیں۔ مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا مہمان خاندان ہے۔ سب لوگ دہاں رہ سکتے ہیں۔“

”نہیں سکندر بھائی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”دو چار دن کی بات ہوتی تو کوئی پروا نہیں تھی۔ یہ مسئلہ تو اب پتہ نہیں کب تک چلے گا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگوں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔“

لیکن نہ بھی ثایاب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانی اور کچھ ہی دیر بعد وہ رابعہ کے بھائی اور چند اور آدمیوں کو لے کر پرانی حویلی پہنچ گئی۔ ثایاب کی عدم موجودگی میں حویلی میں بہت سا کام ہو چکا تھا۔ گراؤنڈ فلور کے تین چار کمرے تو بالکل صاف کر دیئے گئے تھے۔

دہلی اور نیچو اس حویلی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہیں یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ ثایاب کا اپنے سسرال والوں کے مسئلہ پر تنازعہ چل رہا تھا اور ثایاب نے اس حویلی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہیں ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ حویلی آسیب زندہ ہے اور یہاں کچھ پراسرار قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔

قیوم اور اس کے ساتھی حویلی میں کام میں مصروف ہو گئے۔ ثایاب نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ پہلے وہ اوپر کا ایک کمرہ صاف کر دیں کیونکہ اس نے خود اوپر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر وہ نیچو اور دہلی کو لے کر اپنی گاڑی پر لوہو پور چلی گئی۔

وہ تینوں چار بجے تک لوہو پور میں مصروف رہے اور پھر شام کو مختلف اشیاء سے لدا ہوا ایک ٹرک پر پرانی حویلی پہنچ گیا۔ اس وقت ملک سکندر بھی دہاں موجود تھا۔ قیوم اور اس کے ساتھی ٹرک سے سامان اتار کر حویلی میں پہنچا رہے تھے اور سکندر خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

اس سامان میں چارباٹیاں بھی تھیں، بستر بھی، راشن کا ہر قسم کا سامان، کئی بیڑو میکس، کیو سیون آئل کے چولے اور ہر وہ چیز موجود تھی جس کی گھر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سب سے پہلے بیڑو میکس روشن کر کے انہیں مختلف جگہوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ بیڑو میکس اوپر پہنچا دیئے گئے۔ ایک بھروسے میں اور دو سرا ثایاب کیلئے صاف کئے جانے

بھی ہوا، اسے دیکھ کر ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ روپے پیسے کی ہمارے پاس بھی کی نہیں ہے۔ اب کم از کم میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ بغیر کسی طمع اور لالچ کے، خدمت خلق میں آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔“

”میں بھی۔“ دہلی نے کہا۔

”اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے۔“ سکندر نے کہا۔ ”اب رات زیادہ ہو چکی ہے۔ تم لوگ آرام کو راج کر سوج بات کریں گے۔“

اس نے ثایاب کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اٹھ کر بیٹھک سے باہر آ گئے۔ ثایاب اور سکندر کچھ دیر تک برآمدے میں کھڑے بائیں کمرے رہے پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

بیسویں ○ قسط

ثایاب کے اس اچانک فیصلے نے سب ہی کو چونکا دیا تھا۔

ثایاب نے صبح ناشتہ کے فوراً بعد ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ان ہی پرانی حویلی میں منتقل ہو جائے گی۔ بڑے ملک صاحب نے بھی اس کی مخالفت کی تھی کہ جب تک عدالت سے فیصلہ نہ ہو جائے اس دہاں منتقل نہیں ہونا چاہئے لیکن ثایاب اڑ گئی کہ اپنے شوہر کی زمینوں پر رہنے کا اسے بھی حق حاصل ہے۔ عدالت اس پر یہ پابندی تو نہیں لگا سکتی کہ کوئی فیصلہ ہونے تک وہ اپنے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔ البتہ اگر عدالت کا فیصلہ اس کیخلاف ہوا تو وہ بلا تاخیر حویلی خالی کر دے گی۔

”تمہاری منطق مان لیتے ہیں کہ تمہیں اپنے گھر میں رہنے کا حق حاصل ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”لیکن اتنی بڑی حویلی میں تم آکیل کیسے رہو گی۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔“

”مجھے کچھ نہیں ہو گا سکندر بھائی۔“ ثایاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور پھر میں دہاں آکیل نہیں رہوں گی۔ نیچو اور دہلی میرے ساتھ ہوں گے۔ انہوں نے نہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میری حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اب اس گھر میں اتنے لوگ کیسے رہ سکتے ہیں۔ رابعہ بھی ہے اور رابعہ کے مکان کی تعمیر مکمل ہونے تک ریاض بھی یہیں رہے گا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”ہم مہمانوں سے گھبرانے والے نہیں

”آپ نے سب کو واپس بھیج دیا۔“ ربی نے واپس آتے ہوئے ٹایاب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اتنی بڑی حویلی میں ہم تین اکیلے رہیں گے۔ میرا مطلب ہے چاروں طرف ویرانہ ہے۔ سنا ہے اس علاقے میں ڈاکو وغیرہ بھی بہت ہوتے ہیں۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن ڈاکو اس حویلی کا رخ نہیں کر سکتے۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ٹایاب انہیں لے کر اوپر آگئی تھی۔ برآمدے میں پانچ چھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک طرف پیڑویکس بھی روشن تھا۔ ربی برآمدے کی عراب کے قریب کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ دور دور تک تاریکی اور سناٹا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھوکا ربی کے جسم سے لگرایا اور وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ موسم میں ہلکی سی خنکی ضرور تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہوا کے جھوکے سے کپکپی چڑھ جاتی۔ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”سنا ہے آپ کا چہرہ دھڑکیلی سے جائیداد کا کوئی تنازعہ ہے۔“ ٹیپو نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تنازعہ کس وجہ سے ہے۔“

”میں چہرہ خاندان کی ہو ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن میرے سرسرا والے میرے شوہر کا حصہ مجھے دینے کو تیار نہیں ہیں اور میں نے اپنا حصہ وصول کرنے کیلئے عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔“ ٹایاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تفصیل سے سب کچھ بتانے لگی۔ پھر ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ تو پردہ فرمیں۔ خزانے وغیرہ کے بکرمیں کیسے بڑھتے تھے۔“

”انسان کے پاس دولت کے انبار ہی کیوں نہ لگے ہوں لیکن اس کی فطرت میں شامل لالچ ختم نہیں ہوتا۔“ ٹیپو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لفظ کا شکر ہے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ شرمیں تین بیٹے ہیں۔ ایک میں، میں خود رہتا ہوں اور دو کرائے پر دے رکھے ہیں۔ میں نے بیوی کے انتقال کے بعد شادی بھی نہیں کی۔ کوئی اولاد بھی نہیں۔ لیکن وہی فطرت۔ میں لالچ میں آگیا لیکن اب ایک بات آپ کو بھی ماننی پڑے گی کہ خزانے کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا۔“

”ہاں۔“ ٹایاب بولی۔ ”اس حد تک تو ہمارا اندازہ درست نکلا کہ کھنڈرات میں کوئی

والے کمرے میں رکھوا دیا گیا۔ ایک پیڑویکس حویلی کے گیٹ کی دیوار پر رکھ دیا گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں حویلی کے گیٹ پر اور چھوٹوں میں رکھے ہوئے پیڑویکس بڑا پر اسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ سکندر نے تو کہا تھا کہ سامان آرام سے سیٹ ہوتا رہے گا، وہ لوگ گاؤں چلیں۔ رات کا کھانا گھر پر کھالیں اور رات بھی وہیں رہیں لیکن ٹایاب نے گویا طے کر لیا تھا کہ آج رات کا کھانا بھی یہیں کھایا جائے گا اور رات بھی یہیں بسر ہوگی۔

مکین میں فرش پر ہی چولہا رکھ کر ربی نے سامن کپکے کو چڑھا دیا تھا۔ ٹایاب شمر سے ہر چنے لے کر آئی تھی۔

قیوم اور اس کے ساتھی بڑے جوش و خروش سے کام کر رہے تھے۔ وہ سب لوگ گویا ہلکے مٹا رہے تھے۔ وہ سب ہی جانتے تھے کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے اور پچھلے چند روز کے دوران یہاں دو آدمی بھی پر اسرار طور پر ہلاک ہو چکے ہیں۔ چہرہ سعادت اور ملنگی کا شرم بھی ان سب نے دیکھا تھا کہ کسی ناویدہ قوت نے کس طرح انہیں مار مار کر حویلی سے باہر پھینک دیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے دلوں میں کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس حویلی کے آسیب ٹایاب لی لی کے دوست تھے۔ وہ کئی روز تک ٹایاب کی عدم موجودگی میں بھی کام کرتے رہے تھے لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

رات گیارہ بجے کھانا تیار ہوا۔ برآمدے میں دسترخوان بچھا لیا گیا تھا۔ ربی نے سامن تیار کیا تھا اور روٹیاں بھی اسی نے پکائی تھیں۔ سامن بہت لذیذ تھا۔

ساڑھے بارہ بج گئے۔ سکندر اور قیوم وغیرہ واپس جانے لگے تو ٹایاب نے گاڑی سکندر کے حوالے کر دی۔

”آپ صبح ہماری خبریت دریافت کرنے تو آئیں گے۔ اس لئے یہ گاڑی لے جائیے۔ صبح یہاں آنے میں آسانی رہے گی۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔

سکندر کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ اس نے کچھ کے بغیر چابیاں لے لیں اور قیوم وغیرہ کے ساتھ حویلی سے باہر آگیا۔ ٹایاب، ربی اور ٹیپو حویلی کے پھاٹک تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد میرے باپ کی دولت پر بیٹھ کرے گا لیکن اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے والد اور بھائیوں کی وجہ سے خاندان کے تمام لوگوں نے بھی مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ کوئی مجھے اپنے گھر میں نہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے گریجویشن کیا تھا اور خوش قسمتی سے شادی سے دو سال پہلے ایم بی اے بھی کر لیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ ایم بی اے کرنے کے بعد کوئی ملازمت کروں گی لیکن یہ ڈکری میرے کام آگئی۔

مجھے ایک ایسی پمپل کمپنی میں ملازمت مل گئی اور پھر میں اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے اس کمپنی میں ایگزیکٹو بن گئی۔ میری تنخواہ بھی بہت معتدل ہے۔ کمپنی کی طرف سے بلکہ کار اور ہر سولت ملی ہوئی ہے۔ کمپنی نے مجھے جو بلکہ لے کر دیا اس کے پردوں میں یہ پروفیسر صاحب رہائش پذیر ہیں۔ شروع میں تو سرسری علیک سلک ہوئی رہی پھر فارغ وقت میں کبھی میں ان کے ہاں چلی جاتی اور کبھی یہ میرے ہاں آ جاتے اور پھر ایک روز انہوں نے مجھے خزانے کے بارے میں بتایا تو میں فوراً ہی ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی کیونکہ مجھے دولت کی ضرورت تھی اور میں اپنے باپ اور بھائیوں کو بچا دکھانا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پاس دولت کے انبار دیکھ کر میرا باپ اور بھائی نہ صرف مجھے معاف کر دیں گے بلکہ میرے سر آسمانوں پر بٹھائیں گے۔"

"بھئی غلط سوچ تھی تمہاری۔" نایاب نے کہا۔ "والدین کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ وہ ہمیشہ بھلائی کی بات سوچتے ہیں۔ اگر تم شروع ہی میں اپنے باپ اور بھائیوں کا کما مان لیتیں تو ہمیں زندگی کی یہ تمام آفتیں تو نہ اٹھانا پڑیں لیکن۔ دل کی گھٹی بھی بری ہوتی ہے۔ جہن نہیں لینے دیتی۔ میں جانتی ہوں جب کسی سے پیار ہوتا ہے تو دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے پیار نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ زندگی کے آخری لمحوں تک اس نے میرا ساتھ دیا اور جس تو میں یہ مشورہ دوں گی کہ اب بھی اگر تم والد اور بھائیوں سے معافی مانگ لو تو وہ ہمیں قبول کر لیں گے۔"

"میں کوشش کر چکی ہوں۔" روپنی نے جواب دیا۔ "مئی لوگوں کو سچ میں ڈالا۔ خود ان

خزانہ موجود ہے لیکن تم اس خزانے تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے بلکہ میں ممکن ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر بھینک موت کا شکار ہو جاتے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "میں ان کی اطلاع آزا خزانے کی تلاش میں آئے۔ کچھ موت کا شکار ہوئے اور کچھ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے۔"

"حیرت ہے کہ آپ اس خزانے تک کیسے پہنچ گئیں۔" روپنی نے کہا۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔ پھر کسی وقت سنائوں گی۔ لیکن ایک بات تم دونوں ذہن میں رکھنا۔ اس خزانے کے بارے میں صرف میں جانتی ہوں یا سکندر بھائی۔ اب تم دونوں اس راز سے واقف ہوئے ہو۔ وہ بھی اس طرح کہ تم دونوں بھی اسی پکر میں تھے لیکن ہمیں بھی صرف اتنا بتایا ہے کہ ان کھنڈروں کے نیچے کوئی خزانہ موجود ہے۔ اس کا راستہ ہمیں بھی معلوم نہیں۔ گاؤں والوں میں سے کوئی بھی اس خزانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے تم دونوں اس سلسلے میں اپنی ذہانتیں بند رکھو گے۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ کسی کو پتہ چل گیا تو وہ خزانے تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس خزانے تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ خزانے کا چچا نہ ہو۔"

"مطمئن رہئے۔ ہماری ذہانتیں بند رہیں گی۔" نیچو نے کہا۔

"اور روپنی تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" نایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں۔" روپنی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "میرا تعلق شر کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں کا نام نہیں بتانا چاہتی کیوں بقول ان کے وہ عزت والے لوگ ہیں اور میرا ان سے تعلق ان کی رسوائی کا باعث بن سکتا ہے۔ میں نے اپنے باپ اور بھائیوں کی مرضی کے خلاف انفعال سے شادی کی تھی۔ انفعال مجھے بہت چاہتا تھا۔ وہ میرے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے گھر والوں کی ناراضگی عارضی ہو گی لیکن شادی کے بعد جب اسے پتہ چلا کہ گھر والوں نے مجھ سے غلط توڑ لیا ہے اور والد نے مجھے عاق کر دیا ہے تو اسے برا صدمہ ہوا۔ وہ بھی بدل گیا۔ اس نے شادی کے صرف سات مہینے بعد مجھے طلاق دیدی اور اس طرح لاپتہ ہوا کہ تلاش کے باوجود میں اس کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس نے دولت کے لالچ میں مجھ سے شادی کی تھی۔

روشنی میں سونے کا عادی نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں اس حویلی ہی کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے پھر روپہی کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کے کچھ دیر بعد نیچو بھی سو گیا۔

روپہی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہو گی لیکن دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھیں پیڑویکس شاید تیل ختم ہونے کی وجہ سے بجھ گیا تھا۔ اندھیرے میں روپہی کو محفل سی محسوس ہونے لگی اور پھر دفعتاً اسے یوں لگا جیسے شاید سوئی کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوں وہ کانپ اٹھی بند کمرے میں سوئی کی ایسی لہر۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی اور پھر ایک اور خیال ذہن میں آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے شاید کسی پر اسرار قسم کی کمائی میں پڑھا تھا کہ جس کمرے میں آسیب ہوں وہاں اچانک ہی اس طرح کی خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔

روپہی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ چرچاہٹ کی بجلی کی آواز سنا دی۔ جیسے راہداری میں کوئی دروازہ کھل رہا ہو اور پھر راہداری میں ہماری قدموں کی آواز سنا دی۔ اس کے ذہن میں ٹایاب کا خیال آکر ابھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ ٹایاب کے قدموں کی آواز نہیں تھی۔ اس نے تو بڑی ٹانگ سی چہل پھن رہی تھی اور یہ کسی مرد کے ہماری جوتوں کی آواز تھی۔ ہماری قدموں کی وہ آواز دروازے کے سامنے آ کر رک گئی اور پھر یوں لگا جیسے کسی نے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا ہو۔

روپہی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ خوفزدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کے گھٹا ٹاپ اندھیرے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ چاہائی سے اتر کر اندھیرے میں ٹوٹتی ہوئی اس طرف بڑھنے لگی جہاں نیچو کی چاہائی تھی۔ خوف اس کے دل میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ لرزتی ہوئی خوفزدہ سی آواز میں نیچو کو پکارا بھی تھا لیکن نیچو شاید گہری نیند میں تھا۔

روپہی دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے آگے بڑھتی رہی دونوں بستروں کے درمیان پانچ فٹ فٹ کا فیصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ خوف سے روپہی کی حالت خیر ہو رہی تھی۔ دروازہ ایک بار پھر ہولے سے چرچایا باہر سے کسی نے دروازے پر دباؤ ڈالا تھا۔ روپہی کے منہ سے چیخ نکلتی تھی وہ مٹی اس کی کانٹیں کپکپاتے

کے دروازے پر مٹی لیکن وہ کسی طرح ہیری بات سننے کو تیار نہیں ہوئے۔
 ”ایک بار میں بھی کوشش کر کے دیکھوں گی۔ ذرا یہاں کے کاموں سے منٹ اور ٹایاب نے کہا۔ پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب ڈھائی بج چکے ! باقی بائیس کل دن میں ہوں گی۔ میرا خیال ہے اب سو جانا چاہئے۔ میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں۔“
 وہ تینوں کرسیوں سے اٹھ گئے۔

بیزویوں پر بھی ایک پیڑویکس چل رہا تھا۔ نیچے آکر ٹایاب نے بیڑیوں والا با گیٹ بند کر دیا اور انہیں ساتھ لے کر حویلی کے اندر بیٹھنے میں آگئی۔ ان دونوں الگ الگ کمروں میں بستر لگائے گئے تھے لیکن روپہی الگ کمرے میں سونے کو تیار نہیں بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اتنی بڑی حویلی میں اسے پہلے ہی ڈر لگ رہا تھا۔ ٹایاب کے جانے کے بعد روپہی اپنا بستر اٹھا کر نیچو کے کمرے میں آگئی۔ نیچو اس کی چاہائی اٹھا لیا تھا ”لگتا ہے یہ حویلی بت پرانی ہے۔ میرا خیال ہے کم از کم سو سال پہلے تعمیر ہوئی گی۔“ نیچو نے اپنے بستر پر لیٹنے ہوئے کہا۔

”سنا ہے اس طرح کی پرانی حویلیوں میں آسیب وغیرہ ڈیرے جمالیتے ہیں لیکن ہمارا ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اس کے باوجود ایک اٹھانا سا خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”آج سارا دن حویلی میں بڑی رونق رہی ہے۔ ابھی تک تو میں نے ایسی کوئی با محسوس نہیں کی۔ دیسے میں آسیب وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا۔ سب کچھ وابعد ہوتا ہے۔ ا تم بھی آرام سے سو جاؤ۔“ نیچو نے کہا اور پھر بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”پیڑویکس دروازے کے عین سامنے راہداری میں رکھا ہوا ہے۔ آنکھوں پر روشنی پڑ رہی ہے۔ اسے راہداری میں ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔“

”نہیں۔“ روپہی جلدی سے بولی۔ ”پیڑویکس اندر لے آؤ اور دروازہ بند کر کے آ گاؤ۔ مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔“

نیچو نے راہداری میں رکھا ہوا پیڑویکس اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا دروازہ بند کر کے کھڑا پڑھا دیا۔ کمرے میں حیرتزدہ تھی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی

اور پھر ٹیک اسی لمحہ اچانک ہی کمرہ ایک دم روشنی سے بھر گیا۔ تیز روشنی سے ایک لمحہ کو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور جب روشنی سے مانوس ہوئیں تو اس کی آنکھیں خوف سے جھپٹی چلی گئیں۔

نیچہ اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا تو پھر وہ کس سے لپٹی ہوئی تھیں اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل اور وہ ایک جھگٹے سے لگ ہٹ گئی اور پھر اس کے منہ سے ایک اور خوفناک چیخ نکل گئی۔ وہ نیچے سوجھ کر لپٹی تھی، وہ کوئی انسان نہیں بلکہ انسانی ڈھانچہ تاجروں کے سامنے کھڑا تھا۔

نیچہ بھی یہ منظر دیکھ کر دہشت زدہ سا ہو گیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر رومبلی کی طرف پلکا۔ رومبلی دوڑ کر اس سے پٹ گئی۔

وہ انسانی ڈھانچہ چند لمحوں کے سامنے کھڑا رہا پھر اس طرح اچھلا جیسے اس کے پیروں کے نیچے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔

اس کمرے میں دروازے کے دونوں طرف اوپر دو دیوے دیے روشن دان تھے۔ جن کے آگے تقریباً ایک ایک فٹ چوڑے کارلس بنے ہوئے تھے۔ وہ ڈھانچہ ایک کر ایک روشن دان کے کارلس پر بیٹھ گیا اور پھر اس کی ہڈیاں ٹکوں کی طرح فولہ ہو گئیں اور وہ روشن دان سے باہر نکل گیا۔

رومبلی دہشت زدہ ہو کر نیچے سے لپٹی ہوئی تھی۔ نیچہ کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ان دونوں کے جسم خوف سے لرز رہے تھے۔

”وہ۔ وہ چلا گیا۔“ نیچے نے کہا۔ اس کی آواز میں کیکپاٹ نمایاں تھی اور وہ روشن دان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رومبلی بڑی مشکل سے اس سے انگ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ وہ دہشت زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور پھر اس کی نظریں دوسرے روشن دان کی طرف اٹھ گئیں۔

”وہ۔ وہ پیڑوینکس وہاں کس نے رکھا تھا۔“ وہ روشن دان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھلائی۔

نیچہ بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ پیڑوینکس روشن دان کے سامنے کارلس پر رکھا ہوا تھا۔

گئیں۔ اس نے ایک بار پھر نیچہ کو پکارا مگر آواز اس کے حلق میں انکب کر رہ گئی۔ وہ اب دم آگے کو دوڑی اور پھر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ دیوار سے ٹکرائی تھی اس کی پیشانی پر چوٹ لگی۔ وہ ایک ہاتھ سے پیشانی سلاتے ہوئے کراہنے لگی۔

رومبلی کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ نیچہ کس قدر غفلت کی نیند سو رہا ہے۔ بار پکارنے اور اس کی چیخ کے باوجود اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ دیوار سے کراہنے کے بارے میں سمجھ گئی کہ نیچہ کی چارپائی کی طرف جانے کے بجائے وہ دوسری طرف چلی گئی تھی اور دیوار سے ٹکرائی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ چارپائی کس طرف تھی۔

راہداری میں بھاری قدموں کی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ آواز دور بنتی ہو محسوس ہو رہی تھی۔ رومبلی کے منہ سے ایک گمراہ سا نکل گیا، وہ جو کوئی بھی تھا واپس رہا تھا۔

رومبلی ایک بار بھرتلوتی ہوئی چارپائی کی طرف بڑھنے لگی اور پھر دھب کی آواز سن۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کوئی اس کے قریب ہی اوپر۔ کورا ہو۔ وہ جھپٹی ہوئی آگے دوڑی۔ اس مرتبہ وہ چارپائی سے ٹکرا کر گری۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

اس مرتبہ چیخ کی آواز سن کر نیچہ کی آنکھ کھل گئی۔

”کون ہے۔ کیا ہوا۔؟“ اس کی خوابیدہ سی آواز رومبلی کی سماعت سے ٹکرائی۔

”میں ہوں نیچہ۔“ رومبلی کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ”کمرے میں کورا ہے۔ وہ۔ وہ۔“

”اندھیرا کیوں ہے۔ تم نے لیپ کیوں بجا دیا۔“ نیچہ پولا۔

”لیپ میں نے نہیں بجا دیا۔“ رومبلی بھلائی۔ ”میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ تم کہاں ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”میں یہاں ہوں۔ اس طرف۔“ نیچہ نے کہا۔

رومبلی دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے آواز کی طرف بڑھنے لگی اور دو تین قدم اٹھائے کے بعد ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ نیچہ تھا۔ وہ خوفزدہ تھی۔ والمانڈ انداز میں اس سے پٹ گئی۔

ہی آہٹگی سے دروازہ کھولا تھا۔ دروازے کی چڑاہٹ کی ہلکی سی آواز بھی سنانے میں کھیل گئی تھی اور پھر ان دونوں نے اکٹھے ہی دروازے کے باہر قدم رکھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ وہی کے منہ سے ایک خوفناک چیخ گئی۔

دروازے کے عین سامنے ہی انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ وہی کے ہاتھ سے پیڑو میکس گر کیا اور وہ جیتی ہوئی ایک بار پھر نیچے سے لپٹ گئی۔

پیڑو میکس ڈشٹن پر گرتے ہی اس کا تھل فرش پر بکھر گیا اور اس میں آگ لگ گئی۔ نیچے وہی کو اپنے ساتھ لپٹائے دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا راہداری میں ایک طرف کو ہٹنے لگا۔ تھل راہداری میں پھیلا تھا اور شیطانی زیادہ بلند نہیں تھے۔ شیطانی کے دوسری طرف راہداری کے آخری سرے پر وہ ڈھانچہ اس طرح کھڑا تھا جیسے ان کا مذاق اڑا رہا ہو۔

”عجب۔ بھاگو۔ نیچے بھاگو۔“ وہی ایک بار پھر چیختی۔

نیچے اسے اپنے ساتھ لپٹائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔ اس ہی صورتحال نے اسے بھی بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ ڈھانچے کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ شاید یہ ڈھانچہ انہیں حویلی سے باہر نہیں نکلے دے گا۔

اسی دوران بیڑیوں پر چلنے والے آواز سنائی دی اور پھر ٹایپ کی آواز ان کی سماعت سے گزرائی۔

”کیا ہوا رہی کیوں چیخ رہی ہوں کیا ہوا؟“

”نا۔ ٹایپ۔ بھو۔ بھوت۔“ وہی خوفزدہ سے انداز میں چیختی۔

چند سیکنڈ بعد ہی ٹایپ جلتی ہوئی خارج ہاتھ میں لے کر دوسری راہداری میں نمودار ہوئی اور پھر اس راہداری میں آتے ہی فرش پر لگی ہوئی آگ دیکھ کر چمک گئی۔

”یہ۔ یہ کیا ہوا؟ آگ کیسے لگی۔“ ٹایپ نے پوچھا۔

”یہ۔ یہاں بھوت ہیں۔“ وہی بھلائی ”وہ سامنے ایک ڈھانچہ کھڑا ہے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ بھاگو یہاں سے۔“

”اوہ۔“ ٹایپ آگے بڑھتے ہوئے بولی اس نے ان دونوں کو جس طرح خوفزدہ انداز میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دکھا تھا، وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو گا۔ اس نے سامنے دیکھا لیکن اسے کوئی ڈھانچہ نظر نہیں آیا۔ ”تم لوگوں کو شاید وہم ہو

”م۔ میں نے تو پیڑو میکس وہاں نہیں رکھا تھا۔“ نیچے بھلا کر رہ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہی کوئی جواب دیتی، وہ خود ان کے کاؤس پر رکھا ہوا پیڑو میکس آجکھ سے چند انچ اوپر اٹھا اور وہاں میں تیرتا ہوا پیچھے آئے لگا۔ پیڑو میکس کو اپنی طرف آدیکھ کر وہی ایک بار پھر چیخ کر نیچے سے لپٹ گئی۔

رات کو سونے سے پہلے باتیں کرتے ہوئے نیچے نے کہا تھا کہ بھوت آسیب واہ ہوتے ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کبھی ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ دوسروں سے اس قسم کی باتیں سنتا تو ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ایسی صورتحال سے دوچار تھا کہ خوف سے اس کی جان ٹھل جا رہی تھی۔

ہوا میں تیرتا ہوا پیڑو میکس ان کی طرف آ رہا تھا پھر دفعتاً اس کا رخ مرکبیا اور کمرے کے کونے میں ایسی جگہ فرش پر ٹک گیا جہاں شروع میں رکھا ہوا تھا۔

”ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“ وہی نے خوفزدہ آواز میں بھلائے، ”یہ کہا۔“ چلو بھاگو چلیں یہاں سے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ نیچے نے کہا۔ ”ادھر ٹایپ کے ساتھ چلے نہیں۔“ صورتحال پیش آ رہی ہوگی۔ اس کمرے سے نکلو۔ کوشش کریں گے کہ اسے بھی آواز نہ کر بلا لیں۔“

وہ دونوں چارپائی سے اتر آئے۔ وہی بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی انگلیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ نیچے اسے چھوڑ کر پیڑو میکس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پیڑو میکس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا حسیال تھا پیڑو میکس اپنی جگہ سے ہلکا جائے گا مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ نیچے۔ پیڑو میکس کھڑا اس قدر مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے اس کے ہلکا جانے کا اندیشہ ہو۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ دروازے کا اوپر والا کٹڑا خاصا اونچا تھا وہی بچوں کے بل ایپک کر اسے کھولنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔

”تم پیڑو میکس نیشنالو میں کھوٹا ہوں۔“

نیچے نے پیڑو میکس اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کٹڑا کھولنے لگا۔ کٹڑا ہٹا کر اس نے

زہد ہے اور نایاب انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے وہ محض تیج کی شرارت تھی۔
اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ نایاب اٹھنے لگی تھی اور پھر وہ درہی پر ہی لیٹ کر سو گئی۔ نچوہ اور روہی اس کے بعد بھی دیر تک جاگتے رہے اور پھر وہ دونوں بھی اٹھنے لگے۔

ایک سو ۱۰ قسط

چوہدری سعادت واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے تمام آدمی ایک ایک کر کے نوٹے جا رہے تھے۔ یہ بظاہر تو اس کے مزارع تھے اور اس کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے اور ایسا ہوا بھی تھا۔ اس کے دو تین آدمی تو مارے بھی جا چکے تھے لیکن ان کی جانیں بھی راپیٹ لگی تھیں۔ سعادت کو ان کی موت کا کوئی الموس نہیں ہوا تھا۔ اس کے مزارع اس کی نظروں میں زر خرید غلام تھے اور غلام اپنے آقاؤں کیلئے جانیں دیا ہی کرتے ہیں۔

چوہدری سعادت کو الموس تو اس بات کا تھا کہ وہ ابھی تک نایاب کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ اس پر حملہ کرنا کام رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچانے کی ہر کوشش راپیٹ لگی تھی۔ ایسی ہر کوشش میں چوہدری سعادت کو تو ناکامی کا منہ دیکنا پڑا تھا لیکن نایاب کے حامیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کیلئے ہمدردی بڑھ رہی تھی۔

نواب دین باغی کا بیٹا اس کا سب سے بڑا حمایتی بن گیا تھا۔ اسی کی نگرانی میں پرانی حویلی کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ چوہدری سعادت نے ایک نیا پروگرام بنایا تھا۔ وہ نایاب کے حامیوں کے سزا دے کر انہیں نایاب سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دو آدمیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے تو دوسرے خود بخود پیچھے ہٹنے جائیں گے اور اس مقصد کیلئے اس نے سب سے پہلے نواب دین باغی کے بیٹے قوم کا انتخاب کیا تھا۔

نواب دین باغی کی بیٹی رابعہ پھر پور جوان اور بے حد حسین تھیں چوہدری سعادت کئی روز سے اس پر نظرسن گڑھے ہوئے تھا لیکن اسی دوران نایاب آگئی اور اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اگر نایاب نہ آتی تو وہ رابعہ کا گھونٹ بھر چکا ہوتا۔

گیا ہے۔ یہاں کوئی بموت وغیرہ نہیں ہے۔
”ہم بچ کمرہ ہیں مس نایاب۔“ نچوہ نے بھی ہلکاتے ہوئے کہا۔ ”اس حویلی میں واقعی بموت ہے۔ وہ ڈھانچہ بند کمرے میں آکر روہی سے لپٹ گیا تھا اور جب ہم باہر نکلتے گئے تو اس نے ہمارا راستہ روک لیا۔ روہی کے ہاتھ سے پٹریو میکس کر کر لوٹ گیا اور آگ لگ گئی۔ وہ ڈھانچہ وہاں کھڑا تھا۔ اس طرف۔“ اس نے اشارے سے بتایا۔

”لیکن۔۔۔ مجھے تو وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ نایاب نے کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ دائیں راہداری میں ٹارچ کی روشنی میں ایک سنہری لکیری فرش پر ریختی ہوئی نظر آئی۔ نایاب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سب کچھ کیسے ہوا تھا۔

”تیج۔۔۔“ وہ اس راہداری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ریختی ہوئی وہ سنہری لکیر رک گئی۔ ”یہ کیا مذاق تھا تیج۔ کیا تجھیں معلوم نہیں کہ یہ دونوں اب ہمارے مہمان ہیں اور تم نے انہیں ڈرانا شروع کر دیا۔“

وہ سنہری ٹانگ تیج تھا۔ وہ ریختا ہوا نایاب کے قریب آگیا اور اس کے چہروں سے لپٹتا ہوا راہداری میں جا کر غائب ہو گیا۔

”یہ ساری شرارت اسی تیج کی تھی۔“ نایاب نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تجھیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بس کوئی شرارت سوچھی ہو گی۔ اب یہ تم لوگوں کو تنگ نہیں کرے گا۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔“

”نہیں مس نایاب۔“ نچوہ بولا۔ ”یہ حویلی آسیب زدہ ہے اور ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“
”یقین کر یہاں کوئی آسیب نہیں ہے۔ یہ تیج کی شرارت تھی۔ اب وہ کچھ نہیں کرے گا۔ اگر نہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے تو اوپر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ آج کی رات وہیں گزار لو۔“ نایاب نے کہا۔

وہ دونوں اس بات پر تو آمادہ ہو گئے لیکن نچوہ نے کہہ دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی حویلی سے چلے جائیں گے۔

وہ تینوں اوپر آ گئے۔ نایاب کے کمرے میں ایک بہت بڑی درہی بھی چھپی ہوئی تھی۔ ایک طرف چارپائی تھی جس پر نایاب کا بستر پھینچا ہوا تھا۔ وہ تینوں درہی پر ہی بیٹھ گئے۔ روہی ڈرے ڈرے لیجے میں نایاب کو سب کچھ بتا رہی تھی۔ وہ اب بھی مصر تھی کہ حویلی آسیب

پر اے نشان بتا رہے تھے کہ وہ لڑائی بھڑائی کا عادی ہے۔ اس کی رہائش شہر کے سب سے ٹھیکیا علاقے میں تھی۔ وہ مکان دو سو گز سے زیادہ پڑا نہیں تھا۔ آس پاس کے مکان تو بہت چھوٹے تھے۔ آصف نے یہ مکان کئی سال پہلے کرائے پر لیا تھا۔ شروع کے چند مہینے تو اس نے کرایہ دیا تھا لیکن پھر کرایہ دینا بند کر دیا۔ مالک مکان نے لاکھ بھرتے کیے لیکن آج تک نہ تو کرایہ ملا اور نہ ہی مکان خالی ہوا۔

چوہدری سعادت کو آصف کے مکان میں رچے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔ اس دوران وہ گھر سے باہر نہیں نکلا تھا اور پھر اسے گاؤں کے ایک آدمی کے ذریعے اطلاع ملی کہ ٹایپ اور رابہر شہر آئی ہوئی ہیں۔ چوہدری سعادت کو یاد آگیا کہ وہ دن بعد عدالت میں پیشی ہے۔

چوہدری سعادت کو اگرچہ قدم قدم پر ناکامی کا سامنا ہو رہا تھا لیکن اس جیسے لوگ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والے نہیں ہوتے۔ اس نے ٹایپ کو ٹھکانے لگانے کے لئے ایک اور منصوبہ بنا لیا اور یہ ذمہ داری آصف کے سپرد کر دی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ٹایپ جب پیشی پر حاضر ہونے کیلئے عدالت جائے تو اسے راستے ہی میں ختم کر دیا جائے۔ لیکن دوسرے روز جو صورتحال سامنے آئی اس نے چوہدری سعادت کو بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ ٹایپ پر حملہ ناکام رہا تھا اور پولیس نے آصف اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کر کے اس کے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ آصف بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگ سکا تھا۔

چوہدری سعادت کو اب آصف کے ٹھکانے پر بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس کسی نہ کسی وقت یہاں بھی پہنچ جائے گی اور وہ چھپے کی طرح پکڑا جائے گا۔ وہ اسی رات آصف کو بتائے بغیر وہاں سے نکل گیا۔

چوہدری سعادت نے شہر میں ایک اور مکان تلاش کر لیا تھا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو بھیجے بغیر طور پر وہاں بلا لیا اور اس نے جو انکشاف کئے وہ سعادت کیلئے خاصے سسٹی خیر تھے۔

نور پور پولیس نے ملٹی کو گرفتار کر لیا تھا اور شہر میں بھی ٹایپ نے اپنے بھٹکے کی آنکھوں کی بارے میں بڑی جزی سے تحقیقات کرائی تھی اور یہ ثابت ہو گیا تھا کہ بھٹکے کو

طے شدہ پروگرام کے مطابق چوہدری سعادت کو دن پہلے ہی گاؤں سے چلا گیا تو اس نے سارا کام ملٹی کو سونپ دیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ ایک مقررہ وقت پر وہ د والے ریٹ ہاؤس پہنچ جائے گا۔

ملٹی نے دو آپے کے مشورہ ڈاکو حاکم علی سے رابطہ کر کے پروگرام بتایا اور حاکم۔ اپنے ساتھیوں کو لے کر ٹواب دین باغی کے گھر پر چھائی کر دی اور رابہر کو اغوا کر۔ گئے۔ رابہر کو گاؤں سے دور دریا والے ویران ریٹ ہاؤس میں پہنچا دیا گیا اور ملٹی ۶ گاؤں سے فرار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔

چوہدری سعادت اس روز دریا کے دوسری طرف چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی بہتی میں موجود تھا۔ اسے چند چل گیا تھا کہ رابہر کو ریٹ ہاؤس میں پہنچا دیا گیا ہے۔ ان سے بھی چند چل گیا تھا کہ گاؤں پر سٹل میں ٹواب دین باغی تو مارا گیا تھا لیکن قیوم بچ گیا اور ملک سکندر اور گاؤں کے دوسرے لوگ پورے علاقے میں رابہر کو اغوا کرنے والوں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ پولیس بھی حرکت میں آگئی تھی اس پاس کی بستیوں میں چھاپے مارے جا رہے تھے اور کئی لوگوں کو شہسب کے بنا پر پکڑا بھی گیا تھا۔ پولیس کا سرگرمیاں دریا کے دوسری طرف دیکھنے میں آئی تھیں۔

اس صورتحال میں چوہدری سعادت نے اپنی پناہ گاہ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے سبھاؤ اور بھراگے روز صبح سویرے ہی اسے یہ اطلاع ملی کہ ٹایپ، رابہر کو ریٹ ہاؤس سے چھڑا کر لے گئی تھی۔

چوہدری سعادت سارا دن بہتی کے اس مکان میں بند رہا اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ دو آدمیوں کے ہمراہ اس بہتی سے نکل کھڑا ہوا۔

شہر پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ یہاں بھی پولیس اس کے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے آئی تھی۔ وہ اپنے بھٹکے کا رخ کرنے کے بجائے آصف کے ہاں چلا گیا۔ آصف شہر کا نامی گراں بد معاش تھا اور چوہدری سعادت نے ایسے ہی آدمیوں سے دوستی کا گھم رکھی تھی وہ آصف کو وقتاً فوقتاً لمبی لمبی رقیب دتا رہا تھا اور اب اس کے خیال میں آصف سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔

آصف لباز نہ تھا، منصوبہ ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کی گردن اور چہرے پر زخموں کے

اور آج اس کا اس بستی میں آنے کا مقصد یہی تھا کہ چوہدری ہر گھم سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بستی چند گھروں پر مشتمل تھیں یہاں رہنے والوں کو چوہدری کا خیر خواہ نہ نہیں کہا جاسکتا تھا البتہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے دباؤ میں تھے اور چوہدری کو یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں دیں گے۔

سعادت نے اس روز ہر گھم کے نام پتھام دے کر ایک آدمی کو سرحد پار بھیج دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا پتھام ملے کے بعد ایک دو روز میں ہر گھم یہاں پہنچ جائے گا۔ اسے بستی میں آنے ہوئے تیرا دن تھا۔ چوہدری سعادت صبح دس بجے کے قریب بستی سے نکلا اور کچھوں میں ٹھٹھا ہوا نہر کی طرف نکل گیا۔ نہر کے دونوں طرف ٹاہلی کے درخت تھے۔ چوہدری سعادت نہر کے کنارے پر چڑھا رہا۔ تقریباً نصف میل آگے جا کر وہ رک گیا۔ یہاں نہر کے ساتھ ٹاہلی کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا اور اس سے ذرا آگے دور تک سرکنڈے کا جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔

چوہدری سعادت کا اس طرف آنے کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہزار ہو گیا تھا اور مصل وقت گزارنے کیلئے اس طرف چلا آیا تھا۔ ٹاہلی کے درختوں کی لمبڑی چھاؤں ہڈی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ نہر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور جوتے اتار کر پیر پانی میں ڈال دیئے۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ سربراہت کی آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آواز درختوں کے جھنڈے سے آگے سرکنڈے کے پودوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یوں لگتا جیسے کوئی ان پودوں میں چل رہا ہو۔ شاید کوئی جانور ان پودوں میں گھس گیا تھا۔

چوہدری سعادت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ ٹایاب کی وجہ سے اسے یہ ساری یمنیتیں اٹھانا پڑ رہی تھیں۔ نہ وہ کم بخت گاؤں میں آئی اور نہ یہ سارے مسئلے سر اٹھائے۔ اب وہ اپنے گھر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس پر کسی لوگوں کے قتل کا الزام تھا۔ اگر بات صرف مقامی پولیس تک محدود رہتی تو معاملہ ختم ہو سکتا تھا لیکن اب پولیس پر اوپر سے دباؤ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مقامی پولیس چاہے تو اب بھی مکا ہو سکتا تھا لیکن اس کے لئے خلیفہ رقم اور کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس کی حمایت میں بات

اٹھانے لگتی تھی۔ ملکی کی شناخت بھی ہو گئی تھی۔ چوہدری سعادت کا خیال تھا کہ ملکی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ہے لیکن وہ بڑا ہمسہما نکلا۔ اس نے پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا۔ نہ صرف یہ کہ ٹایاب پر اب تک ہونے والے تمام قاتلانہ حملے چوہدری سعادت نے کرائے تھے بلکہ پچھلے کو آگ بھی اسی کے کتنے پر لگائی گئی تھی۔

پولیس نے بڑی شدت کے ساتھ چوہدری سعادت کی تلاش شروع کر دی تھی۔ سعادت اب تک پھر نکلا کر اپنے خلاف پولیس کی کارروائی روکنے کے لئے کچھ نیاں حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ پولیس پر اوپر سے دباؤ پڑا ہوا تھا اور جو پولیس آفیسر اس کے سامنے دست بدست کھڑے رہتے تھے وہ اب اسے گرفتار کرنے کیلئے ہتھیاریاں لئے گھوم رہے تھے۔

اور پھر اسی رات پولیس نے اس کے شہر والے پچھلے پر چھاپا مارا تھا اور اس کے دو نوکروں کو پکڑ کر لے گئی تھیں اس کارروائی نے چوہدری سعادت کو مزید بدحواس کر دیا۔ پولیس کو گویا یقین تھا کہ وہ شہر میں ہی موجود ہے اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ پولیس کسی نہ کسی وقت اس کے اس خفیہ ٹھکانے پر بھی پہنچ جائے گی۔ اس لئے چوہدری سعادت نے شہرے فرار ہی میں رعایت سمجھی تھی۔

وہ اسی رات شہر سے نکل گیا اور رات بھر سفر کرتا ہوا صبح سویرے اپنے گاؤں سے چند میل دور خیر آباد نامی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گیا۔ یہ بستی دریا کے پاس سرحد کے قریب تھی۔ کئی سال پہلے اس کے باپ نے یہاں بھی کچھ زمین خریدی تھی لیکن ہر سال دریا میں سیلاب کی وجہ سے کمزری فصلیں بہہ جاتی تھیں اس کے باپ نے یہ زمین بیچ دی۔ جن دونوں یہ زمین ان کے پاس تھی، چوہدری سعادت اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں سفلنگ بھی زور و شور سے ہوتی تھیں سرحد پار سے ڈاکوؤں کے گروہ بھی اس علاقے میں آکر لوٹ مار کرتے اور سرحد کے دوسری طرف چلے جاتے۔

سرحد کے دوسری طرف کا ایک نامی گراہی ڈاکو ہر گھم انہی دنوں ایک مرتبہ چوہدری سعادت کا ہمسایہ بن گیا تھا۔ ان دونوں میں یہ معاملہ ہوا تھا کہ چوہدری اور اس کے آدمی اس کے راستے میں راکوٹ نہیں بنیں گے اور وہ انہیں بھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

چمک گیا۔

وہ کوئی آدمی نہیں تھا، لڑکی تھی۔ سعادت کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس کی عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔ لہذا قد، بھرا جسم، دھنڈے اس نے سر پر باندھا ہوا تھا۔ مختصر سی چولی اور گھانگرا پٹے ہوئے تھیں گوری رنگت اور چہرے کے نعوش بڑے دلربا تھے۔ وہ بستی کے ایک کسان جویرے کی بیٹی شادو تھی۔ چوہدری سعادت نے اس لڑکی کو ایک دو مرتبہ بستی میں بھی دیکھا تھا۔ یوں تو بستی میں کئی جوان لڑکیاں تھیں مگر شادو سب سے حسین تھی۔ اسے دیکھ کر وہ لٹھڑی سانس ہی بھر کر رہ جاتا تھا۔ وہ جس صور حال سے دو چار تھا اس بستی میں اس کے پیش نظر وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس بستی کے لوگ بھی اس کے خلاف ہو جائیں لیکن اس وقت شادو کو دیکھ کر اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا تھا۔

شادو کے ایک ہاتھ میں دراتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس نے من بھر کئے ہوئے سرکنڈے اٹھا رکھے تھے۔ اس کا جسم پیسے میں تر ہو رہا تھا۔ سعادت کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے پچکے سے تاثرات ابھر آئے۔ سعادت اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ شادو نے ہٹ کر نکل جانا چاہتا مگر سعادت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

”کہاں نکل کر جا رہی ہو۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں تو جب سے بستی میں آیا ہوں تمہیں دیکھ کر لٹھڑی سانسیں بھر رہا ہوں۔ آج تو قسمت نے یہ موقع دیا ہے۔ کہاں جا رہی ہو۔“

”مجھے جانے دو چوہدری جی۔“ شادو خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔ ”کسی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔“

”قیامت تو میرے دل پر ٹوٹ رہی ہے۔“ چوہدری سعادت نے ڈھلانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ہمیں کون دیکھے گا۔ بستی بہت دور ہے اور دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہ موقع میں کیسے گواہ نکلا ہوں۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔“

شادو کی آنکھوں میں دشت سی تیرنے لگی۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس نے سرکنڈوں کا ٹکڑا پھینک دیا تھا لیکن دراتی ہاتھ میں ہی رکھی تھی۔ چوہدری سعادت نے اچانک ہی چلاگ لگا کر اسے روک لیا۔ شادو نے اپنے بچاؤ کیلئے دراتی استعمال کرنے کی

کر سکیں۔ رقم کا اس کیلئے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن ایسے لوگ کہاں سے لائے جو اس کے حق میں بیان دے سکیں۔ گاؤں کے سب لوگ اس کے خلاف تھے۔ کوئی بھی اس کے حق میں بیان دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ البتہ گاؤں کی پوری آبادی نایاب کے حق میں بیان دینے کو تیار ہو جائی۔

اس نے ہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ نایاب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسے ہر گھم کا انتقام تھا۔ ہر گھم کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑا جیدار ڈاکو تھا۔ سرحد کے دونوں طرف اس کا لہجکا تھا۔ سعادت کو یقین تھا کہ ہر گھم اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لے گا۔

وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سرسراہٹ کی آواز بھر سنائی دی۔ یہ آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی اور اس مرتبہ یوں لگ جیسے کوئی سرکنڈے کے پودے کاٹ رہا ہو۔ وہ گردن سمٹا کر اس طرف دیکھنے لگا۔ بیچ میں ٹالی کے درخت حائل تھے اس لئے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر جوتے پہنے اور درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔

درختوں کے جھنڈ میں چلے ہوئے بھی اسے سرکنڈے کے پودے کاٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا تو ایک جگہ اسے پودے زور زور سے چلے ہوئے نظر آئے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی شخص اندر گھسا ہوا پودے کاٹ رہا تھا۔

اس علاقے میں جا بجا سرکنڈے کے پودوں کے اس طرح کے لمبے چوڑے ڈنڈے تھے۔ یہ پودے کاٹ کر خرمنچ دیئے جاتے تھے جہاں پتھریں اور مختلف چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ سرکنڈے کی خود رو پیداوار سے اس علاقے کے کسانوں کو بھی کچھ اضافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

سعادت کچھ گیا کہ بستی ہی کا کوئی آدمی سرکنڈے کاٹ رہا تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اور آگے بڑھ گیا۔

”کون ہے یہی۔“ یہاں پودے کون کاٹ رہا ہے۔“ وہ پودوں کے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں بولا۔

پودے کاٹنے کی آواز بند ہو گئی۔ ایک لمحہ کو خاموشی چھا کر رہی اور پھر سرسراہٹ کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا باہر آ رہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ چوہدری سعادت

دُخیزو سے نکل کر درختوں کے جھنڈ میں سے ہوتا ہوا نہر کی طرف آگیا۔ دائیں طرف تقریباً پچاس گز زور درخت کا موٹا سا تنہ پر ڈال کر مل سا بنا لیا گیا تھا۔

سعادت اس جتنے پر سے نہر پار کر کے دوسری طرف آگیا اور ایک طویل چکر کاٹا ہوا ہوا ایک اور جگہ نہر عبور کر کے بستی کے دوسری طرف آگیا۔ اس طرف کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دو تین آدمی بھی نظر آئے۔ چوہدری سعادت چند لمبے ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ ان کے پاس رکے کا مقصد یہ تھا کہ بوقت ضرورت وہ اس بات کی گواہی دے سکیں کہ انہوں نے چوہدری کو کس طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ بستی میں پہنچا تو وہاں خاموشی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گویا ابھی تک کسی کو یہ نہیں چل سکا تھا کہ شاد پر کیا بابت چکی تھی۔

چوہدری سعادت اس مکان پر آگیا جہاں وہ رہائش پذیر تھا۔ چھوٹے سے آگن میں نیم کے درخت کے نیچے چارپائی پر اکبر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اکبر زمیندار کا مزارع تھا۔ اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی ہو گی۔ اس عمر میں بھی وہ دن رات محنت مشقت کرتا تھا۔ آج وہ کسی وجہ سے کھیتوں پر نہیں گیا تھا۔ چوہدری سعادت بھی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اکبر جلدی سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

”تم وہاں کیوں بیٹھ گئے۔ چارپائی پر بیٹھو نا۔“ سعادت نے کہا۔

”پانی یہ مجال نہیں چوہدری جی کہ آپ کے برابر بیٹھ سکیں۔“ اکبر نے جواب دیا۔

”ہمارا جگہ تو آپ جیسے چوہدریوں کے قدموں میں ہے۔ ہم یہیں اٹھتے گلتے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تمہوڑا سا پانی پاؤ۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔“ چوہدری سعادت نے کہا۔

گھبر جلدی سے اٹھ کر اندر چلا گیا اور سلور کے ایک گلاس میں ٹھکے سے پانی لے آیا۔ چوہدری سعادت واقعی پیاسا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”بستی میں کوئی آیا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی اجنبی۔“ چوہدری سعادت نے خالی گلاس چارپائی پر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں چوہدری جی۔“ اکبر نے جواب دیا۔ ”چھوٹی سی بستی ہے کسی کے گھر میں کوئی مسافر آتا ہے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے۔“

کوشش کی مگر موقع نہیں مل سکا۔ سعادت نے اس کے ہاتھ سے درانی چھین کر زور پھینکا دی۔ شاد نے چٹنا چاہا تو اس نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا اور اسے سر کنڈوں طرف کھینچنے لگا۔

شاد برہم زور مزاحمت کر رہی تھی مگر چوہدری سعادت اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اگھٹتا ہوا سر کنڈوں کے اندر دور تک لے گیا۔ آگے ایک تالاب سا تھا۔ سعادت نے ا تالاب کے کنارے زمین پر بیٹھ دیا اور کسی خوشنور بھیلے کی طرح اسے ہینہ ہونے لگا۔ شاد مزاحمت کرتی رہی مگر وہ اپنے آپ کو اس بھیلے سے نہیں بچا سکی وہ بے حرکت پڑی تھی اور سعادت اس کے پاس بیٹھا اپنی کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔

شاد کی نظر اس کے پھتل پر پڑ گئی وہ چند لمبے کچھ سوچتی رہی اور پھر اس نے ہ جیزی سے پھتل کھینچ لیا۔ چوہدری سعادت اچھل پڑا۔ وہ بڑی چھپتی سے شاد پر جھپٹا۔ ش کے ہاتھ سے پھتل کا ٹرانگٹر دب گیا۔ گولی چوہدری سعادت کے سر کے قریب سے گ گئی۔

سعادت نے اس کے منہ پر زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ شاد کے منہ سے ہلکی سی نکل گئی۔ چوہدری نے اس کے ہاتھ سے پھتل چھین لیا۔ شاد چونک کی طرح اس سے ہ گئی تھی۔ وہ دانتوں سے اسے ہنسنہو رہی تھی۔ چوہدری سعادت نے بڑی مشکل سے ا اپنے آپ سے الگ کیا اور رکھ دیا ہوا تالاب کے کنارے پر لے گیا۔ شاد اب مزاحمت کر رہی تھی۔ چوہدری اسے رکھ دیا۔ شاد کا سر تالاب کے کنارے پر لٹک م سعادت نے اسے زور دار جھکا دیا۔ شاد کا سر پانی میں ڈوب گیا۔ وہ بری طرح ہاتھ مارنے لگی۔ سعادت اس کے سینے پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کو پانی ڈوبنے رکھا۔

شاد ہاتھ پیرا رہی اور پھر اس کی مزاحمت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ وہ بے حرکت ہو چکی تھی لیکن چوہدری سعادت نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کی موت کا یقین نہیں ہو گیا۔

چوہدری سعادت تالاب کے کنارے پر کھڑا لے لے سانس لینے لگا۔ شاد ختم ہو تھی۔ سعادت چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا پھتل اٹھایا اور سر کنڈوں

بستی کا سرخیج ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ تھانے جا کر اس واقعے کی اطلاع دی جائے مگر چوہدری نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

”پولیس کو اطلاع دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ اس نے سرخیج کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”پولیس آئے گی اور لڑکی کی لاش کو اٹھا کر نوڈ پور لے جائے گی۔ جہاں اس کا پوسٹ مارٹم ہو گا اور یہ پتہ چل جائے گا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لوگ ہسپتال میں جمع ہو جائیں گے۔ پورے قصبے کو پتہ چل جائے گا کہ اس بستی کی ایک لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ بات دور دور تک پھیل جائے گی۔ سختی ہے عزتی ہو گی۔ ابھی تو یہ بات ایسی بستی تک محدود ہے۔ اسے یہیں تک رہنے دو۔ دیے بھی پولیس پتہ نہیں چلا سکے گی کہ وہ درندہ صفت آدمی کون تھا۔ مزید رسوائی سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ اس لڑکی کو خاموشی سے دفن کر دیا جائے۔“

”کیا کہہ رہے ہو چوہدری۔“ سرخیج نے اسے گھورا۔ ”یہ قتل کی واردات ہے۔ پولیس کو اطلاع دینا اور اس سمیٹنے کے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔“

”میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ چوہدری سادہ لہجے میں کہتا تھا۔ ”پولیس یہاں آئے گی تو وہ خاموشی سے واپس نہیں چلی جائے گی۔ لڑکی کے ماں باپ سے طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے۔ وہ کس سے ملتی تھی۔ اس کے تعلقات کس سے تھے۔ وہ لڑکی ہی کو آوارہ اور بدچلن ثابت کرنے کی کوشش کرے گی اور پھر بستی کے دو چار آدمیوں کو پکڑ کر لے جائے گی۔ پھر تو لوگ انہیں چھڑانے کیلئے بھاگتے پھوگے۔ مزید ذلت و رسوائی ہو گی۔ میرا مشورہ مانو تو بات کو یہیں تک رہنے دو اور لڑکی کو خاموشی سے دفن کر دو۔ میری ہدایتوں آپ لوگوں کے ساتھ اور لڑکی کے گھر والوں کے ساتھ ہیں۔ میں آپ سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ دیے ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام بستی کے کسی نوجوان کا نہیں ہے۔ وہ یقیناً باہر کا کوئی آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اجنبی اس طرف سے گزرا ہو اور لڑکی کو اکیلے دیکھ کر اس کی نیت میں فتنہ آگیا ہو۔ ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دیے میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اس درندے کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اگر وہ مل گیا تو اسی درخت کے ساتھ لٹا لٹکا

سادت کچھ کہتا ہی چاہتا تھا کہ اٹھارہ بیس سال کی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

”چاہتی کہاں ہے اکبر چاہا؟“ اس لڑکی نے دور ہی رک کر پوچھا۔

”وہ تو جاملے کے گھر گئی ہوئی ہے۔ کیا بات ہے۔ تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو پتر۔“ اکبر نے پوچھا۔

”سویرے شاد اس کے ساتھ گئی تھی۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”تمہاری چاہتی تو راستے سے ہی واپس آگئی تھی۔ شاد، جیروں کے ساتھ گئی تھی۔“ اکبر نے کہا۔

”جیروں بھی گھر میں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ بھی تھوڑی دیر بعد واپس آگئی تھی۔ اچھ میں دیکھتی ہوں۔“ لڑکی کہتے ہوئے واپس چلی گئی۔

چوہدری سادہ لہجے میں کہتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اب شاد کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ جلد یا بدیر اس کا پتہ چل جائے گا لیکن اس کے خیال میں اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاد کی لاش سرکنڈے کے جنگل میں تالاب کے کنارے ملے گی جبکہ وہ مخالف سمت سے بستی میں آیا تھا اور وہ تین آدمیوں نے اسے دیکھا بھی تھا۔ اس پر کرم کا شبہ نہیں کیا جاسکے گا۔

ایک گھنٹے بعد سرکنڈے کے جنگل میں شاد کی برہنہ لاش مل گئی۔ اس کی حالت دیک کر کسی کو بھی یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ لوگ لاش کو اٹھا کر بستی میں لے آئے۔ پوری بستی میں ایک کھلبلی مچ گئی تھی۔ بستی کی تاریخ میں ایسا خوفناک واقعہ پہلی مرتبہ رونما ہوا تھا۔ فضا میں خوف و ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ بستی کے لوگ سوائے نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ وہ بھیڑیلا کون ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں نے مشتبہ نگاہوں سے چوہدری سادہ لہجے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ بستی کے بہت سے لوگ جانتے تھے کہ چوہدری سادہ لہجے کوں ہے اور وہ یہاں کیوں آیا ہوا ہے؟ بعض قتل اور اسی قسم کی وارداتوں میں لوٹ رہا ہو اس سے کسی بھی قسم کی توقع کی سکتی تھی۔

کر تیز تیز قدموں سے چلا ہوا اسی مکان میں داخل آگیا۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے کپڑے اٹھا کر سوٹ کس میں ٹھونے اور سوٹ کس اٹھا کر مکان سے باہر نکل آیا۔

گلی سنسان تھی۔ سب لوگ شادو کے گھر کے سامنے جمع تھے۔ سعادت سوٹ کس اٹھاۓ تیز تیز چلا ہوا دوسری طرف سے ہستی سے نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ہستی کے لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سامنے لمبے وہ رہے تھے۔ چوہدری سعادت کھیتوں میں گھس گیا اور پھر چھپتا ہوا ہستی سے بہت دور سر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹی سی پلایا سے اس نے نمر عبود کی اور دوسری طرف کے کھیتوں میں گھس کر دوڑنے لگا۔

بائیسویں باب

دوسرے دن بھی پرانی حویلی میں بڑے زور و شور سے کام جاری رہا۔ ٹیچر اور دہلی نے وہاں سے جانے کا ارادہ بدل دیا تھا لیکن یہ طے پایا تھا کہ رات کو وہ بھی اوپر ہی کے کسی کمرے میں رہیں گے۔

گاؤں میں رابطہ کے مکان کی قہیر کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں کے لوگ بڑی خوشی سے مزدوروں کی طرح مکان کی قہیر میں حصہ لے رہے تھے۔ گاؤں کے سب ہی لوگ نایاب سے بہت خوش تھے۔ آٹا آ رہا تھا تو چوہدری فیملی کے افراد کو۔

سعادت کئی روز سے لاپتہ تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں کئی مرتبہ گاؤں آ چکی تھی۔ چوہدری امانت عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک طرف سعادت کے لاپتہ ہونے کے سلسلہ میں اسے پولیس کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا اور دوسری طرف بیوی کی کڑوی کسلی باتیں سنتا پڑتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سے سعادت نے زمینداری سنبھالی تھی، چوہدری امانت بڑی حد تک گوشہ نشین ہو گیا تھا لیکن جب نایاب کا جائیداد میں حصے کا سوال اٹھا تو اسے آگے اتنا پڑا تھا۔ ممکن ہے وہ معاملے کو کسی حد تک سنبھال لیتا لیکن سعادت کی گربوخی نے معاملے کو اس حد تک لگاؤ دیا تھا کہ اب وہ خود روپوش ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

گاؤں کا کوئی بھی شخص اب چوہدری فیملی کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ گاؤں کے

اس کی کھال کھینچ لوں گا۔

سرینچ اپنے آدمیوں سے سرگوشیوں میں مشورہ کرنے لگا۔ انہوں نے شادو کے بوڑھا باپ سے بھی مشورہ کیا۔ وہ ہتیارہ شدت غم سے بڑھال رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بھائی۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔ ”جو تم لوگوں کے جی میں آئے وہ کرو۔ یہ تو کبچہ پھنسا جا رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔“

سرینچ نے ایک بار پھر اپنے آدمیوں سے مشورہ کیا اور پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ چوہدری سعادت ٹھیک ہی کتا ہے۔ پولیس کو اطلاع دینے سے مزید ذلت و رسوائی ہوگی اس لئے خاموشی سے شادو کی جھیز و تکلیفیں کر دی جائے۔ وہ معصوم اور سادہ لوح لوگ اہم بات کو نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی جرم چھپانا بھی جرم ہوتا ہے۔ چوہدری سعادت کو اپنا ہمدرد سمجھ کر وہ اس کی باتوں میں آ گئے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ جھیز و تکلیفیں کا بندوبست کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ چوہدری سعادت کہتے ہوئے اپنے مکان میں آگیا۔

اس نے اپنے سوٹ کس میں سے کچھ رقم نکالی۔ اس کا خیال تھا کہ مزید ہمدردی جتانے کیلئے وہ یہ رقم شادو کے باپ کے ہاتھ پر رکھ دے گا۔

وہ رقم جیب میں رکھ کر مکان سے نکل آیا اور پھر ایک گلی کا موڑ مڑنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر ٹھٹھک گیا۔ وہ ایک نو عمر لڑکے کی آواز تھی جو کسی سے کہہ رہا تھا۔

”میں بچ کتا ہوں چاچا۔ یہ گمزی مجھے وہاں سے ملی ہے جہاں سے شادو کی لاش اٹھاؤ گئی تھی۔ میں اور دو اور لڑکے وہ جگہ دیکھنے گئے تھے۔ یہ گمزی مجھے تالاب کے کنارے سرکنڈوں کے پودوں میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ تم مانے اور دھوکے سے پوچھ لو۔“

چوہدری سعادت کو کہنے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کا دایاں ہاتھ فوراً ہی بائیں گلائی پر پہنچ گیا۔ گلائی میں گمزی نہیں تھی۔

”یہ تو چوہدری سعادت کی گمزی ہے۔“ ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”اب سمجھ گیا“ وہ پولیس کو اطلاع دینے سے کیوں منع کر رہا تھا۔ شادو کو اسی نے مارا ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔“

چوہدری سعادت چند لمحوں کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنتا رہا پھر پلٹ

راست ثناب سے بات کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ اس لئے اس نے ملک صلاح الدین کو پیغام بھجوایا، اب وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

ملک صلاح الدین ایک خوش اخلاق، صلح جو اور امن پسند آدمی تھا۔ اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی تھی کہ ثناب اور چوہدری فیلی کا معاملہ بڑھنے نہ پائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ گھر کا معاملہ گھری میں لے ہو جانا چاہئے لیکن اس وقت نہ تو چوہدری ثناب علی مانا تھا اور نہ ہی اس کا بیٹا چوہدری سعادت اور اب چوہدری ثناب ملا تو وہ فوراً ہی اس سے ملنے کو تیار ہو گیا۔

ملک صلاح الدین 'چوہدری ثناب کی حویلی میں داخل ہوا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ اطلاع پا کر چوہدری ثناب خود ہی گیت پر آگیا۔ اس نے بیوی کر جوئی سے ملک صاحب کا استقبال کیا اور انہیں صمان خانے میں لے آیا۔ کچھ دیر آپس کے گلے گلے ہوتے رہے پھر چوہدری اصل موضوع پر آگیا۔

"ملک صاحب!" وہ بولا۔ اس وقت جو حالات ہیں انہیں آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کا کوئی حل بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسا طریقہ ہے کہ صورت حال کو مزید بگڑنے سے روکا جاسکے۔"

"بھائو تو تم لوگوں نے خود پیدا کیا ہے۔" ملک صاحب نے کہا۔ "شروع میں" میں نے کتنی کوشش کی تھی کہ اس بھڑکے کو ختم کر دیا جائے مگر تم باپ بیٹوں سے تو میری کسی بات پر کان ہی نہیں دھرا تھا۔ ہمارے بیٹے نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ وہ تو کسی مرتبہ ثناب کو قتل کرانے کی کوشش کر چکا ہے۔ اس کی قسمت ابھی ختمی کہ وہ ہر مرتبہ جیتی رہی اور پھر ثواب دین باجی کو قتل اور اس کی بیٹی کو اغوا کر کے بھی اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔ گاؤں کا ایک ایک شخص تم لوگوں سے نفرت کرنے لگا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کبھی ہمارے سامنے زبان نہیں کھولی تھی اور آج وہ ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو رہے ہیں۔ اس کے برعکس ثناب کو دیکھ لو۔ دو تین مہینے پہلے وہ اس گاؤں والوں کیلئے ابھی ختمی لیکن اس کے حسن سلوک کی وجہ سے آج اس گاؤں کا ہر شخص اس کیلئے جان دینے کو تیار ہے اور۔"

"میں مانتا ہوں ملک صاحب!" چوہدری ثناب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نظمیں ہم

بڑے لوگوں سے بھی چوہدری ثناب کے تعلقات بگڑ چکے تھے۔ دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کا ہر شخص ثناب کیلئے جان دینے کے لئے تیار نظر آتا تھا۔

ثناب نے جب شروع میں پرانی حویلی پر قبضے کا اعلان کیا تھا تو چوہدری ثناب اسے پیغام بھیج کر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح بھڑکا نہ بڑھائے اور پھر یہ میں چوہدری سعادت نے اسے طاقت کے زور پر پرانی حویلی سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا انجام سب ہی دیکھ چکے تھے۔ اس کے دو آدمی حویلی میں ہراسر طور مارے گئے تھے اور خود سعادت اور اس کے ایک آدمی کو کسی ناگوار قوت نے مار مار کر حویلی سے باہر پھینک دیا تھا اور پھر بعد میں کچھ ایسے ہراسر اور واقعات رونما ہوئے تھے : بظاہر ناقابل یقین تھے لیکن انہیں سمجھنا نہیں جاسکتا تھا۔

چوہدری ثناب خود بھی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس کا شمار بھی ظالم اور سفاک زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس نے بھی ہمیشہ طاقت کے زور پر اپنے مزارعین پر حکومت کی تھی۔ وہ تو فرعون کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے نام سے بھی ظلم و برصت کی بہت داستانیں لوگوں کو اب تک یاد تھیں لیکن ثناب والے معاملے میں وہ ذرا مختلف ثابت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سعادت کو بھی کئی مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کم از کم گاؤں کے لوگوں کو اپنا مخالف نہ بنائے۔ اس کے برعکس اگر وہ گاؤں کے لوگوں کو اپنا حریف بنا لے تو وہ ثناب کے خلاف ہر سطح پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں لیکن سعادت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ طاقت کے زور پر ہر شخص کو قدموں بھٹکایا جاسکتا ہے اور پھر اس نے ثواب دین باجی کے گھر کو بذر آتش کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا۔ اس واقعے نے بھٹی پر تیل کا کام کیا اور گاؤں کے سب لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔

چوہدری ثناب علی ابھی طرح جان گیا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کو اس سے شدید نفرت ہو گئی ہے۔ اب کسی معاملے میں کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہو گا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اگر کسی طرح ثناب کو راضی کر لیا جائے تو اس کے بیٹے کی جان بچ سکتی ہے۔ اگر ثناب 'چوہدری سعادت کے خلاف اپنے لگائے ہوئے الزامات واپس لے لے تو دوسرے معاملوں میں پولیس سے کم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چوہدری ثناب نے بھی جانتا تھا کہ برا

”میں نے کہا تاکہ تم ٹایاب کو نہیں سمجھ سکتے۔“ ملک صاحب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”کسی نوکر کو بھیج کر سکندر کو بلاؤ۔“

چوہدری امانت علی نے اپنے ایک نوکر کو ملک صاحب کے گھر بھیج دیا۔ سکندر کو وہاں آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

”سکندر“ ملک صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پرانی حویلی سے ٹایاب کو بلا کر لاؤ۔“

”وہ گھبراتا ہوا ہوا ہے۔ میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔“ سکندر کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ٹایاب بھی وہاں موجود تھی۔ کچھ دیر تک گراگرمی ہوتی رہی پھر ٹایاب نرم پڑ گئی۔

”میرے بیان سے کیا ہو گا۔“ وہ بولی۔ ”میں ذاتی طور پر تو اسے معاف کر دوں گی مگر ان لوگوں کا کیا ہو گا جن کے گھراس نے برباد کئے ہیں۔ کیا وہ لوگ بھی اسے معاف کر دیں گے اور کیا قانون اسے نظر انداز کر دے گا۔“

”میں ایک ایک سے بیڑوں پر گر کر معافی مانگ لوں گا۔“ چوہدری امانت علی نے کہا۔ ”تم اپنے الزامات واپس لے لو تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”میں کل آپ کو جواب دوں گی۔“ ٹایاب کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملک صاحب اور سکندر بھی اٹھ گئے۔ جب وہ چوہدری کی حویلی سے نکل کر اپنی حویلی پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس وقت پرانی حویلی جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ رات ملک صاحب کی حویلی میں رہ گئی۔

فصل ۲۳

دیر پاہ اس چھوٹی سی بستی میں رہنا ہونے والے افسوسناک واقعہ کی خبریں بھی پہنچ چکی تھیں۔ چوہدری سعادت اس بستی سے فرار ہو گیا تھا۔ سرکڑے کے پودوں میں شادو کی لاش کے قریب لٹے والی سعادت کی گھڑی اور اس کے فرار سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ شادو کے ساتھ زیادتی اور اس کی موت کا ذمہ دار وہی ہے۔ بستی کے لوگوں نے پولیس کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور پولیس کی ایک پارٹی چوہدری سعادت کی تلاش میں

سے بھی ہوئی ہیں۔ میں نے سعادت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ میرے کنٹرول میں نہیں رہا۔“

”کنٹرول میں نہیں رہا تو چھوڑ دو۔“ ملک صاحب بولے۔ ”جو اولاد ماں باپ کی ذلت و رسوائی کا باعث بنے اس کا تو نہ ہونا ہی بہتر ہے۔“

”کیسے چھوڑ دوں ملک صاحب!“ چوہدری امانت نے کہا۔ ”تم بھی اولاد والے ہو۔ اولاد کے دکھ کو سمجھ سکتے ہو۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ ملک صاحب نے پوچھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ یہ قصہ اب ختم ہو جائے۔“ چوہدری امانت نے کہا۔ ”ٹایاب اگر اپنے لگائے ہوئے الزامات واپس لے لے تو یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔“

”کیسے ختم ہو سکتا ہے۔“ ملک صاحب نے اسے گھورا۔ ”سعادت پر کوئی ایک الزام ہو تو بات ہے۔ اس کے خلاف تو جرائم کی ایک لمبی فہرست ہے۔ کس کس الزام کو ختم کرو گے۔“

”یہ تو صرف ملکی وغیرہ کے بیان ہیں تاکہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا سعادت کے کہنے پر کیا۔ سعادت براہ راست تو کسی معاملے میں ملوث نہیں ہے۔ پولیس اگر چاہے تو اس کا نام نکالا جا سکتا ہے۔ رہا ذواب دین باغی والا معاملہ تو میں اس کی بیٹی اور بیٹے سے معافی مانگ لوں گا۔ ان کا نقصان پر اصرار کروں گا اور یہ بھی یقین دہانی کرانا ہوں کہ آئندہ گاؤں والوں کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تم بس ٹایاب بیٹی سے بات کر لو۔ میں اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ اسے وہ سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتی ہے۔“

”بہت دیر بعد بات تمہاری سمجھ میں آئی ہے۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”اب اگر تم نے ٹایاب کو بیٹی کہہ ہی دیا ہے تو خود کیوں نہیں بات کر لیتے اس سے؟“

”میں خود اس کے پاس جا کر معافی مانگنے کو تیار ہوں لیکن کس منہ سے اس کا سامہ کروں گا۔“ چوہدری امانت نے کہا۔

”تمہیں اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”تم ٹایاب سمجھ سکتے۔ وہ بہت مختلف لڑکی ہے۔ میں اسے ہمیں بلا لیتا ہوں۔“

”کیا یہ سب کچھ ہونے کے بعد وہ یہاں آئے گی۔“ چوہدری نے کہا۔

”اسے بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ اب وہ موست وائلنڈ ہے۔ اب وہ کبھی سرحد پار کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔“

”اپنے لوگ ویزہ پاسپورٹ کے محتاج نہیں ہوتے۔ انہیں سرحد پار کرنے کیلئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں ہر حال محتاط رہنا چاہئے۔“ ملک سکندر نے کہا۔

”غیر محتاط تو میں کبھی نہیں رہی سکندر بھائی۔“ ثایاب نے جواب دیا۔

”ملک صاحب!“ بچوں نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یہاں رہتے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں اور ہم مس ثایاب کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہدی کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مس ثایاب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور پھر یہ اکیلی تو نہیں ہیں۔ آپ ہیں“ میں ہوں“ گاؤں کا بچہ بچہ ان کے ساتھ ہے اور پھر ان کا وہ پر اسرار محافظ بھی ہے جو ہر گھنٹہ پہنچ جاتا ہے۔“

”اس محافظ سے زیادہ مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔“ ثایاب نے کہا۔

”یہ بات تو ٹھیک ہے مگر احتیاط بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔

وہ لوگ ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک موٹر سائیکل سوار کو حویلی کی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ لوگ اس وقت حویلی کی اوپری منزل پر بھروسے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک صاف نظر آتی تھی اور وہ موٹر سائیکل سوار اس طرف آ رہا تھا۔

موٹر سائیکل نیلے کے ساتھ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب موٹر سائیکل کی آواز حویلی کے چھانک کی طرف سے آ رہی تھی اور پھر وہ آواز بھی بند ہو گئی۔ اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد قیوم نے آکر بتایا کہ اسلام نام کا ایک شخص ثایاب سے ملنا چاہتا ہے۔ ثایاب نے اسے اوپر ہی بلا لیا اور پھر چند منٹ بعد ایک انجنی ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا۔

”میں دریا پار سے آیا ہوں۔“ اسلام نامی انجنی نے ثایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ چوہدری سعادت دو دن بعد ہر سنگھ ڈاکو کے گردہ کے ساتھ سرحد پار کر کے اس طرف آنے والا ہے۔ اس کا ارادہ آپ کو اٹھالے جانے یا ختم کر دینے کا ہے۔“

گاؤں پہنچ گئی تھی۔ حاکم لاہور پولیس والے جانتے تھے کہ سعادت اس گاؤں میں نہیں۔ لیکن محض خانہ پری کے لئے پولیس یہاں آئی تھی۔

گاؤں والوں کو متحکم کیلئے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ چوہدری سعادت ان کے! انجنی نہیں تھا۔ وہ اسے بچپن سے جانتے تھے۔ جوتانی میں اس نے جو گل کھلائے تھے! اس سے بھی واقف تھے۔ کتنے ہی گھروں کو اس نے برباد کیا تھا۔ وہ اب پولیس کے خوف سے چھپتا بھڑبھڑا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی گھمڈی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔

ثایاب کو بھی پرانی حویلی میں یہ خبر پہنچ گئی تھی اور پھر اگلے روز یہ خبر بھی پہنچ گئی کہ چوہدری سعادت سرحد پار کر کے ہر سنگھ ڈاکو کے گردہ سے جلا تھا۔

”اس کا یہی انجام ہونا تھا۔“ سکندر نے اس خبر پر تیسرو کرتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی کھیتوں پر اپنے ڈبے سے پرانی حویلی پہنچا تھا۔

”یہ تو انجام نہیں۔“ ثایاب نے کہا۔ ”البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اب ایک ایسے راستے پر چل نکلا ہے جس کا انجام بہت ہی بے بیاہک ہو گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس کے باپ کو اب کچھ عقل آئی ہے تو وہ خود نہ نئے گل کھلا رہا ہے۔“

”تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“ سکندر نے پوچھا۔

”میرے سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ ثایاب نے کہا۔ ”پہلے تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ براہ راست کسی جرم میں ملوث نہیں ہے اس لئے اسے بچایا جاسکتا ہے لیکن اب اب اسے بچانا بہت مشکل ہے۔ اس کے خلاف پولیس کو ایسے ثبوت مل گئے ہیں جو اسے مجرم ثابت کرتے ہیں اور پھر اس کا چوروں کی طرح اس ہستی سے بھگانا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ واقعی جرم ہے۔ ایسی صورت میں اس کا بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ میں آگ اپنے الزامات دلائل سے لوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔“ سکندر نے گمراہی سے کہنے لگے۔ ”لیکن اس کا ہر سنگھ ڈاکو کے گردہ میں شامل ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمہارے خلاف کچھ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں کوئی بات ہوئی تھی اور جمال اپنی ماں اور بہن کو لے کر گاؤں سے چلا گیا تھا لیکن تم جمال کو کیسے جانتے ہو؟

”جمال میرا دور کا رشتہ دار ہے جی۔“ اسلام نے جواب دیا۔ ”وہ کل رات میرے پاس آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں ملک سکندر یا ثایاب کو اطلاع دے دوں۔ میں پہلے گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے مجھے پتہ چلا کہ آپ دونوں اس حویلی میں ہیں۔ اسی لئے میں یہاں آگیا۔“

”اس اطلاع کے لئے بہت شکر ہے۔“ ثایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
چوہدری سعادت اور اس کے بندے جب یہاں آئیں گے تو ہم ان کے استقبال کو تیار ہوں گے۔“

اسلام کچھ دیر وہاں رہا اور پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ لوگ تیسرے کمرے رہے کہ اس اطلاع میں واقعی کوئی صداقت ہے یا وہ آدمی یہاں کے حالات جاننے کیلئے آیا تھا۔

”وہ کوئی بھی ہو۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ چوہدری سعادت جیسے آدمیوں کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہمیں اپنا بندوبست کر لینا چاہیے۔“

اور پھر وہ بندوبست اگلے ہی روز شروع ہو گیا اور پھر اس رات گاؤں کے چاروں طرف پھرے بٹھا دئے گئے۔ نوجوان رانٹلیں، لکھڑیاں اور لالھیاں لے کر ایسی جگہوں پر بیٹھ گئے کہ خود تو کسی کو نظر نہ آسکیں لیکن دوسرے ان کی نظروں سے نہ بچ سکیں۔
رات گزر گئی مگر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری رات بھی احتیاطاً پروہ رکھا لیکن کسی نے گاؤں پر حملہ نہیں کیا۔

تین دن بعد عدالت میں ثایاب کی پیشی تھی۔ اس روز اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ ثایاب ایک دن پہلے ہی شہر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ملک سکندر بھی تھا۔

اور اگلے روز جب وہ عدالت میں پیش ہوئے تو وہاں چوہدری امانت کو دیکھ کر چمک گئے۔ جج کے فیصلہ سنانے سے پہلے ہی چوہدری امانت نے ایک درخواست پیش کر دی اور پھر جج نے جو فیصلہ سنایا اس سے ثایاب اور اس کے ساتھیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

”بڑی دلچسپ اطلاع ہے۔“ ثایاب نے کہا۔ ”لیکن تم کون ہو، ہمیں کیسے پتہ چلا اور پھر تم مجھے یہ اطلاع دینے اتنی دور کیوں آئے ہو۔ ہمیں تو تھا نہ جانا چاہئے تھا۔“

”میں سرحد کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی بستی کا رہنے والا ہوں۔“ اسلام نے جواب دیا۔ ”آپ کے گاؤں کا جمال نام کا ایک آدمی پہلے سے میرے گھر کے گردہ میں شامل ہے۔ جمال پہلے چوہدریوں کا مزارعہ ہوا کرتا تھا۔ دو سال پہلے ملک سکندر نے اس کی بہن کو اغواء کر لیا اسے اپنی دروہگی کی بجائے چھڑا دیا تھا لیکن جمال عین وقت پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی بہن کو بچا لیا اور چوہدری پر بھی حملہ کر دیا۔ چوہدری سعادت کی ٹانگ پر اس کے منجر کے زخم کا نشان اب بھی موجود ہے۔ چوہدری اس وقت تو خاموش ہو گیا تھا لیکن اس نے جمال کو دھمکی دی تھی کہ اسے اور اس کے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کے چند روز بعد ہی جمال اپنے گھر والوں کو لے کر گاؤں سے فرار ہو گیا۔ وہ طویل عرصہ تک روپوش رہا لیکن اس کے دل میں انتقام کی آگ لگی ہوئی تھی اور پھر اس سے حسن آباد میں ایک واردات ہو گئی۔ ایک آدمی اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ وہ فرار ہو کر سرحد پار چلا گیا اور کسی طرح میرے گھر تک پہنچ گیا۔ اس نے میرے گھر کو چوہدری سعادت کے بارے میں بتایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں پرانے دوست ہیں اور پھر چند روز پہلے چوہدری سعادت بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے خیر آباد میں ایک لڑکی کی عزت لوٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ میرے گھر نے جمال اور چوہدری میں صلح کر دی مگر جمال کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں رہا۔ اسے ایک کوئی موقع تو نہیں مل سکا مگر اس نے میرے گھر اور چوہدری سعادت کی باتیں سن لیں۔ چوہدری سعادت نے میرے گھر کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ اس گاؤں پر حملہ کر کے ثایاب کو یا تو اغوا لیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ کل رات جمال کسی طرح سرحد پار کر کے ہماری بستی میں آگیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں گاؤں جا کر ثایاب کو صورتحال سے آگاہ کر دوں۔ میں نے تو کہا تھا کہ پولیس کو اطلاع دے دینی چاہئے لیکن اس نے ایسا کرنے سے منع کر دیا کیونکہ پولیس ڈاکوؤں کا بھڑ ہوئے کے شہسے میں مجھے ہی دھرتی۔ اسی لئے میں یہاں آیا ہوں۔“

اسلام کے خاموش ہونے پر ثایاب سکندر کی طرف دیکھتے گئے۔
”یہ جمال کے بارے میں ٹھیک کر رہا ہے۔“ ملک سکندر بولا۔ ”دو سال پہلے گاؤں

تشویش بڑھ گئی۔ کہیں اسے بھی تو نہیں مار دیا گیا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ وہ سکندر کو لے کر کھنڈرات میں پہنچ گئی۔ وہ دونوں دو تین گھنٹوں تک کھنڈوں میں تلاش کرتے رہے لیکن سنہرا ناگ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس جگہ بھی آئے جہاں تہہ خانے میں اترنے کا راستہ تھا۔ وہ راستہ بالکل محفوظ تھا۔ ٹایاب تہہ خانے میں داخل ہوا جانتی تھی لیکن سکندر نے منع کر دیا۔ دن کے وقت وہ راستہ کھونا مناسب نہیں تھا۔

اور پھر اس رات ٹایاب پرانی چوٹی میں اپنے کمرے میں مگرمی نیند سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کوئی اس سے پلٹا جا رہا ہو۔ وہ بدحواس سی ہو کر اٹھ گئی۔ اسے ایک بہت ہی مدم سا بیولہ کھڑکی سے باہر جاتا ہوا نظر آیا۔ ٹایاب نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ وہ بیولہ جمھوٹے کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کون ہو تم۔؟“ ٹایاب جیتی۔

ایسا لگا جیسے اس بیولے نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہو اور پھر اس نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹایاب دوڑ کر منڈیر کے قریب پہنچ گئی۔ وہ بیولہ سیدھا نیچے گرنے کے بجائے بہت آہستہ آہستہ آگے کی طرف ہوا میں تیر رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

ٹایاب چند لمبے وہاں کھڑی تاریکی میں گھورتی رہی اور پھر کمرے میں آگئی۔ کارلس پر رکھا ہوا لیپ روشن تھا۔ ایک آئینہ بھی کارلس پر رکھا ہوا تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے محض اتفاقاً اس کی نظریں آئینے کی طرف اٹھ گئیں اور وہ فٹبک کر رک گئی۔

ٹایاب آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ گردن سے نیچے ایک سنہری لکیر نظر آ رہی تھی اور وہ ناگنی آثار کر اپنے جسم کا جائزہ لینے لگی۔ جسم پر کئی جگہوں پر سنہری لکیریں نظر آ رہی تھیں۔

ٹایاب بدحواس سی ہو گئی۔ ایسا ایک مرتبہ اس وقت بھی ہوا تھا جب وہ شرمگئی ہوئی تھی اور اب اس نے ایک ہیولے کو اپنے کمرے سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ انسان ہوتا تو جمھوٹے کی منڈیر سے چھلانگ لگانے کے بعد سیدھا نیچے گرتا لیکن وہ تو ہوا میں تیرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

عدالت نے ٹایاب کو سرفراز چوہدری کا جائز وارث قرار دیتے ہوئے جائیداد میں اس کے حصے کا حقدار قرار دیا تھا۔ چوہدری امانت علی نے آخری لحات میں جیش کی جائیداد والی درخواست میں عدالت سے استدعا کی تھی کہ وہ ٹایاب کا حق تسلیم کرتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کے ساتھ یہ کاغذ بھی لگا دیا گیا تھا۔

قسط نمبر 24

ملک سکندر وغیرہ تو اگلے ہی روز گاؤں واپس آ گئے البتہ ٹایاب دو دن شرمیں رہی اور لوگوں کی مبارکباد وصول کرتی رہی اور جب وہ گاؤں پہنچی تو ایک چونکا دینے والی خبر اس کے منہ پر تھی۔

وہ دن سے نیلے والے کھنڈرات میں کچھ پر اسرار سرگرمیاں دیکھی جا رہی تھیں سکندر وغیرہ نے سراغ لگانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کون تھے لیکن پتہ نہیں چلا تھا البتہ آج صبح سویرے کھنڈروں کی طرف سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ سکندر دو آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا تو کسی آدمی کا سراغ نہیں ملا البتہ تین ناگ مختلف جگہوں پر مرے ہوئے ملے تھے۔ ان تینوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

یہ اطلاع ٹایاب کیلئے خاصی تشویشک تھی۔ سانپ کھنڈروں میں چھپے ہوئے خزاں کے محافظ تھے۔ ان میں سے تین کو اس طرح ہلاک کر دیا جانا معمولی بات نہیں تھی۔ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ ممکن ہے کوئی اور پا خزانے کی تلاش میں وہاں پہنچ گئی ہو اور انہوں نے ہی سانپوں کو ہلاک کیا ہو۔

ایک مرتبہ سنہرے ناگ نے ٹایاب سے کہا تھا کہ وہ جب بھی اسے بلائے گی وہ جائے گا۔ ٹایاب کو کبھی اسے بلائے کی ضرورت نہیں آئی تھی لیکن آج ضرورت پڑی تھی۔

ٹایاب اس وقت پرانی چوٹی میں اپنے کمرے میں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سنہرے ناگ کو پکارا۔

”بیجو۔ کہاں ہو تم۔ میرے پاس آؤ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ ناگ نے کئی مرتبہ بیجو کو پکارا لیکن وہ سنہرا ناگ کسی طرف سے بھی نمودار نہیں ہوا۔ ٹایاب

میری تمام قوتیں سلب ہو گئی ہوں۔ اس وقت میں موقع پا کر یہاں آ گیا تھا اور اب یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری قوت سلب ہو رہی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اب تم جلدی سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ راستے میں کسی دشمن کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔“

اس مرتبہ ٹایاب کو کوئی سرگوشی سنائی نہیں دی۔ سنری ناگ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا کھڑکی پر چڑھ کر باہر نکل گیا۔

ٹایاب بہت دیر تک بیٹھی بیٹھو کی باتوں پر سوچتی رہی اور پھر فریڈ کے بوجھ سے اس کی پگلیں جھکتے گئیں۔

فقط طبر ○ 25

ٹایاب اور سکندر تقریباً دو گھنٹوں سے ٹپلے کے کھنڈرات میں گھوم رہے تھے۔ آج انہیں چار سانپ مرہ لے گئے۔ انہیں گولیوں سے نہیں مارا گیا تھا۔ دو کے پھن پکے ہوئے تھے اور دو کے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔

ان دونوں نے کھنڈرات میں ہر اس جگہ کو تلاش کر لیا تھا جہاں کسی کے چھپنے کا امکان ہو سکتا تھا لیکن ایسی کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ البتہ کئی جگہوں پر قدموں کے نشان ضرور نظر آئے تھے۔ قدموں کے ان نشانات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کم از کم تین آدمی تھے جو ان کھنڈروں میں گھوم رہے تھے اور ظاہر ہے ان کا مقصد خزانے کی تلاش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ کون لوگ تھے اور کہاں چھپے ہوئے تھے؟ ان کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کھنڈرات میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ٹایاب نے برگڈ کے بوڑھے درخت کے نیچے چوڑے والے تہ خانے میں بھی دیکھ لیا تھا۔ وہاں روٹی اور نیچو کا سامان اب بھی بھرا ہوا تھا لیکن اس قسم کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہاں کوئی رہا ہے۔

”سانپوں کا قتل عام اور قدموں کے نشانات تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی موجود ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ان کھنڈروں کے نیچے انہوں نے کوئی تہ خانہ دریافت کر لیا ہو جہاں انہوں نے پناہ لے رکھی ہو۔“

سوئے میں اس نے محسوس کیا تھا جیسے کوئی اس سے لپٹا ہوا ہو اور پھر یہ نہ کلیں۔ دھنستا۔ اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور اس کے ساتھ ہی اس کا شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے ناٹکی پس لی اور پلنگ کی پشت سے ٹھک لگا کر بیٹھ گئی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟

ٹایاب یہ سب سوچ رہی تھی کہ ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز سن کر چونک گئی۔ ا نے مڑ کر آواز کی طرف دیکھا اور اچھل پڑی۔ وہ بیٹھ تھا۔ سنری ناگ جو کمرے کے آگے کونے میں دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے رینگنے کا انداز ایسا تھا جیسے بے سا ہو رہا ہو۔

”تو یہ تم تھے بیٹھ۔“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہیں شرم چاہئے۔ تمہاری یہ حرکت میری ذلت اور رسوائی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ ٹایاب کے کان میں سرگوشی ابھری۔ ”تم مجھے اچھی لگتی کبھی بھی دل چاہتا ہے کہ تمہارے بہت قریب آ جاؤں۔“

”بیٹھ۔“ ٹایاب چیخی۔ ”مگر کوئی انسان ایسی بات کہتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ تم مجھ سے دوستی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قسم کی غیر اخلاقی حرکتیں کر دو جو مجھے ذلیل و رسوا کر دیں۔“

اس مرتبہ ٹایاب کو کوئی سرگوشی سنائی نہیں دی۔ بیٹھ چھن کو ادھر ادھر رخ رہا تھا نہامت اور شرمندگی کا اظہار کر رہا ہو۔

”آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ ہوگی۔“ ٹایاب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور نے سنا ہے کہ کھنڈروں میں تین ناگ مارے گئے ہیں۔ کون ہیں وہ لوگ جو اس کھنڈروں میں گھوم رہے ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ٹایاب کے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ ”مجھے تو اپنی جان کا ہے۔ اس لئے میں تہ خانہ سے کم ہی باہر نکلتا ہوں۔ آج صبح جب تم نے مجھے پکارا اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ تم تک آ سکتا۔“

”تم تو بے پناہ قوتوں کے مالک ہو۔“ ٹایاب بولی۔

”پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔“ بیٹھ نے جواب دیا۔ ”بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے

ہوئے تھے۔ لوگ ٹایاب کو مبارکباد دینے آ رہے تھے۔ ملک صاحب کی حویلی کے سامنے جھوم لگ گیا تھا۔ حویلی کے اندر بھی بہت سی عورتیں جمع تھیں۔

دوبلی اور ٹیپو بھی گاؤں میں آ گئے تھے۔ ٹایاب شام تک لوگوں کی مبارکباد وصول کرتی رہی اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ کھنڈرات کی گھرائی کا پروگرام بنانے لگی۔ دوبلی اور ٹیپو بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے تھے۔

رات گیارہ بجے کے قریب وہ گاؤں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹیپو، دوبلی، ٹایاب اور سکندر کے علاوہ قیوم اور دلاور بھی ان کے ساتھ تھے۔ سب لوگ مسلح تھے اور پہلے کی طرح دو دو کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر کھنڈروں میں مختلف جگہوں پر گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

ٹایاب اور سکندر اس جگہ کے قریب ہی تھے جہاں کھنڈروں کے نیچے خزانے والے ترخانے میں جانے والا راستہ تھا۔ جب وہ لوگ کھنڈروں میں داخل ہوئے تو گھری تاریکی تھی لیکن اب چاند طلوع ہو رہا تھا اور فضا میں مدھم سی چاندنی پھیل رہی تھی۔ چاندنی کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی محتاط ہو گئے تھے تاکہ دیکھ نہ لے جائیں۔

تقریباً ایک بجے کے قریب فضا اچانک ہی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ آواز اس طرف سے آ رہی تھی جہاں ٹیپو اور دوبلی چھپے بیٹھے تھے۔ سکندر اور ٹایاب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھنڈروں کی شکستہ دیواروں کی آڑ لیٹے ہوئے تجزی سے اس کی طرف چلنے لگے۔

ٹایاب کے پاس سکندر کا ریوا لور تھا اور سکندر کے پاس ڈبل جیل بندوق تھی۔ وہ تجزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ قریب ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی سکندر کے سر کے قریب سے گزرتی ہوئی ایک دیوار میں جا گئی تھی۔ وہ دونوں بڑی پھرتی سے نیچے گر گئے۔ سکندر نے نیچے گرتے ہی آواز کی سمت فائر کر دی تھی۔ جواب میں خاموشی رہی۔

کئی لمحات گزر گئے۔ دوسری طرف سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن اس طرف خاموشی ہی تھی۔ ٹایاب چٹروں کی آڑ لیٹے ہوئی ایک طرف بڑھنے لگی۔ ایک جگہ وہ اٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑھ میں جانا چاہتی تھی کہ اچانک ہی ایک فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹایاب چیخیں مچا کر نیچے گر گئی۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔

سکندر نے ایک دم اس طرف فائر کر دیا جہاں سے ٹایاب پر گولی چلائی گئی تھی۔ ایک

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں تلاش کیسے کیا جائے۔ اگر انہیں جلد ہی تلاش نہ کیا گیا تو وہ ان کھنڈروں کے قتلہ ساتھوں کو ختم کر دیں گے اور اس طرح وہ خزانہ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔“

”انہیں تلاش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”رات کو چھپ کر اور کھنڈروں کی گھرائی کی جائے۔ دن میں تو وہ لوگ اپنی پناہ گاہ سے باہر نہیں نکلتے۔ رات باہر نکلیں تو انہیں گھیرنے کی کوشش کی جائے۔“

”مناسب خیال ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”تو پھر آج ہی رات سے گھرائی شروع کر دیا جائے۔“

”ہاں۔۔۔ آج رات میں، ٹیپو، قیوم اور دلاور یہاں پہنچ جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کون لوگ ہیں۔“ ملک سکندر نے کہا۔

”میں بھی ساتھ آؤں گی۔“ ٹایاب نے کہا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے گاؤں واپس آ گئے۔ پہلی گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں اطلاع مل گئی کہ دو پٹواری آئے ہوئے ہیں اور ملک صاحب کی حویلی میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

زمین کے بوارے کا وقت آ گیا تھا۔ یہ دونوں پٹواری چوہدری الامت علی سے مل آئے تھے۔ چوہدری نے انہیں لکھ کر دیدیا تھا کہ ٹایاب زمین کا جو حصہ چاہے لے لے اسے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

چوہدری الامت علی میں جو تہذیبی آلتی تھی اس پر ٹایاب اور ملک صاحب ہی کو ذیہ گاؤں کے تمام لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ کہاں تو یہ کہ وہ زمین کے ایک اچھ ٹکڑے۔ بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور کہاں یہ کہ اس نے لکھ کر دے دیا کہ ٹایاب زمین جو حصہ چاہے اپنے نام منتقل کروا سکتی ہے۔

پٹواری تقریباً دو گھنٹے تک وہاں رہے اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ ایک دو دن؛ زمینوں کا سروے شروع کر دیا جائے گا اور اس کے بعد منتقلی کا کام شروع ہو جائے گا۔ گاؤں کے لوگ بہت خوش تھے۔ جس روز عدالت سے ٹایاب کے حق میں فیصلہ۔ کیا تھا اس روز تو گاؤں میں جشن منایا گیا تھا اور آج پٹواریوں کی آمد سے وہ اور بھی خوش

نہیں ہے۔“

وہ لوگ کھڑوں سے نکل کر نیلے کی ڈھلان اتر رہے تھے کہ ٹایاب ٹھک کر رک گئی۔ ایک پتھر کے قریب کوئی چیز ریختی ہوئی نظر آئی تھی۔ وہ ایک سانپ تھا۔ وہ جیسے ہی پتھر کی آڑ سے نکل کر چاندنی میں آیا، ٹایاب اچھل پڑی وہ سنری ناگ بچو تھا۔

بچو اس طرح ریگ رہا تھا جیسے اس میں جان نہ رہی ہو۔ ٹایاب نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ نیچے اور دہلی کاپ کر رہ گئے۔ انہوں نے سنری ناگ کے حوالے سے پر اسرار باتیں تو سنی تھیں لیکن اپنی آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ ٹایاب نے کس طرح زہریلے ناگ کو اٹھا لیا تھا اور اب وہ ناگ اس کے بازو سے لپٹا جا رہا تھا۔

”کیا ہوا بچو۔ تمساری یہ کیا حالت ہو رہی ہے۔“ ٹایاب بازو پر لپٹے ہوئے بچو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔“ ٹایاب کے کان میں سرگوشی سنائی دی۔

ٹایاب تیز تیز قدموں سے پتلے گئی۔ سکندر وغیرہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ٹایاب کو یاد آگیا کہ ایک دو دن پہلے ہی تو بچو نے اسے بتایا تھا کہ کبھی کبھی تو اسے گلتا ہے جیسے اس کی ساری قومیں سلب ہو رہی ہوں اور وہ بے جان سا ہو جاتا ہے اور اس وقت شاید اس پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔

وہ لوگ ملک صاحب کی حویلی پہنچ گئے۔ قیوم ڈاکٹر کو بلانے کیلئے چلا گیا تھا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی ٹایاب کے بازو سے لپٹا ہوا ناگ اٹھ بل کھاتا ہوا نیچے لٹک گیا۔ ٹایاب نیچے جھک گئی اور سنری سانپ رینگتا ہوا وسیع آگہن میں ایک طرف لکڑیوں کے ڈھیر میں غائب ہو گیا۔

وہ لوگ بیٹھک میں آگئے۔ اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد قیوم ڈاکٹر کو لے کر آگیا۔ اس نے ٹایاب کا دھم دیکھا اور ڈریسنگ شروع کر دی۔

اتنے ہی آوازیں سن کر سیکنڈ بھی بیدار ہو گئی اور وہ بھی بیٹھک میں چلی آئی۔ جب اسے پتہ چلا کہ ٹایاب کو گولی لگی ہے تو وہ ایک دم پریشان ہو گئی تھی۔

”یہ جین کھر ہے۔“ ڈاکٹر نے اپنے بیک میں سے دو گولیاں نکال کر ٹایاب کی طرف

بچ اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ سکندر اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹایاب کی طرف دوڑا۔

گولی ٹایاب کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے بازو کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ٹایاب دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو دبائے بیٹھی تھی۔

”تم ٹھیک ہو نا۔“ سکندر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے کراچے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ از لوگوں پر توجہ دیں۔ انہیں بچ کر نہیں جانا چاہئے۔“

سکندر اپنی گن لوڈ کرنے لگا اور پھر وہ بے تحاشہ فائر کرتا چلا گیا۔ کارتوسوں کی چیلہ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کئی کارتوس فائر کر دیے۔ اس دوران کھنڈر اور

میں بھاگ دوڑی آوازیں بھی آتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

”بھاگ گئے وہ لوگ۔“ نیچے نے کہا۔ ”لیکن وہ کھنڈروں ہی میں کسی جگہ موجود ہیں مجھے یقین ہے کہ انہوں نے یہاں کوئی پناہ گاہ بنا رکھی ہے۔“

”ہاں۔ اور اب انہیں تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“ سکندر نے کہا اور پتہ لہو کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”ٹایاب زخمی ہو گئی ہے۔ قیوم! تم اور دہلی اسے لے گاؤں چلے جاؤں۔ ڈاکٹر سوسا ہو گا۔ اسے جگا کر اس کی ڈریسنگ کراؤ۔ ہم یہاں ان لوگو کی تلاش کرتے ہیں۔“

”نہیں سکندر بھائی!“ ٹایاب نے کہا۔ ”وہ لوگ پوری طرح مسلح ہیں۔ اس وقت انہیں تلاش کرنا خطرناک ہو گا۔ آپ لوگ بھی گاؤں چلے۔ صبح یہاں آکر دیکھا جائے گا۔“

”مس ٹایاب ٹھیک کبھی ہیں ملک صاحب!“ نیچے نے کہا۔ ”اب ہمیں پتہ چل گیا۔ کہ وہ لوگ یہاں موجود ہیں اور مسلح ہیں۔ کھنڈر کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس وقت واہ چلے جائیں اور صبح آکر انہیں تلاش کریں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر چلو۔ اگر خون زیادہ بہہ گیا تو ٹایاب کی حالت بگڑ جائے گی۔“ سکندر بولا۔

”میں ٹھیک ہوں سکندر بھائی۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ دہلی نے زخم پر پٹی باندھ دی ہے۔ زیادہ پریشانی کا

مجھے افسوس ہے۔ اس وقت میری حالت تم نے دیکھ لی تھی۔ اگر تم مجھے وہاں سے اٹھا کر نہ لائیں تو شاید میں ختم ہو جاتا۔“

وہ نتیجہ تھا جو ایک روشن انسانی ہیولے کی صورت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”بیجو۔“ ٹاپ کے منہ سے گمراہ سانس نکل گیا۔ ”یہ سب کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”پہلی ملاقات پر دیوی ماں نے تمہیں بتایا تھا کہ رانی شہا ایک ایسی ٹاپاک قوت کے بحر میں پھنس گئی تھی جو اپنے آپ کو ہنومان کہتا تھا۔ اس کی وجہ سے رانی شہا کو اپنی جان سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ اس روز دیوی ماں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ہنومان زخمی ہے۔ وہ ہنومان کے روپ میں راکشش ہے۔ وہ یہاں آگیا ہے اور سامنے آئے بغیر ان لوگوں کی مدد کر رہا ہے جو رانی شہا کو خزانہ تلاش کرنے آئے ہوئے ہیں۔ وہ شیطان جب یہاں موجود ہوتا ہے تو ہماری قیمتی وقتی طور پر سلب ہو جاتی ہیں۔ ہم اس کے سحرے ٹکٹے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جس میں زیادہ قوت مدافعت نہیں ہوتی وہ مارا جاتا ہے۔ آج میری قوت مدافعت تقریباً جواب دے چکی تھی۔ اگر تم ہر وقت مجھے وہاں سے نہ اٹھا لائیں تو شاید میں یہ سب کچھ تانے پکینے زندہ نہ رہتا۔“ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر گمرے گمرے سانس لینے لگا۔ ٹاپاک کو اس کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”وہ کون لوگ ہیں جو خزانہ تلاش کر رہے ہیں۔ کیا تم لوگ انہیں روک نہیں سکتے؟“ ٹاپاک نے پوچھا۔

”وہ تمہارے دشمنوں میں سے ہیں۔“ بیجو نے جواب دیا۔ ”ہماری کوششوں سے وہ لوگ اب تک خزانے سے دور ہیں۔ وہ لوگ اس شیطان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہدی کی کوئی قوت ان کی مدد کر رہی ہے۔ میرے بیڑہ ساتھیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ خود مارے گئے۔ اب تک میرے سات ساتھی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو اس راکشش کی فیحی حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ اب تک راکھ ہو چکے ہوتے۔“

”لیکن تم تو بے پناہ قوتوں کے مالک ہو۔ کیا تم اس راکشش کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟“ ٹاپاک نے پوچھا۔

پوچھتے ہوئے کہا۔ ”ایک گولی ابھی کھا لو اور ایک صبح کھا لیتا۔ میں صبح آؤں گا دیکھنے کیلئے۔“

”میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ اس کے ساتھ گولی کھا لیتا۔“ سیکنے نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں بھائی۔“ ٹاپاک جلدی سے بولی۔ ”صرف ایک گلاس پانی لا دیں۔ دودھ کی ضرورت نہیں ہے۔“

سیکنے اسے گھورتی ہوئی باہر نکل گئی اور تقریباً دس منٹ بعد وہ دودھ ہی گرم کر کے لائی تھی۔

”تو۔۔۔ یہ گولی کھا لو اور اندر چل کر سو جاؤ۔ کیس ایسا نہ ہو، جاگتے رہنے سے ہمارا طبیعت خراب ہو جائے۔“ سیکنے نے دودھ کا گلاس اس کی طرف پوچھتے ہوئے کہا۔ اور پھر ٹاپاک کو اس کے ساتھ جانا ہی پڑا تھا۔

غذہ اور زمرگ ایک ہی بیڑہ پر سو رہی تھیں۔ دوسرا بیڑہ خالی تھا، ٹاپاک اس پر لیٹ گئی۔ سیکنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹاپاک بستر پر لیٹی آج کے واقعہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو نیلے کے کھنڈروں میں پراسرار سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور کھنڈروں میں بسنے والے سانپوں کو ختم کر رہے تھے۔ وہ لوگ جس طرح کھنڈروں میں غائب ہو گئے تھے اس سے ٹاپاک کو یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے کھنڈروں ہی میں کوئی پناہ گاہ تلاش کر لی تھی۔ ان کی پراسرار سرگرمیوں سے خزانے کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

وہ بیجو کے بارے میں سوچنے لگی۔ بیجو ان دنوں خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کبھی کبھی اس کی ساری قیمتی سلب ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ختم مردہ سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

بستر پر لیٹے ہوئے ٹاپاک کی نظر اچانک ہی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ بہت ہی مدہم روشنی کا ایک بھولہ کھڑکی سے اندر داخل ہوا تھا۔ کمرے میں بیٹنے والے سبز باب کی روشنی میں وہ بیولہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا اور پھر وہ کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا۔ ٹاپاک ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے افسوس ہے۔“ ٹاپاک کے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ ”تمہارے زخمی ہونے کا

کی طرف بڑھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی سے باہر نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔
 نایاب بے حس و حرکت بیٹھی کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اس نے لٹ کر
 آنکھیں بند کر لیں۔

تحدید نمبر 26

سکندر، نایاب اور نیپو معجوبے کے قریب پھر کھڑدوں میں پہنچ گئے۔ وہ اسی جگہ
 رک گئے جہاں رات کو نایاب پر گولی چلائی گئی تھی۔ وہاں پتھروں پر نایاب کے ہاتھ سے بنے
 والے خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔
 ”میں نے بھی اس طرف گولی چلائی تھی اور وہاں سے کسی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔“
 سکندر نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے وہ زخمی ہوا ہو گا۔ چلو اس
 طرف چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ شکستہ دیواروں سے نکل کر ایک طرف چل پڑے۔ نیپو کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ
 مختار انداز میں چاروں دیکھ رہا تھا۔ تقریباً بیس قدم کے بعد وہ رک گئے۔ یہاں زمین پر
 خون کے دھبے دیکھ کر سکندر کی آنکھوں میں ہلکی سی آنسو آئی۔

وہ ”نہ“ کے نشانات کو دیکھتے ہوئے چلتے رہے اور بالا خر ایک جگہ رک گئے۔ یہاں
 خون کے نشانات ختم ہو گئے۔ ملک سکندر اور نایاب گہری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے گئے۔
 اس جگہ کے آس پاس کہیں اور خون کے دھبے نظر نہیں آ رہے تھے۔ لگتا تھا وہ زخمی شخص
 یہاں آکر یا تو ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا یا اسے زمین نے نگل لیا تھا۔

زمین سے نکل جانے والا خیال قرن قیاس تھا۔ وہ گہری نظروں سے آس پاس کی جگہ
 کا جائزہ لینے لگے لیکن ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے شبہ ہو تاکہ یہاں کوئی تہہ خانہ
 موجود ہے۔

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ ہر طرف بکھرے ہوئے پتھر اور کھڑدوں کی شکستہ دیواریں
 چنچ گئی تھیں۔ وہ تیزوں پسینے سے شرابو ہو رہے تھے۔

”ہو سکتا ہے اس جگہ کے بارے میں ہمارا شبہ غلط ہو۔“ بالا خر نایاب نے کہا۔ ”یہ تو
 ثابت ہوتا ہے کہ یہاں تک اس شخص کے زخم سے خون نہکا رہا تھا لیکن ہر سکتا ہے

”وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔“ نیپو نے جواب دیا۔ ”وہ مجھے ختم کرنا چاہتا ہے۔
 میرے ختم ہو جانے سے خزانے کی حفاظت کے سارے بند ٹوٹ جائیں گے اور پھر ان
 لوگوں کو خزانے تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن مطمئن رہو۔ دیوی ماں خزانے کے
 پاس موجود ہے۔ وہ کسی کو قریب نہیں پہنچنے دے گی۔“
 ”یہ تو بڑی تشریفک صورت حال ہے۔“ نایاب نے کہا۔ ”اگر کسی وقت تمہاری بھی
 قوت مداخلت جواب دے گی تو۔۔“

”دیوی ماں کا سایہ میرے ساتھ ہے۔“ نیپو نے جواب دیا۔ ”میں جب بھی ایسی
 صورت حال سے دوچار ہوتا ہوں دیوی ماں کسی نہ کسی کو میری مدد کیلئے بھیج دیتی ہے۔ جیسے
 آج اس نے جہیں وہاں بھیج دیا تھا اور تم مجھے وہاں سے اٹھا لائیں۔ یہاں آنے کے
 تھوڑی ہی دیر بعد میری قوت آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی اور اس وقت میں پہلے جیسی
 قوتوں کا مالک ہوں اور اس وقت تو میں جہیں ایک بات بتانے کے لئے خاص طور پر یہاں
 آیا ہوں۔“

”کیا بات ہے؟“ نایاب نے سوالیہ نگاہوں سے ہولے کی طرف دیکھا۔
 ”تمہارے دشمن تمہارے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔“ نیپو نے جواب دیا۔
 ”میں اپنے بارے میں جہیں تا چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی آڑے وقت میں تمہاری
 مدد کو نہ آسکوں اس لئے جہیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جہیں چوکس
 رہنا ہو گا اور اپنی حفاظت خود کرنی ہو گی۔“

”کیا وہ لوگ مجھے ختم کر دیں گے؟“ نایاب نے پوچھا۔
 ”وہ جہیں ختم نہیں کر سکیں گے لیکن نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ البتہ
 ایک موقع ایسا آئے گا کہ وہ لوگ خود ختم ہو جائیں گے۔ میں ان کی موت اسی حویلی میں
 دیکھ رہا ہوں۔“

”اوہ۔“ غلاب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
 ”اب میں چلتا ہوں۔“ نایاب کے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ ”میں نے جو باتیں کہی
 ہیں ان پر دھیان دینا اور اپنا خیال رکھنا۔“
 نایاب سر ہلا کر رہ گئی۔ مدھم سی روشنی کا وہ بیولہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا ہوا کھڑکی

جگہ سے اچھلا اور ڈھلان پر دوڑنے لگا۔ وہ کئی کئی لمبی چٹانگ لگا رہا تھا۔ سکندر اور نیچو دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ نیچو دوڑتے ہوئے فائرنگ بھی کر رہا تھا لیکن کوئی گولی اس بندر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

وہ بندر برگد کے درخت پر چڑھ کر غائب ہو گیا تھا۔ وہ تینوں بھی چبوترے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ اس طرح بے حاشہ دوڑتے ہوئے ان کی سانس پھول گئے تھے۔

”اب یہ بچ کر نہیں جائے گا۔“ نیچو کہنے ہوئے برگد کے درخت کی طرف بڑھنے لگا۔

ٹایاب اور سکندر بھی اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ سکندر نے بھی اپنی جیب سے ہسٹول نکال لیا تھا۔

برگد کا وہ بوڑھا درخت بہت پھیلا ہوا تھا اور اس کی شاخیں بہت گنجان تھیں۔ اس کی گنجان جٹاؤں نے شاخوں میں ایک جال سا بن رکھا تھا۔ اس طرح شاخوں میں چھپی ہوئی کسی چیز کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔

نیچو نے گنجان شاخوں میں ایک دو گولیاں بھی چلائی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بندر کر درخت سے اتر جائے گا اور کسی طرف بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن گلتا تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اس بندر کو تلاش کرتے رہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

”یہ تو واقعی شیطان کی طرح غائب ہو گیا ہے۔“ سکندر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن تم نے کیا کہا تھا کہ وہ بندر نہیں“ شیطان ہے۔“ وہ مڑ کر ٹایاب کی طرف دیکھنے لگا۔

”گزشتہ رات بچو نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ ہمارے دشمن ان کنڈوروں میں چھپے ہوئے ہیں اور یہ شیطان ان کی مدد کر رہا ہے۔“ ٹایاب نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے سب کچھ تفصیل سے بتانے لگی۔

”اوہ۔“ سکندر چونک گیا۔ ”ہمارے وہ دشمن کون ہو سکتے ہیں؟“

”چوہدری سعادت کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔“ ٹایاب بولی۔ ”آپ کو یاد ہے، اسلام نای فصیح نے بتایا تھا کہ چوہدری سعادت ہر گھم کے ساتھ اس طرف آنے والا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا منصوبہ کچھ اور ہو رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں کسی طرح اس

یہاں پہنچ کر اس نے اپنے زخم پر پٹی باندھ لی ہو اور وہ یہاں سے کسی اور طرف چلا گیا ہو۔“

”ہاں یہ ممکن ہے۔“ نیچو نے کہا۔ ”اس طرح ان لوگوں کو تلاش کرنا ممکن نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ ان کنڈوروں کی مستقل طور پر گھرائی کی جانی چاہئے۔ ایک دو آدمی یہاں سے دور کسی ایسی جگہ چھپ کر بیٹھے رہیں کہ یہ کنڈور ان کی نگاہوں میں رہیں۔ اگر یہاں کوئی آدمی نظر آئے تو وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ کہاں سے نمودار ہوا اور کہاں غائب ہوا۔ اس طرح ان کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ سکندر نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ”ابھی ہم یہ بھی دیکھ لیں گے کہ گھرائی کیلئے کوئی جگہ مناسب رہے گی اور میرا خیال ہے اب ہمیں ان کنڈوروں سے باہر نکلنا چاہئے تاکہ ہم آس پاس کا جائزہ لے سکیں۔“

”چلو۔“ سکندر نے کہا اور وہ تینوں کنڈوروں میں ہوتے ہوئے اس طرف چل پڑے جہاں سے برگد کے درخت کی طرف راست جانا تھا۔ وہ ابھی ڈھلان اتر رہے تھے کہ آخری کنڈوروں میں ایک بندر کو دیکھ کر چونک گئے۔ وہ بندر عام بندروں سے خاصا بڑا تھا اور کنڈوروں میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کسی سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جس جگہ وہ پہنچ گیا تھا اس سے آگے کنڈور نہیں تھے۔ اس لئے وہ ان کی نظروں میں آگیا تھا۔

”اس علاقے میں تو بندر نہیں ہوتے۔ یہ کم بخت کہاں سے آگیا۔“ ملک سکندر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”کل ایک دھاری گاؤں میں آیا ہوا تھا۔“ نیچو نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ اسی کا بندر ہو اور کسی طرح بھاگ نکلا ہو۔“

وہ بندر ایک پتھر کے قریب پچھلے دو دیروں پر کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح کھڑے ہونے کے انداز نے ٹایاب کو چنکا دیا اور پھر وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔

”سکندر بھائی۔“ وہ چیخی۔ ”یہ بندر نہیں شیطان ہے۔ بارو اسے بچ کر جانے نہ پائے۔“

سکندر تو اس کی بات پر الجھ کر رہ گیا مگر نیچو نے فوراً ہی گولی چلا دی تھی۔ وہ بندر اپنی

خزانے کے بارے میں پتہ چل گیا ہو۔ وہ سامنے آنے کے بجائے ان کھنڈروں کے بارے میں کسی جگہ چھپے ہوئے ہیں اور یہ شیطان ان کی مدد کر رہا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ صورتحال واقعی سنگین ہو گئی ہے۔“ سکندر بولا۔

”ہاں۔“ ثانیاب بولی۔ ”صورتحال اس طرح بھی سنگین ہو گئی ہے کہ نیجہ کی قوتیں سلب ہوتی جارہی ہیں۔ اس راکشش کی وجہ سے خزانہ کے محافظ ایک ایک کر کے مارے جا رہے ہیں۔ نیجہ بھی اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اس نے تو رات کو مجھے کہہ دیا تھا کہ ہمیں اپنی حفاظت کا خود بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”وہ تو ہم کر ہی لیں گے۔“ سکندر بولا۔ ”اگر چہ دہری سعادت ان کھنڈروں میں چھپا ہوا ہے تو میں اسے نکال کر جانے نہیں دوں گا۔ خیر چلو۔ اب واپس چلیں۔“

وہ لوگ دوبارہ نیلے پر آگئے اور کھنڈروں میں ہوتے ہوئے نیلے کے دوسری طرف جانے لگے۔

کھنڈروں سے باہر نکل کر چند گز آگے پہنچے تھے کہ ثانیاب ٹھٹھ کر رک گئی۔ سامنے ایک پتھر کے قریب سنہری ناگ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ ثانیاب جلدی سے آگے بڑھ کر جبکہ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ناگ کا سر پکلا ہوا تھا۔

سکندر اور نیچہ بھی جبکہ کر اسے دیکھنے لگے اور دوسرے ہی لمحہ نضا فائز کی آواز سے گونج اٹھی۔ کھنڈروں کی طرف سے چلائی جانے والی گولی ثانیاب کے سر کے قریب سے ہوتی ہوئی سامنے ایک بڑے پتھر پر گئی تھی۔ وہ تینوں اچھل پڑے۔ ایک فائر اور ہوا۔ یہ گولی بھی پتھر پر گئی۔ ان تینوں نے بیک وقت چھلانگ لگا دی اور پتھر کے چھپے دیک گئے۔



وہ پتھر اگرچہ اتنا بڑا تھا کہ وہ تینوں اس کے پیچھے آسانی سے چھپ گئے تھے لیکن اس کے علاوہ آس پاس ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتے۔ وہاں سے دس فٹ دور ایک اور پتھر تھا لیکن کھنڈروں کی طرف سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی اور برستی ہوئی گولیوں میں یہاں سے نکل کر دوسرے پتھر تک پہنچنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ تینوں پتھر کے پیچھے اس طرح کئے ہوئے تھے کہ درمیان میں ثانیاب تھی۔ دائیں طرف ملک سکندر اور بائیں طرف نیچہ۔ ان پر فائرنگ تقریباً سو گز کے فاصلے سے ہو رہی تھی۔ فائرنگ کرنے والے دو آدمی تھے اور دونوں کھنڈروں کی شکستہ دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ انڈیش اس بات کا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک کھنڈروں میں چھپتا ہوا دوسری طرف سے سامنے آگیا تو ان کے لیے اپنا دفاع مشکل ہو جائے گا۔

ان تینوں میں سے ہتھول ملک سکندر کے پاس تھا۔ ثانیاب کے پاس ظاہر ہے کسی اسلحہ کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیچہ اپنا ہتھول ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔

”ان لوگوں سے بچنے کے لیے ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔“ ملک سکندر نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس ہتھول موجود ہے لیکن ہم زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان سے ٹھنڈے کا ایک طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے۔“

”وہ کیا؟“ ثانیاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں سے نکل کر اس پتھر کے پیچھے بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ سکندر نے دس فٹ دور دوسرے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں سے دوسرے پتھروں کی آؤ لیتا ہوا میں ان لوگوں کے دوسری طرف بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ

توڑا اٹھیں۔ فائزنگ کا رخ اسی ٹوپی کی طرف تھا۔

سکندر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔
دس فٹ فاصلہ اس نے پلک جھپکنے کی دیر میں طے کر لیا لیکن حملہ آور بھی غالباً اس چال کو
سمجھ گئے تھے کیونکہ دوسرے ہی لمحہ رائفلس کا رخ دوسرے چتر کی طرف ہو گیا تھا مگر سکندر
کوئی نقصان اٹھائے بغیر دوسرے چتر کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس سے آگے ایسے لاتعداد چتر
تھے جو اسے گولیوں کا نشانہ بننے سے بچا کھتے تھے۔ وہ سینے کے بل پتھروں کے پیچھے تیزی
سے دھنکے ہوا آگے بڑھنے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے نکل کر وہ رکا اور محتاط انداز میں سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
حملہ آوروں میں سے ایک آدمی ایک شکستہ دیواری کی آڑ سے نکل کر دوسری طرف جا رہا تھا۔
سکندر نے گولی چلا دی۔ وہ شخص اپھل کر دیواری کی آڑ میں چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ
اس نے سکندر پر گولیوں کی بار بجھاؤ کر دی۔ سکندر نے بھی یکے بعد دیگرہ دو فائزنگ کر دیئے تھے۔
وہ آدمی ایک بار بھرا ہوا جگہ سے نکل کر فائزنگ کرتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ اس
مرتبہ سکندر نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔ کھنڈروں میں دوڑنے کی
آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وہ دونوں آدمی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سکندر پتھروں کی آڑ سے نکل آیا اور کھنڈروں کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے دیکھ کر
ٹایا ب اور ٹیچہ بھی چتر کی آڑ سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔

”بھاگ گئے۔“ ٹایا ب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ بھاگ گئے لیکن پتہ نہیں وہ کون تھے۔“ سکندر نے کہا۔

”ملک صاحب!“ ٹیچہ بولا۔ ”وہ جو کوئی بھی تھے“ انہوں نے اپنی کھنڈروں میں کوئی پناہ
گاہ بتا رکھی ہے۔“ امیں کھنڈروں سے باہر جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔“

”تم دیکھ رہے ہو“ یہ کھنڈر کتنے لمبے چوڑے رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کی
پناہ گاہ تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا۔“ سکندر بولا۔

”لیکن کوشش تو کی جا سکتی ہے۔“ ٹیچہ بولا۔

”ہم پہلے بھی دو گھنٹے تک کھنڈروں میں گھومتے رہے ہیں لیکن ہم کوئی سراغ نہیں لگا
سکے تھے اور اب بھی کوئی ایسی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اس کے لیے ہمیں کوئی دوسرا طریقہ

کون لوگ ہیں؟“

”وہ چودھری سعادت کے آدمیوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔“ ٹایا ب نے کہا۔
”لیکن آپ اس طرف کیسے جائیں گے۔“ وہ دوسرا چتر کم از کم دس فٹ کے فاصلے پر ہے۔
وہاں تک پہنچنے میں کسی گولی نے آپ کو مانگ لیا تو۔۔۔۔۔“

”یہ رکب تو لینا ہی پڑے گا۔“ سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کے بغیر کوئی
چاہہ نہیں۔ اگر ہم یہاں بیٹھے رہے تو وہ لوگ دیسے ہی ہمیں گھیر کر ختم کر دیں گے۔“
”سکندر بھائی آپ بہت دلچسپ لگتے ہیں۔ میں اس طرف جانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ٹیچہ
نے کہا۔

”نہیں۔“ سکندر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”تم دوسری طرف سے کسی طرح انہیں اپنی
طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرو۔ میں موقع پا کر اس طرف سے نکل جاؤں گا۔“

”فائزنگ کی آوازیں گاؤں تک پہنچ رہی ہوں گی۔“ ٹایا ب بولی۔ ”مجھے حیرت ہے کہ
گاؤں کے لوگ صورتحال معلوم کرنے کے لیے اس طرف کیوں نہیں آئے۔ کیا وہ سب
بزدل ہیں؟“

”بات بزدلی کی نہیں ہے ٹایا ب۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”صورتحال سے تم پوری
طرح واقف ہو۔ جو لوگ ان معاملات میں براہ راست ملوث ہیں، وہ تو پرانی عورتی میں جمع
ہیں۔ گاؤں میں جو لوگ موجود ہیں، ان میں زیادہ تر نرے ہیں اور ظاہر ہے کوئی بھی اپنے
آپ کو موت کے منہ میں دھکیلتا پسند نہیں کرے گا۔ ہر حال ٹیچہ! تم اس طرف سے ان
لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرو۔“

ان لوگوں کی توجہ بٹانے کی ترکیب فوراً ہی ٹیچہ کے ذہن میں آگئی۔ اس نے دھوپ
سے بچنے کے لیے گولف کپ پہن رکھی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے قریب کی ایک
جھاڑی سے لمبی سی شاخ توڑی اور ٹوپی سر سے اتار کر شاخ پر ٹانگی لی اور شاخ کو آہستہ
آہستہ پتھر سے باہر نکالنے لگا۔ دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ٹوپی پہنے ہوئے
کوئی شخص چتر کی آڑ سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ٹیچہ کی یہ چال کامیاب رہی۔ کھنڈروں میں چپے ہوئے حملہ آوروں نے وہ ٹوپی دیکھی
وہ بھی سمجھے کہ کوئی شخص اس چتر کی آڑ سے نکل رہا ہے۔ دو آؤٹکناک رائفلس یکبارگی

گئی۔ نیچے اور ملک سکندر اپنی جگہ پر خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ سیاہ کورا تقریباً بیس گز آگے ایک بڑے پتھر کے پاس رک گیا۔ پتھر کے نیچے ایک بل نظر آ رہا تھا۔ کورے نے جھن پھیلا لیا اور ایک بار پھر پھٹکارتے ہوئے زمین پر سر مارنے لگا۔ ٹایاب نے سترے سانپ کو زمین پر رکھ دیا۔ کورے نے ٹایاب کی طرف دیکھا اور سترے سانپ کی گردن اپنے منہ میں دبوچ لی اور اسے لے کر بل میں گھسنے لگا۔ وہ اس وقت تک وہاں گھنٹوں کے بل بیٹھی تھی جب تک سترے سانپ کی دم بھی مکمل طور پر بل میں غائب نہیں ہوگئی اور جب وہ بیدار ہوئی تو سکندر اور نیچے اس کے قریب کھڑے تھے۔

”مجھے یقین کی موت کا بہت افسوس ہے ٹایاب۔“ سکندر نے ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ مجھے اس کی موت کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔“ ٹایاب نے افسوس سے لمبے میں جواب دیا۔ ”اور میں جانتی ہوں اس کی موت کا ذمہ دار کون ہے۔ وہ اگر میرے ہاتھ لگ گیا تو میں اسے کچا چا جاؤں گی۔“

”ہاں۔ اسے واقعی ایسی سزا دی جانی چاہئے کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ بہر حال اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔ گرمی بہت زیادہ ہو رہی ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔

وہ تینوں ٹیلے سے اترنے لگے۔ نیچے نے صرف بائیں سنی تھیں کہ دنیا کے زہریلے ترین سانپ ٹایاب کے دوست ہیں۔ آج اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ سترے سانپ تو مر چکا تھا مگر وہ سیاہ کورا لگتا تھا جیسے وہ ٹایاب کا پالتو ہو۔

جب وہ ٹیلے سے اترے تو گاؤں کی طرف سے تین چار آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آج میں سے ایک کے ہاتھ میں دو ٹالی بندوق تھی اور باقی آدمیوں نے لٹھیاں اٹھا رکھی تھیں۔

”ملک جی۔ آپ لوگ ٹھیک تو ہیں نا؟“ بندوق والے نے پوچھا۔

”ہاں۔ ہم لوگ ٹھیک ہیں مگر تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا کہ ہم لوگ ادھر آئے ہوئے ہیں؟“ ملک سکندر نے پوچھا۔

”وہ جی بھائی شریف اس طرف کہتوں میں کام کر رہا تھا۔ اس نے آپ لوگوں کو

اختیار کرنا پڑے گا اور اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ گرمی سے دماغ چلپا ہو رہا ہے۔“

وہ لوگ پھر اسی طرف سے گزرے جہاں ٹایاب نے سترے سانپ کو پڑے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے مردہ سانپ کو اٹھا لیا تھا لیکن فائزنگ سے بچنے کے لیے وہ پناہ کے لیے پتھر کی طرف دوڑے تھے تو سانپ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ اس جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ اچھل پڑی۔ نیچے اور ملک سکندر نے بھی وہ حیرت انگیز منظر دیکھ لیا تھا۔

سیاہ رنگ کا ایک کورا مردہ سترے سانپ کی گردن کو منہ میں دبوچے اسے گھسیٹا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا۔ نیچے اور سکندر تو دین رک گئے مگر ٹایاب تیزی سے آگے بڑھی۔

”یہ کیا حماقت کر رہی ہو؟ پیچھے ہٹ جاؤ۔ کورے نے اگر خمیس ڈس لیا تو۔۔۔۔۔“

”کورا مجھے نہیں ڈسے گا سکندر بھائی۔“ ٹایاب اس کی بات کاٹ کر آگے بڑھتی رہی۔ وہ کورے سے دو قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ کورے نے سترے سانپ کو چھوڑ دیا اور سر اوپر اٹھا کر جھن پھیلا لیا۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک پھٹکار سی نکلی تھی لیکن وہ ٹایاب پر حملہ آور ہونے کے بجائے اس کی طرف دیکھا رہا۔ سکندر چند گز دور ہتھول تانے تیار کھڑا تھا کہ اگر کورا ٹایاب پر حملہ کرنے کی کوشش کرے تو گولی سے اس کا سر اڑا دے۔

ٹایاب گھنٹوں کے بل جھک گئی اور پھر جھکتے ہوئے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا مردہ سترے سانپ کو اٹھا لیا۔ کورا اپنی جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ سترے سانپ کا سر پھٹکا ہوا تھا۔ یا اسے گولی سے اڑایا گیا تھا یا کسی بھاری پتھر سے کھنکھنایا گیا تھا۔ ٹایاب سانپ کے جسم ہاتھ سے سلرا رہی تھی۔ دفعتاً پھٹکار کھنکھناتاز سن کر وہ چونک گئی۔

سیاہ کورا پھٹکارتے ہوئے جھن کو زمین پر مار رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سترے سانپ کو نیچے رکھ دو۔

”اسے تیرے خانے میں ناگ مانا کے پاس لے جانا چاہئے ہو۔“ ٹایاب نے کورے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کورا ایک بار پھر پھٹکارا۔ ”چلو۔ میں تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ کس طرف جانا ہے۔“

کورا ایک طرف ریختے لگا۔ ٹایاب سترے سانپ کو اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے

ابنہ وہ رات کے اندھیرے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔
”پر وہ ہیں کون لوگ ملک جی؟“ ایک نوجوان نے پوچھا۔

”اگر یہ معلوم ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”دیئے سب لوگ جانتے ہیں کہ خزانے کی تلاش میں لوگ یہاں آتے رہے ہیں لیکن یہ لوگ جو کوئی بھی ہیں، انہیں صرف خزانے کی تلاش نہیں ہے۔ وہ ہمیں بھی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں صرف خزانے کی تلاش ہوتی تو ہمارے سامنے آنے کی کوشش نہ کرتے۔ انہوں نے ہم پر فائزنگ کر کے ہمیں ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ رات کے وقت ان کھنڈروں کی مہمرائی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کی خفیہ پناہ گاہ کہاں ہے؟“

”دیئے آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتے ہیں ملک جی؟“ ایک اور نوجوان نے پوچھا۔
”مجھے شبہ ہے کہ وہ چودھری سعادت کے آدمی ہیں۔“ سکندر نے جواب دیا۔
”اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ سرحد پار چلا گیا ہے۔ پھر یہ پتہ چلا کہ وہ ڈاکو بھرتکھ کے ساتھ ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے والا ہے۔ تم سب لوگ اس رات گاؤں کی حفاظت کے لیے جا رہے ہو لیکن وہ لوگ نہیں آئے۔ مجھے شبہ ہے کہ بھرتکھ نے کسی وجہ سے سعادت کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہو گا اور وہ اپنے ایک دو آدمیوں کو لے کر کھنڈروں میں چھپا ہوا ہے اور شاید کسی موقع کی تلاش میں ہے۔ سعادت اور ہمارا لڑکین انہیں کھنڈروں میں کھینچے ہوئے گزرا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے کھنڈروں میں کوئی خفیہ ٹھکانہ تلاش کر لیا ہو جسے دوسروں سے پوشیدہ رکھا اور اب وہی جگہ اس کے کام آ رہی ہو۔“
”ان کھنڈروں میں ہم بھی بہت گھومے ہیں ملک جی۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہاں کوئی ایسی جگہ ہوگی۔ اس نوجوان نے کہا۔

”نیلے پر پھیلے ہوئے کھنڈر اپنے اندر بہت سے اسرار چھپائے ہوئے ہیں۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”میں صدیوں سے لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ کسی وقت کوئی چیز دریافت ہو جاتی ہے جو ہم سب لوگوں کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوتی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی سوچ سکتا ہے کہ ہرگز کے درخت کے پاس مندر والے چوڑے کے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو سکتا ہے؟“

کھنڈروں میں گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر فائزنگ ہونے لگی تو وہ کھیتوں میں چھپا ہوا گاؤں پہنچ گئے۔ گولیاں چلنے کی آواز ہم لوگوں نے بھی سنی تھی لیکن توجہ نہیں دی تھی مگر جب شریف نے بتایا تو ہم اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرے لوگ بھی آ رہے ہیں مگر وہ کون لوگ تھے ملک جی؟ گولیاں کیوں چلا رہے تھے؟“
”یہ نہیں کون لوگ تھے۔ بھاگ گئے۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔

وہ لوگ گاؤں کی طرف چلے رہے۔ نہر کے قریب پہنچے تو انہیں کچھ اور لوگ نظر آ گئے۔ ان میں بھی صرف ایک کے پاس بندوق تھی، باقیوں نے لٹھیاں اٹھا رکھی تھیں۔ گاؤں میں داخل ہوئے تو کچھ اور لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ بعض نامعلوم لوگوں نے کھنڈروں میں ملک سکندر اور ٹایاب کو فائزنگ کر کے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ٹایاب، نیچو اور سکندر ملک حویلی میں آ گئے۔ گاؤں کی عورتیں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آ رہی تھیں۔

حویلی میں کچھ دیر رکنے کے بعد ٹایاب اور نیچو حویلی سے نکل کر رابعہ کے مکان پر آ گئے جہاں بڑے زور و شور سے کام ہو رہا تھا۔ ٹایاب کچھ دیر تک وہاں کھڑی کام کا جائزہ لیتی رہی، پھر گاؤں میں گھوم پھر کر مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کرتی رہی۔ یعقوب اور رابعہ پرانی حویلی میں تھیں۔ اطلاع پا کر وہ بھی گاؤں آ گئے۔ ان کے ساتھ روہی بھی تھی۔

وہ سب لوگ ملک صاحب کی حویلی کی ٹینک میں جمع تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے وہیں پر کھایا تھا اور پھر شام تک وہ لوگ حویلی ہی میں آرام کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے کچھ دیر بعد ملک سکندر نے گاؤں کے باؤچ چھ نوجوانوں کو بلا لیا۔ یہ سب کے سب کزلیں جوان تھے اور بڑے دل گردے والے تھے۔

”تم لوگ جانتے ہو کہ چند روز سے کھنڈرات میں کچھ بے اسرار قسم کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی ہیں۔“ ملک سکندر نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ مچ ہم لوگ ان کی تلاش میں کھنڈرات میں گئے تھے۔ فائزنگ کی آوازیں تم لوگوں نے بھی سنی ہوں گی لیکن وہ لوگ غائب ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کھنڈروں ہی میں کوئی خفیہ پناہ گاہ بنا رکھی ہے۔ اب وہ لوگ دن کے وقت اس پناہ گاہ سے نکلنے کی حثایت نہیں کریں گے۔

انہیں زندہ بچانے کی کوشش کریں۔"

"ٹھیک ہے ملک جی!" اس نوجوان نے کہا۔ "ہم آج رات ہی سے ان کھنڈروں کی عمرانی شروع کر دیتے ہیں۔ کیا ہم ابھی چلے جائیں؟"

"میرا خیال ہے دس بجے کے بعد جاؤ تو بہتر ہوگا۔ ابھی تو شام ہوئی ہے۔ وہ اتنی جلدی باہر آنے کی محنت نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے ملک جی۔" اس نوجوان نے کہا۔ "مثلاً بہت لمبا چوڑا ہے اور کھنڈرات بھی بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم چار چھ آدمی اور لے لیتے ہیں اور دس بجے کے قریب کھنڈروں کی طرف چل پڑیں گے۔"

"مختار رہتا۔" ملک سکندر نے کہا۔ "وہ لوگ مسلح ہیں، کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملک جی۔" اس نوجوان نے کہا۔ "ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کھنڈروں کی عمرانی کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا کر باقی آدمیوں کو بھی جمع کر لو اور اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاؤ۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"چھا ملک جی۔ اب ہم چلتے ہیں۔" وہ نوجوان کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھی بھی اٹھ گئے۔

ان کے جانے کے بعد ملک سکندر اور نیچو بیٹھک میں اکیلے رہ گئے۔ راجو، ٹایاب اور روہی حویلی کے اندرونی حصے میں تھیں۔

"میں دیکھوں کھانا تیار ہوا ہے کہ نہیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔" ملک سکندر کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

ٹایاب وغیرہ برآمدے ہی میں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سیکڑ بھی وہیں تھی۔

"کیوں ابھی۔ آج کھانا وغیرہ نہیں کھانا کیا؟" ملک سکندر نے سیکڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا تو تیار ہے۔ آپ ہی گاؤں کے لوگوں کو جمع کیے بیٹھے تھے۔" سیکڑ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا کھانا بیٹھک ہی میں بھجوا دوں یا یہاں کھائیں گے؟"

"ہم نے تو ایک بار نہیں کئی بار چوتڑے کا ایک ایک انچ حصہ خوب ٹھوٹک بھاکر دکھا ہے ملک جی۔ وہاں کوئی ترہ خانہ نہیں ہے۔" اس نوجوان نے کہا۔

"مگر اس چوتڑے کے پیچھے ایک بہت بڑا ترہ خانہ ہے۔" ملک سکندر نے کہا۔ "یہ نیچو اپنی دوست روہینہ کے ساتھ خزانہ تلاش کرنے ان کھنڈروں میں آیا تھا اور یہ کئی روز تک اسی چوتڑے کے پیچھے ترہ خانے میں چھپے رہے تھے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ان کھنڈروں کے پیچھے ایسے اور بھی خفیہ ٹھکانے موجود ہوں گے جن کے بارے میں ہم لوگ ابھی تک کچھ نہیں جان سکتے۔"

"ایک بات کون ملک جی!" ایک اور نوجوان بولا۔ "وہ خوفناک سہرا سانپ بھی انہی کھنڈروں میں کسی جگہ رہتا ہے اور وہ سہرا سانپ چھوٹی لی لی کا دوست ہے۔ وہ بہت کچھ جانتا ہے اور چھوٹی لی لی کی باتوں کو سمجھتا ہے۔ چھوٹی لی لی اس سہرے ناگ کے ذریعے یہ کیوں نہیں معلوم کر لیتی کہ چودھری سعادت اور اس کے ساتھ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"بھجوا! سکندر کے منہ سے بے اختیار مگرا سانس نکل گیا۔ "وہ سہرا سانپ مر گیا ہے۔"

"مر گیا ہے!" کئی آدمیوں کے منہ سے یک وقت یہ الفاظ نکلے تھے۔

"ہاں۔" سکندر بولا۔ "آج صبح ہم کھنڈروں سے واپس آ رہے تھے تو ٹیلے پر وہ مردہ حالت میں پڑا ہوا ملا تھا۔ اس کا سر پکڑا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ سہری سانپ چودھری سعادت یا اس کے کسی آدمی کے ہاتھوں ہی موت کا شکار ہوا ہے۔ اس کی موت کے ساتھ ہی صرف ٹایاب ہی نہیں پورا گاؤں ایک بہت ہی اچھے اور قابل اعتماد مقامی سے محروم ہو گیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں پہلے سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا ہے ملک جی؟" ایک اور نوجوان نے پوچھا۔

"رات کو چھپ کر ان کھنڈرات کی عمرانی۔" ملک سکندر نے کہا۔ "تم لوگ کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لے لو اور ٹیلے کے چاروں طرف پھیل کر کھنڈرات کی عمرانی کرو۔ وہ لوگ رات کو اپنی پناہ گاہ سے محروم باہر نکلیں گے لیکن ایک بات یاد رکھنا، ہمارا مقصد انہیں مارنا نہیں ہے۔ وہ قانون کے مجرم ہیں لیکن ہم قانون کو ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کھنڈروں کی عمرانی کر کے ان کے ٹھکانے کا پتہ چلائیں اور اگر ممکن ہو تو

”میری نیت میں کوئی فٹور نہیں آیا ملک صاحب۔“ ٹیپو نے سکرارتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ خزانے کی ہوس ہی مجھے یہاں لے کر آئی تھی لیکن یہاں آکر جو کچھ دیکھا اس سے میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مس ٹایپ کو اس خزانے سے صرف اس حد تک دلچسپی ہے کہ وہ اسے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ آپ نے بھی اس کے ساتھ مل کر بہت سے منصوبے بنائے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو لانچ ہوتا تو اب تک اس خزانے کا بہت سا حصہ نکال چکے ہوتے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ خزانہ ایسے لوگوں کی نظروں میں نہ آسکے جو۔۔۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ سکندر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن خزانہ وہاں سے نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ جب تک وہ لوگ کنڈروں میں موجود ہیں اس وقت تک ہم بھی اس طرف کا رخ نہیں کر سکتے۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ خزانہ ایک دن میں نہیں نکالا جا سکتا۔ کئی دن لگ سکتے ہیں اور کئی آدمیوں کی ضرورت پڑے گی اور جب خزانہ وہاں سے نکالا جائے گا تو اس کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی اور اس خزانے کی حفاظت ممکن نہیں رہے گی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ ٹیپو کو اس کی تائید کرنی پڑی۔

”دوہے ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔“ سکندر نے کہا اور پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تم وہ خزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہو؟“

”یہ بھی مج سے ملک صاحب!“ ٹیپو نے سکرارتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ لوگ کنڈروں سے نکل جائیں تو تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔“ ملک سکندر نے کہا۔

”آپ ٹیپو کی کوئی خواہش پوری کر رہے ہیں ملک جی؟“ ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

”انسان کی خواہشیں تو بے شمار ہوتی ہیں لیکن ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ٹیپو نے بھی ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا ہے جو فی الحال پوری نہیں ہو سکتی۔ بہر حال میں نے وعدہ تو کر لیا ہے۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔

وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ روٹی برتن اٹھا کر لے گئی۔ ٹیپو اور سکندر کچھ دیر باتیں

”بیٹھک ہی میں بگڑا دو۔ میں اور ٹیپو وہیں کھانا کھائیں گے۔“ سکندر کہتے ہوئے دوبارہ بیٹھک میں آگیا۔

تقریباً دس منٹ بعد راجہ انہیں کھانا دے کر چلی گئی اور وہ دونوں کھانا کھانے لگے۔

”ملک صاحب۔“ ٹیپو لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ ان کنڈروں کے پیچھے واقعی کوئی خزانہ موجود ہے۔“

”اگر ہمیں خزانے کے بارے میں یقین نہ ہوتا تو تم یہاں کیوں آتے؟“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”میں نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کنڈروں کے پیچھے ایک جگہ واقعی خزانہ موجود ہے اور وہ چند ہیروں کے بارے میں تم سن کر آئے تھے اسی خزانے کا حصہ ہیں۔“

”میں سب کچھ سوچتے ہوئے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“ ٹیپو نے کہا۔

”چودھری سعادت اور اس کے ساتھی یا وہ کوئی بھی ہیں ان کنڈروں میں موجود ہیں۔ اگر وہ لوگ کسی طرح خزانے تک پہنچ گئے تو۔۔۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ ملک سکندر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس میں شبہ نہیں

کہ ان کنڈروں کے پیچھے اندر ہی اندر کئی خفیہ سرنگیں ہیں۔ وہ لوگ چونکہ کنڈروں کے نیچے کسی تہ خانے میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اندر ہی اندر کوئی راستہ بھی تلاش کر رہے ہوں اور میں ممکن ہے کوئی سرنگ انہیں خزانے والے تہ خانے تک بھی لے

جائے لیکن اس کے باوجود وہ خزانے تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ خزانے کی حفاظت کے لیے لاتعداد زہریلے ناگ موجود ہیں۔ وہ کسی کو خزانے کے قریب چھٹکنے بھی نہیں دیں گے۔“

”میری نظروں میں صورتحال پھر بھی ہمدوش رہتی ہے۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”سنرے ناگ کا حشر آپ نے دیکھ لیا۔ اس کا سر کسی پتھر سے چلا گیا ہے یا اسے گولی ماری گئی ہے۔“

خزانے کے محافظ زہریلے ناگوں کو بھی دور ہی سے گولیوں سے ہموں ڈالیں گے۔“

”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ ملک سکندر نے اسے گھورا۔

”میرا خیال ہے کہ خزانے کو وہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیا جائے۔“ ٹیپو نے کہا۔

”تمہاری نیت تو ٹھیک ہے؟“ ملک سکندر نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

حویلی کا چانک ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے بہت وقت چاہیے تھا۔ البتہ راستے کی معافی کر دی گئی تھی تاکہ آدھ و رفت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ہاشم نام کا ایک آدمی لاشیٰ لیے گیت کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ٹایاب گاڑی اندر لیتی چلی گئی۔ کپاؤڑ میں سے تمام جھانیاں وغیرہ صاف کر دی گئی تھیں۔ ٹایاب نے گاڑی برآمدے کے سامنے روک لی اور وہ سب بچے اتر آئے۔ ہاشم بھی وہاں آگیا تھا۔

”ہاشم۔ تمہیں اکیلے میں ڈر تو نہیں لگ رہا تھا؟“ ٹایاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اکیلا کب تھا چھوٹی بی بی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”بابا کمال دین میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں میں وقت گزر گیا۔“

”بابا کمال دین۔“ ٹایاب کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”یہ کون ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا ہے۔“

”جانتا تو میں بھی نہیں اسے۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”وہ ہمارے پنڈ کا ہے بھی نہیں۔ شام سے ذرا پہلے ادھر آیا تھا۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”کتا تھا؟ عمرکٹ کا رہنے والا ہوں۔ شاہ پور جا رہا ہوں۔ تھک کر یہاں میرے پاس بیٹھ گیا۔“

”عمرکٹ یہاں سے میں کوس پر ہے۔ کیا وہ پیدل آ رہا تھا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”اُہو بی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”چھوٹی بی بی گاؤں کے لوگ پیدل چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ پیلوں پیدل چلتے ہیں۔“

”کہاں ہے وہ؟“ ٹایاب نے پوچھا۔

”آپ کی گاڑی آتے دیکھ کر وہ چلا گیا تھا۔ کمر رہا تھا کہ اسے جلدی شاہ پور پہنچنا ہے۔“ ہاشم نے جواب دیا۔

”حیرت ہے۔“ قریب کھڑی ہوئی روٹی نے کہا۔ ”وہ شام سے یہاں بیٹھا تھا اور اب اسے شاہ پور پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی۔“

”اس نے یہی کہا تھا بی بی جی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔

”تم اسے روک لیتے۔ میں اسے گاڑی پر.....“ ٹایاب کہتے ہوئے رک گئی۔ ”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ گئی، وہ کون تھا؟ بہرحال، اندر کوئی بیچ وغیرہ جلائی ہے یا

کرتے رہے اور پھر سکندر بیٹھک سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ ٹایاب وغیرہ بھی کھانا کھا چکی تھیں اور ٹایاب تو پرانی حویلی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”اس وقت تم لوگ کمال جاؤ گے۔ رات بیس رہ جاؤ یا۔“ سکندر نے کہا۔

”میں سکندر بھائی۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”میں کونسا میلوں دور جانا ہے۔ پرانی حویلی چار قدم پر تو ہے اور پھر ہمارے پاس گاڑی بھی ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔“ سکندر نے کندھے اچکا دیے۔

ٹایاب بڑے ٹھک صاحب سے ملنے ان کے کمرے میں گئی تو وہ سو چکے تھے۔ وہ واپس پہنچی اور پھر تقریباً دس منٹ بعد وہ لوگ حویلی سے نکل کر گلی میں کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ راہبہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

گاؤں کے کتوں نے کچھ دور تک گاڑی کا پیچھا کیا، پھر باؤس ہو کر رک گئے۔ گاڑی گاؤں سے باہر نکل تو ہر طرف سناٹا تھا۔ روٹی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”گاؤں کے لوگ کیسے زندگی گزارتے ہیں۔“ وہ ٹایاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کوئی دلچسپی نہیں ہے یہاں۔ نہ کوئی سینما، نہ ریسٹورنٹ، نہ کوئی اور تفریح۔ سرشام سناٹا چھا جاتا ہے۔“

”ان کی کچھنوں میں مصروفیت ہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی تفریح ہے۔“ ٹایاب نے جواب دیا۔ ”ان کے پاس شہر والوں کی طرح فالٹو وقت نہیں ہوتا ہے سینما ہاؤسز اور ریسٹورانوں میں بیٹھ کر ضائع کریں۔ یہ اپنے حال میں خوش ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں اپنے کام کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی نہیں ہے۔ یہ لوگ سرشام ہی گھروں میں آجاتے ہیں اور کھانا کھا کر جلد سو جاتے ہیں لیکن ان کی صبح ان وقت شروع ہو جاتی ہے جب شہر والے گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں۔ ان کی محنت شہر والوں کی آسائشوں کا ذریعہ بنتی ہے۔“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ روٹی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

ٹایاب خاموشی سے ڈرائیو کر رہی۔ کچے راستے پر گاڑی بھگولے کھا رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ پرانی حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔

چاہیے تھا۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“ روہی نے کہا۔ ”لیکن کیا تمہارے خیال میں بچہ کے مرے کے بعد صورتحال میں کوئی نمایاں تبدیلی آسکتی ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”پہلے تو بچہ کسی نہ کسی روپ میں ہماری مدد کے لیے ہر جگہ پہنچ جایا کرتا تھا لیکن اب وہ نہیں رہا تو صورتحال میں تبدیلی ضرور آئے گی۔“

”لیکن ناگن ملکہ نے کسی اور کو ہماری حفاظت کے لیے بھیج دیا ہے۔“ روہی نے کہا۔

”کیا یہ بوڑھا ہماری حفاظت نہیں کرے گا۔“

”میں نے تو محض ایک خیال ظاہر کیا ہے۔“ ثانیاب نے کہا۔ ”اس بوڑھے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون ہے۔“

”تمہارے خیال میں بچہ کو کس نے مارا ہوگا۔“ روہی نے پوچھا۔

”گھنڈروں میں موجود لوگوں نے۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”اگر وہ سعادت اور اس کے ساتھی ہیں اور اگر سعادت کو بچہ کے مرے کا پتہ چل گیا ہے تو وہ کل کر سامنے آنے کی کوشش کرے گا کیونکہ بچہ ہی اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اس طرح ہمیں پہلے سے زیادہ حمتا رہنے کی ضرورت ہے۔“

”یہ بات تو تم ٹھیک کہتی ہو۔“ روہی نے کہا۔ ”لیکن کیا ان حالات میں ہمارا حویلی میں رہنا خطرناک نہیں ہوگا جبکہ یہاں ہماری حفاظت کا بھی کوئی بندوبست نہیں ہے۔ صرف نیچے کے پاس ہتھول ہے اور اس میں بھی زیادہ سے زیادہ چار پانچ گولیاں ہوں گی۔ اگر کسی نے حویلی پر حملہ کر دیا تو ہم اپنا دفاع نہیں کر سکیں گے۔“

”لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ حویلی اب بھی ہمارے لیے محفوظ ہے۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”سب لوگ جان چکے ہیں کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ چودھری سعادت اور اس کے ساتھیوں کو اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے ان میں سے کوئی بھی حویلی کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

”ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔“ روہی نے گہرا سانس لینے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی۔ تم لوگوں کو سونا ہے یا رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دو گی۔“ راہبہ نے

نہیں؟“

”میں نے شام ہوتے ہی بتایاں جلا دی تھیں چھوٹی بی بی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”اوپر بھی دو جگہ پر لیٹ جلا کر رکھ دیئے ہیں اور نیچے بھی۔ دو تین جگہوں پر لیٹ چل رہے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ثانیاب بولی۔ ”گاڑی میں رکھا رکھا ہوا ہے۔ نکال کر کھالو۔ کیونکہ بھابھی نے تمہارے لیے کھانا ہاندہ دیا تھا۔ ابھی گرم ہی ہوگا۔“

ہاشم گاڑی میں رکھا ہوا کھانا نکالنے لگا اور ثانیاب وغیرہ اس دروازے کی طرف بڑھ گئیں جہاں اوپر جانے والا زینہ تھا۔

اوپر والے برآمدے میں زینے کے قریب ہی ایک پیڑو میکس چل رہا تھا۔ دوسرا پیڑو میکس برآمدے کے آخری سرے پر تھا۔ برآمدے میں کچھ کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”وہ بوڑھا کون تھا ثانیاب؟“ روہی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون سا بوڑھا؟“ ثانیاب بولی۔

”وہی کمال دین۔ جس کے بارے میں ہاشم بتا رہا تھا اور تم کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔“

”ایسے ہی مجھے ایک خیال آگیا تھا۔“ ثانیاب نے جواب دیا۔ ”ایک بوڑھے نے میری گاڑی کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ تم اس کے بارے میں جان چکی ہو۔ وہ پراسرار بوڑھا ہر مشکل وقت پر ہمارے کام آیا ہے۔ پہلے تو میں اس کے بارے میں ابھین کا شکار رہی تھی کہ وہ کون ہے؟ پھر بعد میں آشکاف ہوا کہ وہ منبری ناگ بیٹھو تھا جو اس بوڑھے کے پاس میں ہماری مدد کو آجاتا تھا لیکن اب بچہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا کوئی اور ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا تعلق بھی اسی برادری سے ہو اور ناگن دیوی نے اسے حویلی کی حفاظت کے لیے یہاں بھیج دیا ہو ورنہ یہ سوچنا ہی حماقت ہے کہ جو شخص شام سے یہاں بیٹھا رہا تھا اسے اچانک شاہ پور جانے کی جلدی کیوں ہو گئی تھی۔ بقول ہاشم کے وہ میں گھوس کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا۔ ایسے علاقوں میں تو رات کے وقت کسی اکیلے آدمی کے لیے سڑکنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس بوڑھے کو تو رات بھر کے لیے یہاں رک جانا

ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نیند ہی نہیں آ رہی۔“ روہی نے جواب دیا۔ ”تمہیں نیند آ رہی ہے تو کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ باتیں کرتے رہو۔ میں تو سونے جا رہی ہوں۔“ راہبہ کہتے ہوئے اٹھ کر ایک کمرے میں چلی گئی۔

نیچو اور روہی پہلی رات کراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں سوئے تھے لیکن آدھی رات کو اس وحالے کی وجہ سے اٹھ کر اوپر آ گئے تھے۔ اس کے بعد سب کے لیے اوپر ہی کی منزل پر سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک کمرہ ٹایپ کے پاس تھا، دوسرے کمرے میں روہی اور راہبہ کے لیے بستر لگا دیے گئے تھے اور ایک کمرہ نیچو کو دے دیا گیا تھا۔

راہبہ کمرے میں چلی گئی لیکن روہی اور ٹایپ کمریوں پر بیٹھی رہیں۔ نیچو عراب کی منڈیر پر بیٹھا سرگٹ کاٹھ لگاتے ہوئے تاریکی میں گھوم رہا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ روہی کو بھی ہمتائیاں آنے لگیں۔ وہ بھی اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ ٹایپ ابھی اٹھ گئی۔ البتہ نیچو عراب کی منڈیر پر بیٹھا تاریکی میں گھومتا رہا لیکن بالا خرہ وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فصل نمبر ۲

وہ آٹھ آدھی تھے اور سب کے پاس ڈبل بیل بندوقیں تھیں۔ وہ دو دو کی ٹولیاں میں کھنڈروں کے چاروں طرف پھیل گئے۔ ملک سکندر نے انہیں واضح طور پر یہ ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ کھنڈروں میں کسی قسم کی نقل و حرکت دیکھیں تو بہت مختار انداز میں قریب جا کر ان ٹولوں کے گھیرنے کی کوشش کریں۔ ان کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان میں سے کسی کو زندہ پکڑا جائے۔

عرفان اور سلیمان ٹیلے کے مشرق کی طرف تھے۔ ان دونوں کے پاس بھی ڈبل بیل بندوقیں تھیں۔ عرفان کے پاس تاریخ بھی تھی لیکن اس نے تاریخ روشن نہیں کی تھی۔ وہ تاریکی میں آہستہ آہستہ ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ ٹیلے پر اس طرف کثیر تعداد میں بھول کی جمائیاں تھیں۔ انہیں چلنے میں دشواری تو پیش آ رہی تھی لیکن ان جمائیاں کا انہیں یہ

فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ایک شگفتہ کھنڈر کے پاس رک گئے۔ یہ الگ تھلک کھنڈر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ غالباً تین چار کروں کا مکان رہا ہوگا۔ صرف ایک کمرہ ایسا تھا جس کی تین دیواریں اب بھی کھڑی تھیں۔ باقی تمام کمروں کی دیواریں لمبے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔

وہ دونوں اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ گئے۔ وقت آہستہ آہستہ ریک رہا تھا۔ وہ انہیں میں بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مبادا ان کی آواز کہیں سن نہ لی جائے۔ وہ تاریکی میں بیٹھے کھنڈروں کو گھورتے رہے۔

اس وقت شاید رات کا ایک بج رہا تھا۔ سلیمان کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ بار بار اوگھ تھا لیکن عرفان پوری طرح بیدار تھا اور حلق و دھند بھٹا ہوا تھا۔ اس وقت سلیمان اوگھ رہا تھا۔ عرفان نے اسے جگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دغنا! وہ ایک آہستہ سن کر چونک گیا۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹا پتھر کہیں سے لڑھکا ہو۔ عرفان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورتے گا لیکن کھنڈروں کی شگفتہ دیواروں کے سوا اسے کچھ دیکھنا نہیں دے رہا تھا۔

چند منٹ گزر گئے۔ پتھر لڑھکنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز پہلی جگہ سے کچھ فاصلے پر سنائی دی تھی۔ عرفان اس طرف گھومنے لگا اور اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک متحرک ہولہ دکھائی دیا تھا۔

عرفان نے بڑی آستینگی سے سلیمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلا دیا۔

”ٹھیک... کیا ہو!... کون ہے؟“ سلیمان گڑبڑا گیا۔

”آہستہ بولو۔“ عرفان نے سرگوشی کی۔ ”ادھر کھنڈروں میں کوئی موجود ہے۔“

سلیمان ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بندوق کو دونوں ہاتھوں میں قلم لیا اور تاریکی میں گھومنے لگا۔

عرفان بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہولہ تاریکی میں کہیں غائب ہو گیا تھا لیکن چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ دکھائی دیا۔

”وہ دیکھو اس طرف۔“ عرفان نے اشارہ کیا۔

اب سلیمان نے بھی وہ انسانی ہولہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا اور مختار انداز میں

اور ہماری طرف گھوم جاؤ۔“

عرفان اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ دد آوی تھے۔ اس نے بدوقت پیمیک دی۔ اس کی تھید کرتے ہوئے سلیمان نے بھی بدوقت پیمیک دی اور وہ دونوں گھوم گئے۔

وہ دد آوی تھے اور دونوں کے پاس آٹومک رائفیں تھیں۔

”ہمیں اسی وقت پہ چل گیا تھا جب تم لوگ نیلے کی طرف آئے تھے۔“ ان میں سے ایک آوی نے کہا۔ ”چتر لٹکا کر جان بوجھ کر آواز پیدا کی مگر حقانی تم لوگوں کو متوجہ کیا جاسکے۔ تم کو آٹھ آوی ہوں۔ ابھی تو تم نے تم دونوں کو قابو کیا ہے۔ آہستہ آہستہ تمہارے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفت میں لے لیا جائے گا۔ اس طرف چلو۔ تم لوگوں کو ہمارے خفیہ فضا کے کی تلاش حقانی؟ ہم پہلے تمہیں وہیں پہنچائیں گے اور بعد میں تمہارے باقی ساتھیوں کو بھی وہیں لے جایا جائے گا۔ چلو اس طرف۔“

بات کرنے والے شخص کے دوسرے ساتھی نے ان کی بدوقتیں اٹھالی تھیں۔ عرفان نے محسوس کیا کہ وہ شخص فوری طور پر اپنی رائفل استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسرا آوی ان پر رائفل آتے ہوئے تھا۔ اس آوی نے رائفل سے انہیں ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ عرفان نے پلا قدم اٹھائے ہی بڑی تیزی سے گھوم کر لات چلا دی۔

اس کے پیر کی ٹوکھ رائفل پر لگی۔ وہ شخص گزریا گیا۔ اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہی رائفل کا ٹرائیڈر دب گیا تھا۔ دیران کھنڈر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ رائفل کا رخ اس وقت اس شخص کے دوسرے ساتھی کی طرف تھا۔ گولی اس کے سر میں لگی اور کھوپڑی کے پرچھے اڑائی ہوئی نکل گئی۔ اس کے منہ سے صرف ایک چیخ نکل گئی۔ وہ زمین پر گر کر ترچے لگا۔

رائفل بردار بری طرح بدخواس ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھ سکتا، سلیمان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اس شخص سے رائفل چیمنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی کشش میں ایک اور فائر ہو گیا۔ اس مرتبہ گولی سلیمان کے بازو میں لگی اور گوشت چربی ہوئی نکل گئی۔ سلیمان کے منہ سے بھی ایک خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔

رائفل بردار نے ایک زوردار ہٹکا دے کر اپنے آپ کو سلیمان سے الگ کیا لیکن اسی وقت عرفان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ چیمنا جیٹھی میں رائفل ان دونوں کے ہاتھ سے

کھنڈروں میں ایک طرف چل رہا تھا اور پھر وہ کھنڈروں میں غائب ہو گیا۔ ”کیا خیال ہے۔ اس کا پچھا کیا جائے۔“ سلیمان نے سرگوشی کی۔

”ہاں ہاں۔ اسی لیے تو ہم یہاں آئے ہیں۔“ سلیمان نے کہا۔

ان دونوں نے اپنی اپنی بدوقتیں سنبھال لیں اور دیکھتے ہوئے ان کھنڈروں کی طرف بڑھنے لگے جہاں انہوں نے اس انسانی ہیروے کو دیکھا تھا۔

وہ اس وقت کھلی جگہ پر تھے۔ کمرے ہو کر چٹنا مناسب نہیں تھا، اس لیے ریک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ سو گز کا فاصلہ انہوں نے تقریباً دس منٹ میں طے کیا۔

اب وہ کھنڈروں میں پہنچ گئے تھے۔ ادھر ادھر انہیں شکستہ دیواروں کی آڑ حاصل تھی۔ اسی لیے وہ اٹھ کمرے ہو گئے اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔

”اس آوی کو میں نے اس جگہ پر دیکھا تھا۔“ عرفان نے کہا۔

”وہ یہاں بیٹھا ہمارا انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔“ سلیمان بولا۔ ”اس طرف دیکھتے ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ رہتا۔ تم اس طرف نظر رکھو اور میں اس طرف دیکھتا ہوں۔“

وہ دونوں بدوقتیں سنبھالے چلتے رہے۔ ایک کھنڈر سے نکل کر وہ دوسرے کھنڈر میں آگئے لیکن انہیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔

”کہاں غائب ہو گیا۔“ سلیمان بڑبڑایا۔

”میں کہیں ہوگا۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں۔“ عرفان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ابھی انہوں نے وہی قدم اٹھائے تھے کہ بائیں طرف سے کسی پتھر کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں چوک گئے۔ چند سینکڑ تک اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ محتاط انداز میں اس طرف بڑھنے لگے جس طرف سے پتھر ٹوٹنے کی آواز سنائی دی تھی۔ ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ عقب میں ایک فراغت سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ دونوں کی کھوپڑیاں اڑ جائیں گی۔“

”تم لوگ کون ہو۔ ہماری کھوپڑیاں کیوں اڑاؤ گے؟“ عرفان نے کہا۔ اس کی آواز میں خوف کا ہلکا سا اثر تھا۔

”ہم وہ ہیں جن کی جنس تلاش ہے۔“ وہی آواز سنائی دی۔ ”اپنی بدوقتیں پیمیک دو

لاش پر والی تو خادم علی الجمل پڑا۔

”یہ تو واؤڈ ہے۔ حسن آباد والے ہاجی فرید کا بیٹا۔“

”دوسرا کون تھا؟“ فقیر حسین نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔ ہم اندھیرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے۔“ سلیمان نے جواب

دیا۔

”خادم علی۔“ فقیر حسین بولا۔ ”ان دونوں کا خون بہہ رہا ہے۔ تم انہیں لے کر گاؤں چلے جاؤ اور ملک مئی کو اس لاش کے بارے میں بھی بتا دو۔ وہ مناسب سمجھیں گے تو ابھی کسی کو تھانے بھیج دیں گے ورنہ لاش صبح تک یہاں پڑی رہے گی۔“

”ابھی پولیس کو اطلاع دے بھی دیں تو لاش ویسے بھی صبح تک یہیں پڑی رہے گی۔ بہرحال میں انہیں لے کر گاؤں جا رہا ہوں۔“ خادم علی نے جواب دیا اور پھر وہ ان دونوں کو لے کر تیزی سے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان کے جانے کے بعد فقیر حسین اور اس کے ساتھی محوم پھر کر واؤڈ کے دوسرے ساتھی یا ان کے ٹھکانے کو تلاش کرنے لگے۔ ان سب کے پاس ٹارچس تھیں جو انہوں نے روشن کر رکھی تھیں۔

تقریباً چالیس منٹ بعد وہ لوگ کنڈروں میں محوم پھر کر دوبارہ اس جگہ پر آئے تو واؤڈ کی لاش غائب تھی۔

”لاش کہاں گئی؟“ فقیر حسین ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہیں پڑی تھی۔۔۔۔۔“ ادھر دھن نے کا۔ ”یہ دیکھو۔ زمین پر خون پڑا ہوا ہے۔“

”یہ تو ہو نہیں سکتا کہ لاش اٹھ کر کہیں چلی گئی ہو۔“ فقیر حسین نے کہا۔ ”لاش غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ ان کا خفیہ ٹھکانہ بھی یہیں کہیں ہے۔ ہم لوگ جیسے ہی یہاں سے ہٹے، وہ لوگ لاش اٹھا کر غائب ہو گئے۔ تلاش کرو۔ لاش کے سر سے پٹنے والے خون سے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔“

وہ لوگ ٹارچوں کی روشنی میں ایک باہر پھر قرب و جوار کا علاقہ چیک کرنے لگے لیکن کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔ انہیں کسی جگہ خون بھی نظر نہیں آیا تھا۔

نکل کر دور جا گری۔ اس شخص نے عرفان کی ناک پر سر سے زوردار کھمار دی۔ عرفان کا دماغ جھجٹا اٹھا۔ اس کے ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس شخص نے موقع پا کر اپنے آپ کو عرفان کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف کو بھاگ نکلا۔

اسی وقت چاروں طرف سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یہ ڈبل ہٹل بندوق کے فائر کی آوازیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی عرفان کو اپنے ساتھیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے ٹام پکارتے ہوئے کنڈروں میں دوڑ رہے تھے۔

سلیمان نے چچ چچ کر انہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے جبکہ کر ایک رائفل اٹھا لی اور وہ تین ہوائی فائر کر دیے۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ تکلیف برداشت کیے ہوئے تھا۔ عرفان زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ سر کی ٹکر سے اس کا دماغ بری طرح جھجٹا اٹھا تھا۔

سلیمان اگرچہ خود زخمی تھا لیکن وہ عرفان کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عرفان بار بار سر جھٹک رہا تھا۔

کنڈروں میں چاروں طرف سے بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر فقیر حسین کی آواز سنائی دی۔

”عرفان، سلیمان، حامد علی۔۔۔۔۔ تم لوگ کہاں ہو؟“

”ہم یہاں ہیں فقیر حسین۔“ سلیمان نے چچ کر جواب دیا اور ٹارچ جلا کر اس کی روشنی سے اپنی جگہ کی نشاندہی کرنے لگا۔

تقریباً تین منٹ بعد وہ سب لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ٹارچس تھیں اور سب ہی نے بندوقیں بھی سنبھال رکھی تھیں۔

”کیا ہوا؟ تم دونوں زخمی ہو۔ وہ لوگ کون تھے؟“ فقیر حسین نے بار بار دہرائی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک تو یہ پڑا ہے اور دوسرا بھاگ گیا۔“ سلیمان نے چہرہ قدم دور پڑی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

ان میں سے کسی نے ابھی تک لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ فقیر حسین نے ٹارچ کی روشنی

پر ایک غلا نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑا سا پتھر اس غلا کے قریب پڑا ہوا تھا۔ رات کو تلاشی کے دوران انہوں نے یہ غلا نہیں دیکھا تھا۔
 وہ آدمی بندوقین لے کر اس غلا میں اتر گئے اور پھر انہوں نے چیخ کر دوسروں کو بھی بلا لیا۔

یہ ایک لمبا چوڑا تہہ خاند تھا جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کچھ لوگ بڑی جگت میں یہاں سے بھاگے ہیں۔ فرش پر چار چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک ہوائی چیل پڑی ہوئی تھی اور بند خرداک کے کئی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف پتھر رکھ کر چولہا بنایا گیا تھا جس میں جلی ہوئی کڑیاں اور رکھ بج تھی اور کمرے کے ایک کونے میں ایک لاش بھی پڑی ہوئی تھی۔
 وہ داؤد کی لاش تھی۔

تہہ خرداک 29

تہہ خاند خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس میں کسی اور طرف نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور حیرت کی بات تھی کہ ہر طرف سے بند ہونے کا باوجود یہاں ٹھنکن کا معمولی سا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ چولے میں جلی ہوئی کڑیوں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہاں آگ بھی جلائی جاتی تھی۔ دھواں بھی ہوتا ہو گا لیکن دھواں بھی پراسرار طور پر کہیں غائب ہو جاتا تھا۔

ملک سکندر، ٹایپ کے ساتھ اس کنڈروں کے بیچے کئی تہہ خاندوں میں گھوم چکا تھا اور اسے کسی تہہ خاندے میں ٹھنکن کا احساس نہیں ہوا تھا بلکہ یہ احساس ہوتا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرف سے تازہ ہوا اندر آ رہی ہے اور اس تہہ خاندے میں بھی یہی صورتحال تھی۔ کسی پراسرار راستے سے یہاں تازہ ہوا کی آمد و رفت ہو رہی تھی۔

اس تہہ خاندے میں موجود بعض چیزوں سے یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ یہاں چودھری سعادت بھی رہ رہا تھا۔ ایک مخصوص پرائے کے مگریت پورے گاؤں میں وہی پیتا تھا اور اس تہہ خاندے میں اس پرائے کے کئی خالی پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔

”اب اس لاش کا کیا کرنا ہے ملک جی؟“ فقیر حسین نے لاش کی طرف اشارہ کرتے

”وہ ہیں کہیں آس پاس ہی۔“ فقیر حسین بولا۔ ”آپ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی یہاں رک کر گھرائی کریں۔ ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں تاکہ ملک جی کو اس نئی صورتحال سے آگاہ کر سکیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر نذیر اور امفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں یہیں رک جاؤ۔ کسی ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ جانا جہاں وہ لوگ ہمیں نہ دیکھ سکیں۔“

”ٹھیک ہے بھائی فقیر حسین۔“ نذیر نے جواب دیا۔
 وہ پانچوں اس جگہ سے باہر آگئے۔ نذیر اور امفر چند قدم چلنے کے بعد رک گئے اور فقیر حسین اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تیز حیز قدم اٹھاتا ہوا نیلے سے اترنے لگا۔
 وہ لوگ آدھے گھنٹے میں گاؤں پہنچ گئے۔ خادم علی، عرفان اور سلیمان ملک سکندر کی حویلی کی بیشک میں تھے۔ ڈاکٹر احمد بھی خانے ملک سکندر نے بلوا لیا تھا۔ وہ اس وقت سلیمان کے بازو کی ڈریسنگ کر رہا تھا۔

”ملک جی۔“ فقیر حسین نے کہا۔ ”آپ نے پولیس کو اطلاع دینے کے لیے شاہ پور کوئی بندہ بھیجا ہے یا نہیں؟“

”ابھی نہیں۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”تین بجتے والے ہیں۔ اس وقت کون جائے گا۔ دن چڑھنے دو، میں خود چلا جاؤں گا مگر تم لوگ واپس کیوں آگئے؟“
 ”وہاں تو کمانی ہی دوسری ہو گئی ہے ملک جی۔ داؤد کی لاش وہاں سے غائب ہو گئی ہے۔“ فقیر حسین نے کہا۔

”کیا؟“ ملک سکندر اچھل پڑا۔
 فقیر حسین اسے تفصیل سے سب کچھ بتاتے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نذیر اور امفر کو وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر میں چلنے ہیں۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔
 وہ لوگ بیٹھے صورتحال پر تبصرہ کرتے رہے اور پھر پانچ بجے کے قریب وہ سب لوگ گاؤں سے نکل کمرے ہوئے۔ اس وقت دن کی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔
 جب وہ کنڈروں میں پہنچے تو انہیں ایک نئی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ نذیر اور امفر ایک جگہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور ان سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر ایک جگہ فرش

ہوئے کہا۔

”ہم نے لاش کا کیا کرنا ہے۔“ ملک سکندر نے جواب دیا۔ ”مگرٹ کے ان خالی پیکٹوں سے یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ چودھری سعادت یہاں موجود تھا۔ وہ ہمارے آدمیوں کو بے ہوش کر کے یہاں سے بھاگ گئے ہیں اور تمہ خاٹے کا راستہ جان بوجھ کر کھلا چھوڑ گئے ہیں تاکہ ہم لاش دریافت کر لیں۔ اب ان کے یہاں واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہمیں یہی کرنا ہوگا کہ دو تین آدمی یہاں رہیں اور باقی گاؤں چلے چلیں۔ میں شاہ پور تھانے جا کر اطلاع دے دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک جی۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ فقیر حسین نے کہا۔

تین آدمیوں کو وہاں چھوڑ دیا گیا اور باقی ملک سکندر کے ساتھ گاؤں آگئے۔ اس وقت دھوپ نکل چکی تھی۔ ملک سکندر نے گھر پہنچ کر ناشتہ کیا اور کار پر شاہ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔



نایاب رات کو دیر سے سوئی تھی اس لیے صبح دیر تک بستر پر پڑی رہی۔ روہلی بھی اپنے کمرے میں ابھی تک سو رہی تھی۔ البتہ راجہ صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔ نایاب نے آنکھیں کھول کر کڑواہٹ دہلی تو راجہ چائے کا کپ لے کرے میں داخل ہو رہی تھی۔

”میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اگر اب بھی تم نہ انھیں تو پانی کا پورا جگہ تمہارے اوپر انڈیل دوں گی۔“ راجہ نے چائے کا کپ بیڈ کے قریب چھوٹی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کو تم تو جلدی سو گئی تھیں لیکن صبح دیر تک جاگتے رہے تھے۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ظاہر ہے دیر سے سوئیں گے تو دیر سے ہی جاگیں گے۔“ اس نے اٹھ کر گلاس میں پانی اٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں جا کر ایک دو گلاس کیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”راجہ چائے پیئیں لے آؤ۔ باہر تازہ ہوا اچھی لگ رہی ہے۔“

راجہ چائے کا کپ اٹھا کر باہر لے آئی۔ اس نے کپ نایاب کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد روہلی بھی باہر آگئی۔ راجہ اس کے لیے بھی

چائے لے آئی۔

نوجوان کے قریب انہوں نے ناشتہ بھی برآمدے ہی میں بیٹھ کر کیا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی یہی تھیں کہ گاؤں سے شرکی طرف جانے والی سڑک پر ملک سکندر کی گاڑی دکھائی دی۔ وہ گاڑی اس کے راستے کے موڑ پر رک گئی جو اس حویلی کی طرف آتا تھا۔ ایک آدمی نیچے اترا اور گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ نایاب گہری نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھ رہی تھی جو گاڑی سے اترنے کے بعد حویلی کی طرف آ رہا تھا۔

”یہ تو قیوم ہے۔“ قریب بیٹھی ہوئی راجہ نے کہا اور اٹھ کر محراب کی مندرجہ کے قریب کھڑی ہو گئی۔

نایاب بھی اپنی جگہ پر بیٹھی اس طرف دیکھتی رہی۔ قیوم تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔ تقریباً باج سڑک کا فاصلہ طے کرنے میں اسے بارہ تیرہ منٹ لگ گئے۔ نیچے پر پہنچ کر وہ درختوں کی آڑ میں ہو کر نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔ مزید تین منٹ مگر گزرتے اور پھر وہ بیڑھیاں چڑھ کر سانسے آ گیا۔

”کیا بات ہے قیوم؟“ راجہ بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ گاؤں میں خیریت تو ہے؟“

”گاؤں میں تو خیریت ہے مگر کھنڈروں میں گزشتہ رات سے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔“ قیوم نے جواب دیا۔

”کیسی گڑبڑ؟“ اس مرتبہ نایاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کو معلوم ہے چھوٹی ٹی بی۔“ قیوم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کل رات کھنڈروں میں پھرے کا پروگرام تھا۔ آٹھ آدمی وہاں پہرہ دیتے تھے۔ ان میں سلیمان اور عرفان بھی تھے۔ ان دونوں کا ان لوگوں سے سامنا ہو گیا جن کی ہمیں تلاش تھی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”ملک جی تھانے گئے ہیں اس لاش کے بارے میں اطلاع دیئے۔“

”وہ لاش کس کی ہے؟ کون تھا وہ؟“ نایاب نے پوچھا۔

”حسن آباد کے ماگھی فرید کا بیٹا داؤد۔“ قیوم نے جواب دیا۔ ”وہ شروع ہی سے آوارہ تھا جی! اپنے ہی گاؤں میں کئی مرتبہ چوریاں کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ گاؤں والے

والے راستے سے کھنڈروں والے نیلے کی طرف گئی ہے۔ ٹایاب بھی حویلی سے نکل کر کار میں بیٹھ گئی۔ روٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔

تقریباً دس منٹ میں وہ نیلے کے پاس پہنچ گئی اور اپنی کار پولیس کی جپ کے پیچھے روک لی۔ چند پولیس والے جپ اور ملک سکندر کی کار سے اتر رہے تھے۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج سب انسپکٹر اشرف تھا، وہ ٹایاب کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

”ٹایاب بی بی۔ کتا ہے شیطان ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ گیا ہے۔“ سب انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بھی شیطان کی خال ہوں۔“ ٹایاب نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے نیلے پر چڑھ گئے۔ گاؤں کے وہ تینوں آدمی جنہیں کھنڈرات کی گھرائی کے لیے چھوڑا گیا تھا، ایک شگفتہ دیوار کے سائے میں کھڑے تھے۔ ان لوگوں کے قریب پہنچنے پر وہ ان سب کو اس خفیہ تہ خانے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر اشرف نے سرسری سے انداز میں صورتحال کا جائزہ لیا اور پولیس والوں کو مختلف ہدایات دینے لگا۔ تہ خانے سے باہر آکر ایک شگفتہ دیوار کے سائے میں بیٹھ کر اس نے رپورٹ تیار کی۔ دو تین آدمیوں کے بیانات لیے۔ ان کے دستخط کروائے اور سپاہیوں کو لاش اٹھانے کا حکم دیا۔

لاش تہ خانے سے نکال کر پولیس کی جپ میں ڈال دی گئی اور جپ گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر روانہ ہو گئی۔

پولیس والے جا چکے تھے۔ ٹایاب اور سکندر وہیں کھڑے رہ گئے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے دوسرے آدمی بھی تھے۔

”اے فقیر حسین۔“ سکندر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ گاؤں چلے جاؤ۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ ہم تھوڑی دیر بعد آجائیں گے۔“ اس نے گاڑی کی چابی فقیر حسین کی طرف بڑھا دی۔

ٹایاب نے روٹی کو بھی ان کے ساتھ بھیج دیا۔ اب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ کھنڈروں میں خزانے والا راستہ وہاں سے تقریباً سو گز دور تھا۔ کھنڈروں کے نیچے لاتعداد سرنگیں اور راستے تھے اور ٹایاب کو شروع ہی سے

بوڑھے ہاتھی فرید کا لحاظ کر کے اسے معاف کرتے رہے۔ آخری مرتبہ اس نے چودھری کی ہمیں چرا لی تھی لیکن پکڑا گیا تھا۔ چودھری تو اسے پولیس کے حوالے کرنے پر حلا ہوا تھا مگر اچھی فرید کی منت ساجت اور دوسرے بزرگوں کے کہنے پر چودھری نے اسے پولیس کے حوالے تو نہیں کیا البتہ گاؤں سے نکال دیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کمال پور میں رہا، پھر پتہ نہیں کب چودھری سعادت کے ہتھے چڑھ گیا اور بلا آخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“

”برے لوگوں کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”کچھ پتہ چلا کہ سعادت اور اس کے ساتھی مکمل گئے ہیں؟“

”نہیں چھوٹی بی بی۔“ قیوم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم یہاں رہو گے یا گاؤں واپس جاؤ گے۔“ ٹایاب نے پوچھا۔

”میں تو آپ کو صرف یہی بتانے آیا تھا۔ اگر کوئی کام ہو تو میں رک جاؤں۔“ قیوم

بولا۔

”نہیں، یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ میں بھی گاؤں جا رہی ہوں۔ تم بھی ساتھ ہی چلو۔“ ٹایاب کہتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلی۔ راجہ اور روٹی بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔

”میں بھی چلتا ہوں۔“ نیچو بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے آپ اس راستے پر چھوڑ دیں۔ ذرا شاہ پور جانا چاہتا ہوں۔“

وہ سب کار میں لد گئے۔ ٹایاب نے کار حویلی سے نکال کر سڑک والے راستے پر ڈال دی۔ دو تین منٹ بعد اس نے کار گاؤں والی سڑک پر روک لی۔ نیچو وہیں اتر گیا۔ اسی وقت گاؤں کی طرف سے ایک موٹر سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ نیچو نے اشارے سے اسے روک لیا اور اس کے ساتھ شاہ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹایاب وغیرہ کو گاؤں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ملک صاحب کی حویلی میں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ کچھ رسہ سے ملک صاحب کی حویلی ہی گاؤں والوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے کسی نے بتایا کہ پولیس کی جپ اور ملک سکندر کی کار گاؤں کے باہر

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔

وہ تقریباً آٹھ گھنٹے تک اس تہ خانے میں گھومتے رہے۔ تہ خانے میں مختلف چیزوں کو دیکھ کر یہاں چودھری سعادت کی موجودگی ثابت ہو گئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں سے وہ کہاں گیا ہو گا؟

وہ لوگ تہ خانے سے باہر آگئے۔ چپکتی ہوئی دھوپ سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ تہ خانے میں انہیں گرمی کا احساس تک نہیں ہوا تھا لیکن باہر دھوپ کی تپش سے ان کے جسم پینے میں تر ہونے لگے۔ وہ کھنڈروں میں گھومتے ہوئے اس جگہ آگئے جہاں خزانے والے تہ خانے کا راستہ تھا۔ وہاں رک کر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں بھی وہی سوچ رہی ہوں سکندر بھائی جو آپ کے ذہن میں ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”سل ہٹا کر راستہ کھولے۔ ہم اندر چلیں گے۔“

سل کے اوپر اینٹیں اور مٹی و نیو بکھری ہوئی تھی۔ ویسے انہیں حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ اینٹیں سل پر کیسے گرمی تھیں۔ سکندر اینٹیں اٹھا کر ایک طرف پھینکنے لگا اور ٹایاب اینٹوں کے ایک ڈھیر پر کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

اس وقت دوپہر کا ایک بجنا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ تیز اور چپکتی ہوئی دھوپ میں ہر طرف آگ کی لہریں سی افشتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ نیلے سے دور کھیتوں میں بھی کسی انسان کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹایاب چاروں طرف دیکھتی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ سکندر کی آواز سن کر مڑی۔ سکندر سل ہٹا چکا تھا۔ ٹایاب اینٹوں کے ڈھیر سے اتر کر اس کے قریب آئی۔

پہلے ٹایاب تہ خانے میں اتری، پھر سکندر نیچے آگیا اور بھاری سل کو گھسیٹ کر تہ خانے کے دبائے پر رکھ دیا۔

”ہمارے پاس کوئی نارنج تو ہے نہیں۔ راستہ کیسے تلاش کریں گے۔“ ٹایاب بولی۔

”میرے پاس ماہس ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”وہ چند لمبے تاریکی میں کھڑے رہے۔ پھر سکندر نے جیب سے ماہس نکال کر ایک تلی

یہ اندیشہ تھا کہ وہ لوگ اندر ہی اندر کسی طرح خزانے والے تہ خانے تک نہ پہنچ جائیں اور اب پولیس بھی ان کھنڈروں تک پہنچ گئی تھی اور اگر پولیس کو کسی طرح خزانے کی ہینک مل گئی تو خزانہ محفوظ نہیں رہے گا۔

وہ دونوں تقریباً پندرہ منٹ تک وہاں کھڑے رہے، پھر اس تہ خانے میں اتر گئے۔ ملک سکندر کے پاس ظاہر ہے اس وقت نارنج نہیں تھی لیکن انہیں تہ خانے میں ایک طرف رکھی ہوئی لائٹیں مل گئیں۔ اس کے قریب ہی ماہس بھی پڑی تھی۔ ملک سکندر نے لائٹیں روشن کر لی اور وہ دونوں گھوم پھر کر تہ خانے کا جائزہ لینے لگے۔ ٹایاب دیواروں کو ٹھوک بھا کر دیکھ رہی تھی۔

”تم جو سوچ رہی ہو، ایسا نہیں ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”وہ لوگ کئی دن اس تہ خانے میں رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہاں سے کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“

”جیسے بھی اندیشہ تھا کہ وہ لوگ اندر ہی اندر خزانے تک نہ پہنچ جائیں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”اب پولیس یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اگر انہیں خزانے کی ہینک مل گئی تو یہاں پہرہ بٹھا دیا جائے گا۔“

”پولیس خزانے کی باتوں کو افواہ ہی سمجھے گی۔“ ملک سکندر نے کہا۔ ”لوگ خزانے کی تلاش میں آئے دن یہاں آتے رہتے ہیں۔ پولیس والوں کو بھی سب معلوم ہے۔ اس لیے وہ اس طرف دھیان نہیں دیتے۔ اس وقت تو معاملہ مختلف ہے۔ بات خزانے کی تلاش کی نہیں، چودھری سعادت کی ہے۔ وہ پولیس کو مطلوب مجرم ہے جو یہاں چھپا ہوا تھا۔ پولیس کو اب صرف سعادت اور اس کے ساتھیوں کی تلاش ہے۔ پولیس اب دوبارہ یہاں نہیں آئے گی۔“

”لیکن اب ہمیں خزانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا بندوبست کیا جائے۔ یہ خزانہ فوری طور پر یہاں سے کسی اور جگہ منتقل بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔“ ٹایاب نے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ سکندر بولا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ خزانہ یہاں سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اسے کسی اور جگہ منتقل کرنا خطرناک ہو گا۔“

”ناگن ملکہ“ ٹایاب مورٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہمیں بچو کی موت کا افسوس ہے۔“

”ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہوتا ہے۔“ ایک سرگوشی ٹایاب کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”لیکن بچو کو جس طرح بے رحمی اور بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس کا مجھے دکھ ہے۔ انسان سدا سے سانپوں کا دشمن رہا ہے لیکن ہر سانپ انسانوں کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہم سانپوں کا زہر انسان کو زندگی بھی دیتا ہے۔ ہمارا زہر انسان کو کئی خطرناک اور ملکیت پیاروں سے نجات دلا کر انہیں زندگی کو نوید دیتا ہے۔ کوئی سانپ بلاوجہ کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاتا اور ہم احسان فراموش بھی نہیں ہیں۔ تم نے ایک موقع پر بچو کی جان بچائی تھی۔ ہماری پوری نسل تمہاری احسان مند ہے۔ دنیا کا کوئی سانپ تمہیں اور تمہارے دوستوں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”مجھے افسوس ہے ناگن ملکہ۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”بچو کو موت کے گھاٹ اتارنے والا خود انسان کا بھی بدترین دشمن ہے۔ وہ اب تک کئی بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور اب اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاکا بھر رہا ہے۔ اسے کیسے پناہ نہیں مل رہی۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد وہ اپنے بدترین انجام کو پہنچ جائے گا۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ ناگن ملکہ کی سرگوشی ٹایاب کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، وہ بھی اب اکیلا نہیں ہے۔ ہنومان کے ہمیں میں وہ راکشش اس کا ساتھ دے رہا ہے جو صدیوں سے ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ راکشش اس کا ساتھ نہ دیتا تو تمہارا دشمن اور ہمارے بچو کا قاتل ان کھڑوروں سے زندہ واپس نہیں جاسکتا تھا لیکن تمہیں اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بچو نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچاتا رہے گا۔ وہ جب تک زندہ رہا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن اب وہ نہیں رہا۔ تمہاری حفاظت کے لیے میرے پاس ان زہریلے ناگوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جو بچو کے پاس تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بروقت تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اب تمہیں پہلے سے زیادہ

جلائی اور اس کی زرد روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ٹایاب کو اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چلے گا۔

وہ سیدھی سرنگ تھی۔ تیلی بجھ جانے کے بعد بھی کچھ دور تک چلتے رہے۔ سکندر نے ایک اور تیلی جلائی اور چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک اور سرنگ میں مڑ گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ کورا ان کے سامنے آگیا۔ کورا چمن پھیلائے ان کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سکندر کی اگلیوں میں دلی ہوئی تیلی ختم ہو رہی تھی۔ اس نے دوسری تیلی جلائی۔

ٹایاب اس کورے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی کورا تھا جو سترے ناگ کی لاش کو منہ میں دبا کر لایا تھا۔ اس نے ٹایاب کی طرف دیکھا اور چمن کو زمین پر مارنے لگا۔

”ہمیں ناگن ملکہ کے پاس لے چلو۔“ ٹایاب نے کورے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کورا ایک طرف ریٹکنے لگا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلے گئے۔ سکندر نے ختم ہوئی ہوئی تیلی پینٹک دی اور اس کے بعد انہیں تیلی جلائے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سیاہ کورے کے ریٹکنے سے سرسراہٹ کی ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی اور وہ اس آواز کے پیچھے پیچھے چلے رہے۔

مختلف سرگوشیوں میں گھومتے ہوئے تقریباً دس منٹ بعد وہ ایک ایسے وسیع و عریض ترہ خانے میں پہنچ گئے جہاں بہت مدھم سی نفرتی روشنی بجلی ہوئی تھی۔ وہ ہال کے دوسری طرف ایک اور سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سیاہ کورا ان کے آگے آگے ریک رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے، نفرتی روشنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر وہ اس سرنگ سے نکل کر اس ہال میں پہنچ گئے جہاں پچوترے پر ناگن ملکہ کی سہری مورٹی رکھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے خزانے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میاں مرکزی ٹیوب لاسٹ جیسی روشنی تھی اور ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

ناگن کی آغوش میں بچو کا مودہ جسم رکھا ہوا تھا اور کئی سانپ اس کے گرد جمع تھے اور پھر دفعتاً ”ٹایاب“ کو یوں لگا جیسے وہ تمام ناگ بن کر رہے ہوں۔ بہت مدھم سی عجیب و غریب بین جیسی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

ہو بھی گیا تو اسے جھگڑاتے ہوئے ہیروں کے بجائے چھروں کا ڈھیر نظر آئے گا۔ تم سے پہلے صدیوں کے مختلف ادوار تک یہ کم لوگ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن سب کو بے نیل و مرام واپس جانا پڑا۔ تحسین اس خزانے کے بارے میں کوئی پریشان نہیں ہوئی چاہیے۔“

”شکریہ ناگن ملکہ۔“ ٹیاب بولی۔ ”کیا میں اس میں سے کچھ لے سکتی ہوں؟“

”جتنا چاہو لے جاؤ۔ یہ تمہاری ملکیت ہے۔“ سرگوشی نے کہا۔

ٹیاب نے ملک سکندر کو اشارہ کیا۔ اس نے دو مضیایاں بھر کر ہیرے اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لیے۔ ٹیاب نے خود آگے بڑھ کر ایک لاکٹ اٹھا لیا۔ خالص سونے کا یہ لاکٹ پرانی طرز کا اور خاصا وزن تھا۔ اس میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے جو مرکزی ردِ مشن میں بھی جھجکا رہے تھے۔ وہ چند لمحے اس لاکٹ کو دیکھتی رہی پھر اسے گلے میں ڈال لیا اور سکندر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ سکندر بھی مسکرا دیا تھا۔

”اب میں چلتی ہوں ناگن ملکہ۔“ ٹیاب نے سورتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر ایک بار پھر کہہ دیجیے ہوں کہ ہوشیار رہنا۔ دشمن تمہارے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ اسے دار کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا چاہیے۔“

ٹیاب نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور سکندر کو اشارہ کرتی ہوئی واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ سیاہ کوبرا ایک بار پھر ان کے آگے آگے چل پڑا۔

تمہ خانے سے باہر آکر سکندر نے سل دہانے پر رکھ دی۔ وہ جیسے بنا ہی تھا کہ قریب ہی ایک ڈھیر سے اینٹیں اور مٹی لڑھک کر سل پر گری اور سل اس طرح دب گئی جیسے اسے کبھی وہاں سے ہٹایا ہی نہ گیا ہو۔

وہ دونوں کھنڈروں سے نکل کر نیلے سے اترے ہوئے اس طرف آگئے جہاں ٹیاب کی کار کھڑی تھی۔ دروازہ کھول کر ٹیاب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور سکندر سسٹیز سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جب وہ گاڑی پہنچے تو انہیں یہ دلچسپ اطلاع ملی کہ تھوڑی دیر پہلے ہی پولیس آئی تھی

ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی موقع پر تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ راکشش وار کر گزرے۔“

ناگن ملکہ کی باتیں سن کر ٹیاب کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔

”ناگن ملکہ۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کل رات ایک پراسرار بوڑھا میری حویلی میں موجود تھا۔ میرے آبی نے بتایا تھا کہ مجھے آتے دیکھ کر وہ بوڑھا غائب ہو گیا تھا۔ کیا اسے تم نے بھیجا تھا؟ کیا وہ بھی کوئی ناگ تھا؟“

”نہیں۔“ ٹیاب کو سرگوشی سنائی دی۔ ”وہ اسی راکشش کا بھیجا ہوا کوئی ہرکارہ ہوگا۔ میں ایک بار پھر کبھی ہوں کہ تحسین ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ تم پر وار کرنے کے لیے موقع تلاش کر رہا ہے۔“

ٹیاب کانپ اٹھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ناگن کی سرگوشی پھر سنائی دی۔

”بھتر مرچکا ہے۔ وہ اب تمہاری مدد کے لیے نہیں آسکتا لیکن اس کے لمس نے تمہارے اندر بھی اتنی قوت پیدا کر دی ہے کہ اس راکشش کے چھوٹے سونے ہرکارے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ تم سے ڈر کر دور بھاگیں گے۔“ چند لمحے خاموشی رہی اور سرگوشی پھر سنائی دی۔ ”تمہیں یاد ہوگا بھتر کم از کم دو مرتبہ تمہارے جسم سے لپٹا تھا اور تمہارے جسم پر سنہری دھاریاں بن گئی تھیں۔ وہ سنہری دھاریاں تمہارے جسم پر نہیں رہیں لیکن ان کا اثر اور خوشبو اب بھی تمہارے بدن میں موجود ہے اور یہ خوشبو ہی چھوٹے سونے دشمنوں کو تم سے دور رکھے گی۔“

ٹیاب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سن اٹھیں سے سکندر کی طرف دیکھا کہ کہیں اس نے تو ناگن کی سرگوشی نہیں سنی لیکن وہ لائق سا کھڑا تھا۔

”شکریہ ناگن ملکہ۔“ ٹیاب نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ ان لوگوں کی سرگرمیوں سے اس خزانے کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”خزانے کو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ ناگن ملکہ نے جواب دیا۔ ”ہماری مرضی کے خلاف کوئی بھی شخص اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کوئی یہاں تک آئے میں کامیاب

پتہ نہیں چنانا چاہیے کہ کھنڈروں میں واقعی کوئی خزانہ موجود ہے۔“

”میرا خیال ہے گاؤں کی بعض عورتوں کو بھی کچھ ہلک جلی چلی ہے۔“ زمرس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح جب پولیس کھنڈروں سے لاش لے کر گئی تھی تو یہاں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ چودھری سعادت کو خزانے کا پتہ چل گیا ہے اور اس نے اپنے ساتھی کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے قتل کیا تھا۔“

”یہ بات نہیں۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”وہ تو کھنڈروں میں اس لیے چھپا ہوا تھا کہ موقع پا کر ہم پر حملہ کر سکے۔ گاؤں کے کچھ لوگ رات کو نیلے کی گھرائی کر رہے تھے کہ ان لوگوں کا تصادم ہو گیا اور وہ آدمی اتفاق سے اپنے ہی کسی ساتھی کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن گیا۔ خزانے والی بات کسی نے یوہنی اڑا دی ہوگی لیکن میں نے تو کسی سے کچھ نہیں سنا۔“

زمرس کچھ کتنا چاہتی تھی کہ باہر سے آنے والی کچھ آوازیں سن کر چونک گئی۔ اس نے اٹھ کر کمرے سے باہر جھانکا اور ٹایاب کے قریب آکر سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

”تمہاری ساس اور سرسرا آئے ہیں۔ باہر نکل کر ان کا استقبال کرو۔“

”کون آئے ہیں؟“ ٹایاب نے اسے گھورا۔

”چچا امانت علی اور چودھری جی ابا کے کمرے میں گئے ہیں۔“ زمرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اٹھ کر تیار ہو جاؤ یا ایسے ہی سر بھڑا منہ چھڑا ان کا سامنا کرو گی۔“

”مجھ سے انہیں کیا دلچسپی۔ وہ آئے ہوں گے انکل سے لڑنے۔“ ٹایاب نے کہا۔

”نہیں۔ وہ لڑائی کے موز میں نہیں نکلتے۔ بات کچھ اور ہی ہے۔“ زمرس نے کہا۔

وہ ابھی باتیں کر رہی رہی تھی کہ برآمدے سے چودھرائی کی آواز سنائی دی۔

”کہاں ہے میری بیٹی۔ میں اس کے پاؤں پر گر کر معافی مانگوں گی۔“

ٹایاب کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ چودھرائی ہی کی آواز تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ سکیڑ اور عذرہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹایاب ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چودھرائی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

”میری بیٹی! مجھے معاف کر دے۔“ وہ گلو گیر آواز میں بولی۔ ”میں غلطی پر تھے۔ تمہیں

اور وہ لوگ چودھری امانت علی کو ساتھ لے کر گئے ہیں۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ٹایاب کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ لیٹنے کے فوراً بعد ہی اس کی آنکھ گم گئی۔

پانچ بجے کے قریب ٹایاب کی آنکھ کھل گئی۔ زمرس اس کے قریب پلگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں ٹایاب کے سینے پر مرکوز تھیں۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ ٹایاب نے اسے گھورا۔

”یہ لاکٹ۔“ زمرس اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کو پکڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہت خوبصورت ہے اور بہت قیمتی بھی۔ شاید ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ پہلے تو تمہارے پاس میں نے یہ لاکٹ نہیں دیکھا تھا۔“

ٹایاب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے لاکٹ گریبان کے اندر ڈال لیا۔

”یہ لاکٹ!“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اللہ کی دین ہے۔ کہیں سے مل گیا“ میں نے

پن لیا۔“

”تم بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ زمرس نے اسے گھورا۔ ”یہ لاکٹ تم یقیناً کھنڈروں والے خزانے سے لے کر آئی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے سکندر بھائی نے مجھ سے کہنا سارے ہیرے دیئے تھے۔ آخر تم لوگ اس خزانے کو وہاں سے نکال کیوں نہیں لیتے۔ اگر اسے کوئی اور چرا کر لے گیا تو کیا ہوگا؟“

”وہ خزانہ وہاں محفوظ ہے۔ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔“ ٹایاب نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔ ”لیکن تمہیں اس خزانے کے بارے میں کس نے بتایا؟“

”تم لوگ ہم سے چھپانے کی کوشش کرتے رہے لیکن مجھے پتہ چل ہی گیا۔“ زمرس نے کہا۔ ”بچھلی مرتبہ بھی مجھ سے بات کچھ ہیرے رکھے ہوئے تھے اور میں نے مجھ سے ان ہیروں کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا کہ کہاں سے آئے تھے اور شاید تم بھول رہی ہو کہ شہر جانے سے پہلے تم نے بھی اس خزانے کا ذکر کیا تھا۔“

”اگر تمہیں معلوم ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔“ ٹایاب نے کہا۔ ”لیکن کسی اور کو یہ

کائنات ہیں۔ آج سے یہ سب کچھ ہمارے سپرد۔ میرا وصیت نامہ بھی ان کائنات میں موجود ہے جو میں نے آج دھپری کو شاد پور میں دیکلے سے لکھوایا تھا اور مجسٹریٹ سے اس کی تصدیق بھی کرا لی تھی۔ آج سے یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ تم جو چاہو، کرو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

نایاب کے دل میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ پکڑے میں لپٹے ہوئے کائنات کے پلندے کو گھور رہی تھی۔

”اب کچھ مت سوچو بیٹی۔“ چودھرائی بولی۔ ”بس اب ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے بہت غلطیاں کی ہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

نایاب اس سے لپٹ گئی۔

”آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ وہ بولی۔ ”میں آپ کو قصوردار نہیں سمجھتی۔ آپ کی غلطی صرف اتنی ہے کہ اس نے جو کہا، آپ نے مان لیا۔ میری شادی کے بعد جب سب سے پہلے سعادت نے جائیداد کی بات اٹھائی تھی تو آپ نے اسے بلا چون و چرا مان لیا تھا۔ آپ نے یہ نہ سوچا کہ سرفراز بھی آپ کا بیٹا ہے۔ سعادت کے کہنے پر اسے جائیداد سے عاق کر دیا۔ سرفراز کو جب قتل کیا گیا تو میں تو اس وقت بھی کتنی تھی کہ اس میں سعادت کا ہاتھ ہے لیکن آپ لوگوں نے اسے بہتان قرار دیا اور پھر سعادت نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بھی آپ کے علم میں ہے۔ وہ کئی بار مجھے قتل کرانے کی کوشش کر چکا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کے علم میں ہے لیکن آپ نے بیٹھ مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا اور۔۔۔“

”نایاب بیٹی۔“ ملک صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب یہ لوگ اپنے کیے پر بچتا رہے ہیں تو تم بھی پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ ختم کر اب اس قصے کو۔ میرے لیے تو سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور یہ ہمیں اپنی بے باور بیٹی کے طور پر لپٹنا چاہتے ہیں۔“

”میں اس بات پر بے حد خوش ہوں۔“ نایاب نے کہا۔ ”لیکن یہ کائنات۔۔۔ مجھے نہ ان کائنات کی ضرورت ہے اور نہ جائیداد کی۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے میرا حق تسلیم کر لیا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”اگر تم یہ کائنات اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتیں تو مجھے دیدو۔“ ملک صاحب نے کہا

پچانے میں ہم نے غلطی کی۔ ایک بیٹا تو ہم نے کھو ہی دیا تھا۔ ہمیں اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ہمارا بیٹا غیروں کے نہیں، اپنے بھائی کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔ سعادت ہمیں قدم قدم پر دھوکا دیتا رہا۔ ایک طرف اس نے ہمارے لیے ہمارے دلوں میں نفرت پیدا کی اور دوسری طرف ہمارے ہی خلاف سازشیں کرتا رہا۔ اس نے قدم قدم پر ہمیں ذلیل کیا اور ہم اس کے اشاروں پر ہانپتے رہے۔ اس کی وجہ سے آج ہماری عزت خاک میں مل گئی اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ آج پہلی بار ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم اپنے گھر میں بیٹے کو نہیں سانپ کو پال رہے تھے اور یہی ذہیلا ناگ ہمیں ہی ڈس لے گا۔“

چودھرائی بھوں بھوں رو رہی تھی۔ نایاب کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ وہ متوحش نظروں سے بھی سیکڑے اور کبھی زکس اور عذرہ کی طرف دیکھنے لگتی۔

”نہ رو چاہی۔“ سیکڑے نے چودھرائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ادھر ابائی کے کمرے میں آجاؤ۔ چاچا بھی وہیں بیٹھے ہیں۔“

وہ لوگ ملک صاحب والے کمرے میں آگئے۔ چودھری امانت علی نے بھی اٹھ کر نایاب کو سینے سے لپٹا لیا۔ نایاب حیران تھی کہ یہ گایا لپٹ کسی۔ چند روز پہلے چودھری امانت علی جائیداد میں سے اس کا حصہ دینے کو تیار ہو گیا تھا لیکن وہ یہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چودھرائی اس طرح برہاں اگر اس سے معافی مانگے گی۔

”اب تم لوگوں کو اپنی غلطی کو احساس ہو گیا ہے تو بھول جاؤ پچھلی باتوں کو۔“ ملک صاحب نے کہا۔ ”نیک اولاد بھی اللہ کی نعمت ہوتی ہے اور اگر اولاد غلط راستے پر نکل جائے تو زندگی جہنم بن جاتی ہے۔“

”ہماری زندگی تو جہنم سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔“ چودھری امانت علی نے کہا۔ ”اس لڑکے نے تو ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کاش! ہمیں پہلے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور نایاب بیٹا۔“ اس نے پکڑے میں لپٹا ہوا ایک بندل نایاب کی طرف پوچھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری ساری جائیداد کے

فضل دین کی دکان کے سامنے چھوڑ کر وہ بازاروں میں گھوم بھر کر شاپنگ کرنے لگے۔
چار بجے کے قریب وہ واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر ٹایاب نے جیسے ہی کار پرانی حویلی کی طرف موڑی، وہ سب چونک گئے۔ حویلی کے باہر ٹیلے پر درختوں کے نیچے بہت سے لوگ جمع تھے۔ حویلی کے چائیک کے سامنے بھی لوگوں کا جھوم لگا ہوا تھا۔ ٹایاب گاڑی سے اتری تو اسے لوگوں نے گھیر لیا۔

”کیا ہوا... تم سب لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟“ ٹایاب نے پوچھا۔
”بڑے چودھری جی کو ان کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے چھوٹی بی بی۔ حویلی کے اندر ان کی لاش برآمدے کے دروازے میں پڑی ہے۔“ ایک آدمی نے بتایا۔
”کیا...؟“ ٹایاب کا دل اچھل کر طوق میں آگیا۔ ”یہ کیسے ہوا اور وہ یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”پتہ نہیں جی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”کچھ ملک جی اندر موجود ہیں، ان سے پوچھ لیں۔“

ٹایاب پچانک سے اندر آگئی۔ سکندر اور چند اور آدمی برآمدے میں کھڑے تھے۔ برآمدے والے دروازے میں چودھری امانت علی کی لاش اس طرح پڑی تھی کہ اس کا اوپر کا دھڑ باہر اور تاہیں اندر تھیں۔ کھوپڑی پیٹی ہوئی تھی اور خون بسر کر چکا تھا۔
”سکندر بھائی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔
”تم لوگ کہاں تھے؟“ سکندر نے اٹھا سوال کر دیا۔

”میں کچھ شاپنگ کرتی تھی۔ گاؤں سے نکل کر سیدھا شاہ پور چلے گئے تھے لیکن چودھری انکل یہاں کب آئے تھے اور سعادت کیسے یہاں پہنچ گیا؟“ ٹایاب نے پوچھا۔
”ہات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ ملک سکندر بولا۔ ”ہاشم تھا رہا تھا کہ ڈھانکی بجے کے قریب چودھری صاحب یہاں آئے تھے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ ہاشم نے بتایا کہ تم تو گاؤں میں ہو۔ چودھری صاحب سمجھ کر شاید وہ مجھوت بول رہا ہے کیونکہ وہ تمہیں گاڑی پر گاؤں سے روانہ ہونے دیکھ چکے تھے۔ وہ ہاشم کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر آگئے۔ برآمدے والا دروازہ کھول کر جیسے ہی قدم اندر رکھا، حویلی کے اندر سے کسی عورت کی چیخوں کی

اور ٹایاب نے وہ کانڈرات ان کے حوالے کر دیئے۔

باتوں میں دونوں طرف سے دلوں کی بھڑاس نکلتی رہی اور ہالاخ دونوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

گاؤں میں بھی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ چودھری فیلی اور ٹایاب میں صلح ہو گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ملک صاحب کی حویلی میں گاؤں کی عورتوں کا ٹنگنا لگ گیا۔ مروجہ گلی میں جمع ہو رہے تھے۔

پورے گاؤں کے لوگ خوش تھے۔ ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس جھگڑے سے گاؤں پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ اب بات صرف چودھری سعادت کی رہ گئی تھی۔ چودھری امانت علی نے اس سے لافلتی کا اعلان کر دیا تھا۔ ویسے بھی سعادت کے اب یہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے کچھتا بھر رہا تھا۔

ٹایاب کو اس رات گاؤں ہی میں رکنا پڑا۔ نیچہ بھی حویلی سے آگیا تھا۔ رات کا کھانا ان سب نے چودھری امانت علی کی حویلی میں کھایا۔ ملک صاحب کے گھر کے علاوہ گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ مدعو تھے۔ چودھری صاحب کی بیوی سو حویلی میں نہیں تھی۔ ٹایاب کے لیے یہ اطلاع خاصی دلچسپ ثابت ہوئی تھی کہ سعادت کی بیوی کئی روز سے اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔

چودھری اور چودھرائی، ٹایاب کو اپنی حویلی میں روکنا چاہتے تھے لیکن ٹایاب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فی الحال وہ آگ ہی رہے گی۔ تمام معاملات طے ہونے کے بعد وہ یہاں آ جائے گی۔

دوسرے روز دوپہر کا کھانا بھی ٹایاب نے ملک صاحب کی حویلی میں کھایا تھا اور پھر وہ ٹیپہ، رانید اور روٹی کو لے کر پرانی حویلی کے لیے روانہ ہو گئی۔

”اے ٹایاب۔“ راستے میں ردیل نے کہا۔ ”گھاڑی حویلی کی طرف موڑنے کے بجائے سیدھی لے چلو۔ مجھے شاہ پور سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔“

”جیڑیں تو مجھے بھی خریدنی ہیں۔“ ٹایاب بولی۔ ”چلو، پہلے شاہ پور ہی چلتے ہیں۔“
ٹایاب گاڑی کو سیدھا لیتی چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شاہ پور پہنچ گئے۔ گاڑی چاچا

ہاشم پہلے ہی ڈر کر ایک طرف چھپ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ چودھری سعادت اور لالو مسلٹی جیسے ہی حویلی سے نکلے، اس نے بھی باہر آکر شور مچا دیا۔ پہلی گولی کی آواز سن کر کئیوں میں کام کرنے والے کسان اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے چیتوں کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے دوسری گولی کی آواز بھی سنی اور چودھری سعادت اور لالو مسلٹی کو گھوڑوں پر سوار حویلی سے نکلنے ہوئے بھی دیکھا۔

یہاں کی صورتحال دیکھ کر ایک آدمی دوڑتا ہوا گاؤں پہنچ گیا۔ یہ خبر بنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ سعادت نے پرانی حویلی میں اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ مجھ سے پہلے گاؤں کے بہت سے لوگ یہاں پہنچ چکے تھے۔ تم لوگوں کو یہاں نہ پا کر میں پریشان ہو رہا تھا کہ تم لوگ کہاں چلے گئے۔“

”حیرت انگیز۔“ ٹایاب ملک سکندر کے خاموش ہونے پر بولی۔ ”کیا کوئی بیٹا اتنا شگدل ہو سکتا ہے کہ اپنے باپ کو گولی سے اڑا دے۔“

”اس کا بھی ایک پس منظر ہے جس کے بارے میں ہمیں آج تک علم نہیں ہو سکا لیکن.....“ سکندر چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”لیکن ایک بات میں پورے دوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حویلی کا آسیب ختم ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔“ ٹایاب گمراہ ساں لیتے ہوئے بولی۔ ”کہا جاتا ہے کہ چودھری امانت علی نے گاؤں کے بوڑھے موہنی کی جوان اور خوبصورت بیٹی کو حویلی میں بے آہود کر کے قتل کر دیا تھا۔ اس کی روح انتقام لینے کے لیے بے چین تھی۔ آج چودھری امانت علی حویلی کے دروازے پر اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ اس لڑکی کی روح کو بھی سکون مل گیا ہوگا اور اب وہ یہاں سے چلی گئی ہوگی لیکن آپ نے کون سے پس منظر کی بات کی ہے جو میں نہیں جانتی؟“

”سعادت علی‘ چودھری امانت کا بیٹا نہیں ہے۔“ ملک سکندر نے کہا۔

”کیا؟“ ٹایاب اچھل پڑی۔

”گاؤں کے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ چودھری امانت کی شادی سے

پہلے چاچا زینب کا ایک بیٹا بھی تھا۔“ سکندر بولا۔

آواز سنائی دینے لگی۔ ہاشم بھی گھبرا گیا کہ یہ کس کی چیتوں کی آواز تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم تینوں میں سے کوئی بھی حویلی میں موجود نہیں ہے۔ وہ صورتحال معلوم کرنے کے لیے پھاٹک سے اندر کی طرف دوڑتا چودھری صاحب کے چیتنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور پھر ایسا لگا جیسے کسی نے چودھری صاحب کو اٹھا کر باہر پھینک دیا ہو۔

ہاشم چودھری صاحب کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھے۔ ہاشم انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دو گھڑ سوار حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک چودھری سعادت تھا اور دوسرا حسن آباد کا لالو مسلٹی۔ وہ گھوڑوں سے اتار آئے۔ سعادت ہندوق تان کر برآمدے کے سامنے پہنچ گیا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ مرشد شام اس کے ماں باپ نے تم سے صلح کر لی ہے اور چودھری صاحب نے سعادت سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے زمینوں اور دوسری جائیداد کے کاغذات تمہارے حوالے کر دیئے ہیں۔

سعادت شاید تمہارے پکڑ میں یہاں آیا تھا لیکن تم تو نہیں ملیں، اس کا سامنا اپنے باپ سے ہو گیا۔ کچھ دیر تک ان دونوں میں تلخ کھائی ہوئی رسی، پھر سعادت نے باپ پر ہندوق تان لی اور جج کر کہا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

چودھری امانت علی روڈ کر دروازے میں داخل ہو گیا۔ سعادت نے گولی چلائی۔ گولی دروازے میں لگی۔ چودھری امانت علی جیسے ہی برآمدے والے دروازے کے اندر پہنچا، اندر سے ایک ہار پھر کسی عورت کے چیتنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی چودھری کے چیتنے کی بھی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر یوں کا جیسے بہت سے لوگ جج رہے ہوں، بین کر رہے ہوں۔ حویلی چیتوں سے گونج رہی تھی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد چودھری کسی طرح دروازے سے باہر نکلا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا۔ بیٹے کو برآمدے میں ہندوق تانے کھڑے دیکھ کر وہ دوبارہ دروازے کی طرف لپکا۔ سعادت نے گولی چلا دی۔ چودھری کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے۔ وہ جہرا کر دروازے میں گرا اور اس کے ساتھ ہی حیرت انگیز طور پر حویلی میں سے چیتنے اور بین کرنے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اس طرح سکوت چھا گیا جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔

سعادت کچھ دیر تک باپ کی لاش کے سامنے کھڑا قہقہے لگاتا رہا، پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ اور لالو مسلٹی ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گئے۔

کے لیے آیا تھا۔ تم تو یہاں موجود نہیں تھیں، چودھری امانت اس کے ہاتھ لگ گیا۔

”میرے لیے یہ انکشافات حیرت انگیز ہیں۔“ ثایاب نے کہا۔

”حالات پر سکون ہوں تو چاہتی زینب سے پوچھ لیتا۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔“
سکندر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”میں نے دو بندے سوئٹرسٹیکل پر شاہ پور بھیجے تھے، پولیس ابھی تک نہیں آئی۔“

”میرا خیال ادھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں تو گرمی ہو رہی ہے۔“ ثایاب نے کہا۔

وہ لوگ ادھر آکر پرکدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریباً آٹھ بجے بعد پولیس کی جیپ سڑک سے حویلی والے راستے پر مڑتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ لوگ جیپ کو آتے دیکھتے رہے اور جب پولیس ٹیلے پر آکر حویلی کے چھانک کی طرف مڑ گئی تو وہ بھی اٹھ کر نیچے آ گئے۔

اس پولیس کا انچارج سب انسپکٹر اشرف ہی تھا۔ پولیس تقریباً ڈیڑھ بجے تک موجود رہی۔ ہاشم اور ان کسانوں کے بیانات لیے گئے جنہوں نے چودھری سعادت اور لالو مسلی کو دیکھا تھا۔

”لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا جائے یا۔۔۔۔۔“

”نہیں جی۔“ سکندر نے سب انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ ”جی بھاڑ کرنے کیا ضرورت

ہے۔ سب کچھ سامنے ہے۔ اب آپ اجازت دیں تو ہم لاش کو گاؤں لے جائیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ اس کانڈ پر دھچکا کر دیں۔“ سب انسپکٹر اشرف

نے کلب بورڈ اس کی طرف دیکھا دیا۔

پولیس کے جانے کے بعد چودھری امانت علی کی لاش ایک چارپائی پر ڈال دی گئی اور

وہ لوگ لاش کے گرگڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ثایاب دھیمو بھی دو آدمیوں کو حویلی میں

چھوڑ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

گاؤں میں کرام مچا ہوا تھا۔ طویل عرصے تک لوگ چودھری امانت علی سے نفرت

کرتے رہے تھے لیکن گزشتہ چند روز کے دوران وہ جس طرح بدلا تھا، اس سے لوگوں کے

روئیے میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ پچھلے دو تین دن سے تو چودھری امانت علی گاؤں کے ایک

ایک آدمی سے مل کر اپنی زیادتیوں کی صفائی مانگتا رہا تھا اور پچھلے روز ان دونوں مہاں یہی

”کیا مطلب۔ میں کبھی نہیں؟“ ثایاب نے اسے گھورا۔

”چاہتی زینب رنگ پور کی رہنے والی ہے۔ اس کی پہلی شادی رنگ پور ہی میں ہوئی تھی جس سے ایک بیٹا تھا لیکن بیٹا ابھی صرف دو مہینے کا تھا کہ اس کے شہر کا انتقال ہو گیا۔ عدت کے فوراً ہی بعد اس کی چودھری امانت علی سے شادی کر دی گئی۔ اس طرح وہ بیٹا بھی چودھری کے پاس آیا۔ چودھری نے اسے اپنا بیٹا ہی سمجھ کر پالا اور اسے نام بھی اپنا ہی دیا۔ اس کی اپنی اولاد کئی سال بعد ہوئی تھی۔ تمہارا شہر سعادت سے آٹھ نو سال چھوٹا تھا لیکن ان بن بھائیوں میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ سعادت ان کا سوتیلہ بھائی ہے۔ وہ اسے اپنا سگا بھائی ہی سمجھتے رہے لیکن بدے ہو کر سعادت کو کسی طرح اپنے بارے میں حقیقت کا پتہ چل گیا اور اس نے پوری جائیداد کا تحا وارث بننے کے لیے اپنے بن بھائیوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اس نے اپنے باپ کو بھی نہیں بخشا۔ ماں کو جب اس کی حرکتوں کا پتہ چلا تو اس نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن سعادت نے اسے بھی زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔

سرفراز کے قتل کے بعد چاہتی زینب کو شبہ ہوا تھا کہ اس قتل میں سعادت کا ہاتھ ہے مگر اس نے زبان بند رکھی۔ تم سے سرفراز کی شادی کے بعد سعادت نے باپ کو سرفراز اور تمہارے خلاف اتنا بھڑکا دیا تھا کہ اس نے سرفراز کو جائیداد سے حاق کر دیا۔ سعادت کی سازشیں جاری رہیں اور جب تم نے جائیداد میں اپنے حصے کے لیے کارروائی شروع کی تو سعادت بھی آہستہ آہستہ کھٹنے لگا۔ ماں باپ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔

سعادت جنہیں قتل کرنا چاہتا تھا تاکہ جائیداد کے بھجڑے کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ وہ تمہارا تو کچھ نہ بگاڑ سکا۔ البتہ کئی بے گناہ اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ چودھری امانت علی بھی اب سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس لیے عدالت کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی جنہیں یہ پیشکش کر دی تھی کہ جو زمین تم چاہو، اپنے تمام حق کرائی سکتی ہو اور کل بالا خراس نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا۔

سعادت گاؤں کے آس پاس ہی کسین چھپا ہوا تھا۔ اسے بھی یہ خبر مل گئی۔ اس نے نہ صرف جنہیں بلکہ اپنے باپ کو بھی قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہاں تم پر حملہ کرنے

سوئم والے دن بھی علاقے کے بڑے بڑے زمیندار اور سینکڑوں لوگ موجود تھے اور پھر چلم پر بھی کچھ ایسی ہی صورتحال تھی۔ گاؤں کی رسم کے مطابق ہوتا یہ ہے کہ خاندان کے سربراہ کی موت کے بعد چلم والے دن سب سے بڑے بیٹے کو اس کا جانشین قرار دے کر اس کے سر پر چڑی جاڑی جاتی ہے لیکن یہاں صورتحال برعکس تھی۔ بڑے بیٹے کے بارے میں جو انکشاف ہوا تھا اس نے سب کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ چودھری امانت علی نے وصیت نامے میں ٹایاب کو اپنا وارث قرار دیا تھا۔ گاؤں کی بزرگ عورتوں نے چودھرائی کو آگے کیا اور چودھرائی نے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں ٹایاب کے سر پر شال اوڑھائی اور اس کی سربراہی کا اعلان کر دیا۔

ٹایاب وقتی طور پر چودھری کی حویلی میں آگئی تھی لیکن چلم کے بعد وہ پھر پرانی حویلی منتقل ہو گئی تھی۔ حالانکہ سکندر اور دوسرے لوگوں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں چودھری سعادت اب پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا تھا اور ظاہر ہے، وہ اس کا ذمہ دار ٹایاب ہی کو سمجھتا تھا اور اب وہ ٹایاب سے انتقام لینے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

ٹایاب نے کسی کی بات نہیں مانی اور پرانی حویلی چلی گئی تھی۔ رہتی اور بچو اس کے ساتھ تھے۔ البتہ راجہ کو چودھرائی نے اپنے پاس روک لیا تھا۔ سکندر نے دو آدمی پرانی حویلی بھیج دیئے تھے۔ ہاشم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اکبر اور غلام حسین کے پاس ڈبل ہیل بندھن تھیں۔

ٹایاب کو پرانی حویلی میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب زرمس، سکندر اور مدھرہ پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ چودھرائی اور راجہ بھی تھیں۔ ٹایاب نے حویلی کے چانک پر ان کا استقبال کیا۔ چودھرائی اندر داخل ہوتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ کئی سال پہلے ان کے دو بیٹے پراسرار طور پر حویلی میں ہلاک ہو گئے تھے اور حویلی میں بسنے والی روحوں کے خوف سے انہوں نے حویلی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد ان میں سے کسی نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ چودھرائی یہ بھی جانتی تھی کہ حویلی میں بسنے والی روح نے ٹایاب یا کسی اور کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے جب سعادت حویلی میں داخل ہوا تھا تو وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا تھا اور پھر اس روز چودھری امانت علی ٹایاب

نے جس طرح ملک صاحب کے گھر جا کر ٹایاب سے معافی مانگی تھی اور اپنی جائیداد کے کاغذات اس کے حوالے کیے تھے، اس سے تو لوگوں کے رویے بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کی افسوسناک موت سے تو لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے ہمدردی اٹھ آئی تھی۔ جن لوگوں کے ساتھ ناقابل طاعتی زیادتیاں ہوئی تھیں، انہوں نے بھی چودھری کو معاف کر دیا تھا اور وہ بھی اس کے لیے رو رہے تھے۔

چودھری امانت علی کے قتل کی خبر آنا فانا پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ وہ اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ ٹایاب سے خاندانی جھگڑوں اور مزارعین سے غم و زیادتیوں سے قطع نظر، زمینداری کے حلقے میں اس کا ایک مقام تھا۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ آس پاس کی بستیوں سے لوگ رات ہی کو گاؤں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دور دراز کے علاقوں کے زمیندار اور دوسرے لوگ صبح سویرے پہنچ گئے۔ شاہ پور سے بعض اعلیٰ سرکاری افسران اور تاجر بھی آئے تھے۔

جینیزو تحفین کے تمام انتظامات سکندر ہی کر رہا تھا۔ اس نے صبح سویرے ہی شاہ پور سے شامیانے وغیرہ منگوا لیے تھے جو چودھری کی حویلی کے وسیع کھاؤں اور اس کے سامنے کھلی جگہ پر لگ دیئے گئے تھے۔ سینکڑوں لوگ جمع تھے۔

دن کے گیارہ بجے کے قریب تدفین ہوئی اور پھر سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں وکیل نے چودھری امانت علی کا طویل وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔ اس وقت وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے وصیت نامے پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے اور تصدیق کی تھی۔

وصیت نامے میں یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ سعادت اس کا حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک پائی کا حصہ بھی نہیں رکھا گیا تھا اور لائق کا اہتمام کرتے ہوئے اسے مکمل طور پر عاق کر دیا گیا تھا۔ اس وصیت نامے میں ساری منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی واحد وارث ٹایاب کو قرار دیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے، اس جائیداد کو استعمال میں لاسکتی ہے۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی تھی۔

سہارن پور

صورتحال بدل گئی تھی۔

گاڑی چلائی دی۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ کھیتوں میں کسی کسی ڈیڑے پر لائین کی روشنی دکھائی دے رہی تھی جو تاریکی میں بڑا پر اسرار تاثر دے رہی تھی۔

حویلی کی طرف جانے والے سڑے سے ذرا پہلے اس نے گاڑی کی رفتار مزید کم کرنی اور وہ گاڑی کھیتوں والے راستے کی طرف موڑنا ہی چاہتی تھی کہ ایک آدھی اچانک ہی ایک کھیت سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں رائل تھی۔ منہ پر ڈھانچا بندھا ہوا تھا اور وہ مکمل طور پر کار کے بیٹھ نیپس کی روشنی میں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائل سنبھال رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

غیاپ کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اگلی تھی۔ چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ کوئی اس کی مدد کو بھی نہیں آسکتا تھا۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ گاڑی کی رفتار یکدم بڑھا دے اور سامنے کھڑے ہوئے اس شخص کو پکارتی ہوئی چلی جائے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ شخص جس انداز سے کھڑا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ غاصا محاط ہے۔ گاڑی کی رفتار کا اندازہ لگاتے ہی وہ فوراً ایک طرف ہٹ جائے گا اور فائر کھول دے گا۔ غیاپ نے اس سے دوسرے طریقے سے نپٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ شخص اکیلا ہی تھا۔ کم از کم بیٹھ نیپس کی روشنی میں اکیلا ہی نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی دوسرا تھا بھی تو تاریکی میں ہوگا جو نظر نہیں آ رہا تھا۔

غیاپ نے گاڑی روک لی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات کا اظہار آتا اور دل کی دھڑکن کا تیز ہو جانا فطری بات تھی لیکن اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ شخص ڈائریکٹ سائیڈ والے دروازے کے قریب آگیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائل تھی اور دوسرے ہاتھ سے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ غیاپ نے دروازے کے لاک والی دابہ اوپر اٹھا دی اور پنڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ باہر سے اس شخص نے بھی پنڈل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ غیاپ نے دو انگلیوں سے پنڈل اوپر اٹھا دیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دروازہ کھول کر آرام سے نیچے اترنا چاہتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے کندھے سے دروازے کو زوردار ٹکرا دی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل کر اس شخص کے کھنٹوں پر لگا۔

سے نکلے کے لیے حویلی میں آیا تھا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے بدبوؤں نے گھیر لیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چپٹا ہوا باہر بھاگا تو بیٹا بندوق نالے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دوبارہ اندر بھاگنا چاہا مگر بیٹے نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

چودھرائی سمجھتی تھی کہ بدبوؤں کو صرف چودھری کے خاندان ہی سے دشمنی تھی۔ کسی اور کو انہوں نے کبھی قصاص نہیں پہنچایا تھا اور اسی لیے وہ خود بھی حویلی میں داخل ہوتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

چودھری کی موت کے بعد غیاپ ایک درجہ تیز حویلی میں آئی تھی اور اس نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی بلکہ اس سے پہلے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی چوٹا دینے والی بات ہوتی رہتی تھی۔ کبھی یسٹ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہوا میں تیرتا ہوا دوسری جگہ تک جاتا، کبھی کرسیاں اپنی جگہ چھوڑ دیتیں لیکن چودھری کی موت کے بعد ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ایسا تاثر بھی محسوس نہیں ہوا تھا جو عام طور پر آسیب زدہ عمارتوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ بالکل سکون سا لگ رہا تھا۔ سکندر نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس لڑکی کی روح کو چودھری امانت ملی ہی سے انتقام لیتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اب حویلی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوگا۔

چودھرائی جب حویلی میں داخل ہوئی تو اس کے دل میں عجیب سا خوف تھا۔ غیاپ اسے اور زکس دیکھو کہ پہلے حویلی کے پچھلے حصے میں گھمائی رہی، پھر اوپر لے آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چودھرائی کے دل سے خوف زائل ہوتا گیا۔

غیاپ کو بھی یقین ہو گیا کہ اب یہاں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوگی۔ وہ سب لوگ اوپر والے تیرس میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دہلی نے پہلے ان سب کے لیے چائے بنائے اور چائے پینے کے بعد دہلی اور راجہ رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔ چودھرائی اور زکس دیکھو رات دس بجے تک دہاں رہی تھیں۔ غیاپ نے تو انہیں رات بھر کے لیے روکنا چاہا تھا لیکن چودھرائی میں نانی۔ وہ ابھی صحت میں تھی۔ اس کے گھر سے نکلے پر ہی گاؤں میں بائیس رہی ہوں گی۔

وہ پیدل آئی تھیں۔ غیاپ نے انہیں اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ انہیں گاؤں چھوڑ کر غیاپ اگلی ہی گاؤں سے روانہ ہوئی تھی۔ گاؤں سے نکل کر وہ سڑک پر بھی رفتار سے

دی۔ اکتیشن سے چابیوں کا کچھا نکال کر ایک چابی سے ڈگی کھولی اور اندر پڑی ہوئی ایک رسی نکال کر گاڑی کے سامنے آگئی۔ وہ ٹھنڈا ٹھنڈا کر ایک طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹایاب نے رسی کو لپیٹ کر پکڑا اور کوڑے کی طرح اس کی پٹائی کرنے لگی۔

رسی کی ضرب کوڑے سے بھی زیادہ شدید تھی۔ ٹایاب اس وقت تک اس کی پٹائی کرتی رہی جب تک وہ بے سدھ ہو کر گر نہیں پڑا۔

”تم مجھے عورت سمجھ کر قابو کرنا چاہتے تھے۔“ ٹایاب سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں عورت نہیں شہینہ ہوں۔“ تیس جیڑہ پاؤں رکھ دیا۔

اسی وقت جوبلی کی طرف سے بھی دو فائر ہوئے اور چند سیکنڈ بعد کسی کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد غلام حسین کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔

”چھوٹی لی۔ لی۔ ہم آ رہے ہیں۔“

دو منٹ بعد غلام حسین اور ہاشم بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹایاب کی کار کو کھینچ کر طرف مڑنے والے راستے پر رکتے اور روشنی میں کسی آدمی کو دیکھ لیا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی گڑبڑ ہے، پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی تو وہ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ٹایاب اس وقت تک اس ٹھنڈے کھلے طور پر بے بس کر چکی تھی۔ غلام حسین اور ہاشم نے اسے رسی سے باندھ کر ڈنگ میں ڈال دیا۔ ٹایاب نے غلام حسین کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا اور گاڑی کو پوری رفتار سے شاہ پور کی طرف دوڑا دیا۔ ہاشم کو اس نے گاڑی بھیج دیا تھا تاکہ ملکہ سکندر کو صورتحال کی اطلاع دے سکے۔

انہیں شاہ پور پولیس اسٹیشن پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ سب انسپکٹر اشرف اس وقت قہانے میں موجد تھا اور پھر ٹایاب کے لیے یہ انکشاف خاصا سستی خیر ثابت ہوا تھا کہ اس نے جس ٹھنڈے کو پکڑا تھا، وہ کم از کم چار آدمیوں کے قتل کے الزام میں طویل عرصہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ اسے اشتہاری قرار دیا جا چکا تھا اور اس کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام بھی مقرر تھا۔

”یہ انعام میری طرف سے پولیس ڈیفنسر فنڈ میں دے دیجئے لیکن اس ٹھنڈے کو اب

ٹایاب کی یہ حرکت اس ٹھنڈے کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ٹھنڈوں پر دروازے کی کڑ سے وہ لڑکھڑکیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکا، ٹایاب نے بڑی پھرتی سے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر اسے ایک بار بھر پوری قوت سے باہر کی طرف دھکیلا۔ اس وقت وہ ٹھنڈے جگ کر بائیں ہاتھ سے ٹھٹھا تھامے ہوئے تھا اور اس مرتبہ دروازہ اس کے سر پر لگا اور وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

ٹایاب بڑی پھرتی سے نیچے اتر آئی اور پوری قوت سے اس ٹھنڈے کو ٹھوکر رسید کر دی۔ ٹھوکر اس ٹھنڈے کے کندھے پر لگی تھی۔ وہ کراہ اٹھا۔ ٹایاب ایک اور ٹھوکر مارنا چاہتی تھی کہ اس ٹھنڈے نے رائفل کا ٹریگٹر دبا دیا یا بدحواسی میں ٹریگٹر دب گیا۔ رائفل آؤٹریک ہو گئی اور اس کا رخ گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف تھا۔

تاریک سناٹا ترزاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ گولیاں ٹایاب کی ٹانگ سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتی ہوئی گاڑی کے پچھلے دروازے میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔

ٹایاب اسی لمحہ اچھلی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر اس ٹھنڈے کی پیشانی پر لگی، وہ بڑی طرح چیخ اٹھا۔ پیر کی ٹھوکر لگنے سے سر کسی پتھر سے بھی ٹکرایا تھا۔ رائفل اس ٹھنڈے کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ٹایاب نے بڑی پھرتی سے جبکہ کر قریب پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس ٹھنڈے کے دائیں کندھے پر دے مارا۔ وہ ٹھنڈا ہلکا اٹھا۔ ٹایاب اگر چاہتی تو اس پتھر سے اس کا سر کھینکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تو اسے صرف مفلوج کرنا چاہتی تھی تاکہ اسے اپنی گرفت میں لے سکے۔

اب تک کی صورتحال سے یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ آدمی اکیلا ہی تھا اور قرب و جوار میں اس کا کوئی دوسرا ساتھی موجود نہیں تھا۔ وہ ہٹاٹا آدمی تھا۔ اگر ٹایاب اس کے ٹھنڈوں پر دروازے کی کڑ نہ مارتی تو اسے کسی طرح بھی زیر نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اس ٹھنڈے کی بدقسمتی تھی کہ ٹایاب جیسی لڑکی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

ٹایاب نے اس کی ٹھیک ٹھاک دھماکی کر دی، پھر اسے سمجھتی ہوئی گاڑی کے سامنے لے آئی اور اس کے چہرے سے پکڑا ہٹا دیا۔ وہ ٹھنڈے اس کے لیے اجنبی تھا۔

”میں پسے کرا رہی ہوں۔ اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی تو تمہاری کھوپڑی پھیل دلا دی۔“ ٹایاب نے لمبی کی طرح غرا کر کہا اور اس کی رائفل اٹھا کر پچھڑ سیٹ پر پیٹک

کہا تھا کہ جب تک سعادت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، گاؤں میں ہی رہو۔ گاؤں سے اٹا دو اور حویلی میں رہنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ حویلی چھوڑ دو۔“

”سکندر بھائی۔“ ثایاب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی سے ڈر کر زندہ نہیں رہتا چاہتی۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرا وقت پورا ہو گیا ہے تو کسی محفوظ ترین پناہ گاہ میں بھی کوئی مجھے موت سے نہیں بچا سکتا۔ چھپے تو وہ ہیں جو بزدل ہوں۔“

”میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔“ سکندر گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال میں دو آدمی اور یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سعادت کو جب گھڑار کے پکڑے جانے کی خبر ملے گی تو وہ تھلا کر رہ جائے گا اور میں ممکن ہے وہ جوش میں آکر حویلی پر دھاوا بول دے۔“

”وہ ہمیں قائل نہیں پائے گا۔“ ثایاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ سکندر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے میں ایک بار پھر یہ مشورہ دوں گا کہ حویلی چھوڑ کر گاؤں آجائے۔“

”اگر یہاں زیادہ گریو محسوس ہوئی تو ایک لمحہ شائع کیے بغیر آجائوں گی۔“ ثایاب نے جواب دیا۔

سکندر چلا گیا۔ ثایاب، نیچے اور دہلی اوپر والے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے اس صورتحال کے بارے میں سمجھ کر رہے۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ ردی کہہ رہی تھی۔ ”میں نے تو یہ سنا تھا کہ ہر ایسے موقع پر ایک پر اسرار بوڑھا تمہاری مدد کو پہنچ جایا کرتا تھا لیکن آج ایسا کیوں نہیں ہوا؟ وہ بوڑھا کہاں چلا گیا؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ایک سنہری سانپ کی نودلے سے جان بچائی تھی۔“ ثایاب نے کہا۔ ”وہ سنہری سانپ اتنا احسان مند ہوا کہ اس نے ہر آڑے وقت میں میری مدد اور حفاظت کا وعدہ کر لیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ میرا محافظ بن کر رہا لیکن کچھ عرصہ پہلے کھنڈروں والے ٹیلے پر اس سنہری ناگ کو سر چکل کر ہلاک کر دیا گیا۔“

دوبارہ مطلوب نہیں ہونا چاہیے۔“ ثایاب نے کہا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک قتلے میں رہی تھی۔ سب انکسٹر اشرف نے اس کی گاڑی کا بھی جائزہ لیا تھا جس کا پچھلا ایک دروازہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کی موجودگی میں ہی سب انکسٹر نے گزار نای اس شخص سے پوچھا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا؟

”چودھری سعادت نے مجھے حویلی کی نگرانی کرنے کو کہا تھا۔“ گھڑار نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا کہ میں ثایاب پر لٹا رہوں۔ میں نے اسے چودھری اور ملک جی کے گھر والوں کے ساتھ گاؤں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ انہیں چھوڑ کر اہلی واپس آنے کی۔ میرا خیال درست نکلا۔ واپس پر میں نے اس کی گاڑی روک لی۔ میں چاہتا تو اسے گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا لیکن میں اسے زندہ پکڑ کر چودھری کے پاس لے جانا چاہتا تھا تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کر سکوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ شیرینی ثابت ہوگی۔ اس نے تو مار مار کر میرا علیہ بگاڑ دیا ہے۔“

”علیہ تو تمہارا ہم بگاڑیں گے۔“ سب انکسٹر نے کہا اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ ثایاب جب واپس آئی تو پرانی حویلی کی طرف جانے والے راستے کے قریب ملک سکندر کی گاڑی دیکھ کر چمک گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی۔ ملک سکندر اور دو آدمی گاڑی کے قریب کھڑے تھے۔ ثایاب نے ان سے مختصر سی بات کی اور گاڑی کو حویلی کی طرف موڑ دیا۔ سکندر کی گاڑی بھی اس کے پیچھے ہی آ رہی تھی۔

چند منٹ بعد وہ حویلی میں پہنچ گئے۔

”کیا ہوا؟ کون تھا وہ آدمی؟“ ملک سکندر نے ثایاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا نام گھڑار ہے اور وہ چار آدمیوں کے قتل کے الزام میں طویل عرصہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔“ ثایاب نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے بتاتے گئی۔

”تم بھی بہت خفیہ لڑی ہو۔“ سکندر نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”سعادت نے اپنے باپ کو زندہ نہیں چھوڑا۔ اب جبکہ اسے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ چودھری امانت علی کی وصیت تم تمام زمینوں اور جائیداد کی مالک بن گئی ہو تو اس کے بیٹے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہر حربہ استعمال کرے گا۔ تمہیں جتنا زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، تم اتنی ہی لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی

ملکہ نے بتائی تھیں۔“

”وہ۔“ روہی نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ یہ نیفکس بھی تم تھے خانے ہی سے لے کر آئی تھیں۔“ اس نے ٹایپ کے گچے میں نیفکس کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ ٹایپ مسکرائی۔ ”میں نے وہاں سے چند ہیرے بھی اٹھالے تھے تاکہ انہیں فروخت کر کے کام جاری رکھا جائے۔ ہم خزانہ ایک دم وہاں سے نہیں نکال سکتے۔ ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی چیز نکال لی جائے گی تاکہ اسے فروخت کر کے کام چلائے رہیں۔“

”میں نے سنا ہے تم نے کہا تھا کہ چودھری فیملی کی جائیداد سے اپنا حصہ وصول کر کے تم وہ زمینیں غریب کسانوں میں بانٹ دو گی؟“ روہی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اب جبکہ ساری جائیداد اور ساری زمینیں تمہیں مل چکی ہیں تو اب جہمارا کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ تو وہی ہے جو پہلے تھا۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔ ”لیکن پہلے سعادت والا مسئلہ حل ہو جائے۔ جب تک وہ آزاد ہے، ایسا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ جس روز وہ قانون کی گرفت میں آگیا، میں اسی روز اپنے پروگرام پر عمل شروع کر دوں گی۔“

”خدا تمہیں اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے۔“ روہی نے کہا۔

وہ ہنسے خاموش رہیں، پھر ان کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

○ (لاست۔۔۔ اسی سو ڈ)

چودھری سعادت شاید پاگل ہی ہو گیا تھا۔

جب سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ چودھری امتانت علی کا بیٹا نہیں ہے، اس کے سینے میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ امتانت علی نے اسے اولاد کی طرح پالا ہے اور دوسرے بچوں کی طرح اسے عزیز رکھتا ہے لیکن تجالے اس کے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ وہ سوتیلا ہے اور امتانت علی کی موت کے بعد جب جائیداد کا مسئلہ آئے گا تو اسے دودھ میں سے کھٹی کی طرح نکال کر پیسنگ دیا جائے گا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے شروع ہی سے سازشوں کا جال بچھنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ان دنوں حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو چودھری امتانت نے حویلی میں گاؤں کی ایک لڑکی کی عزت لوٹ کر اسے قتل کر دیا

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ روہی بولی۔ ”لیکن سترے سانپ کا اس پر اسرار بوڑھے سے کیا تعلق؟“

”وہی اس کا دوسرا روپ تھا۔“ ٹایپ نے جواب دیا۔ ”وہ سنری سانپ بے پناہ پر اسرار قوتوں کا مالک تھا لیکن کچھ عرصہ سے اس کی یہ قوتیں حیرت انگیز طور پر سلب ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا ایک قدیم دشمن اس کے درپے ہے اور اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ دشمن دراصل ایک بندر ہے جس نے صدیوں پہلے ہونان بن کر رائی شہا کو دھوکا دیا تھا۔ وہی بندر رائی کی موت اور ریاست کی تباہی کا باعث بنا تھا۔ وہ بندر دراصل شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ اس زمانے میں ایک سنری ناگن ہوا کرتی تھی جو رائی شہا اور اس کے خزانے کی محافظ تھی۔ اس بندر اور ناگن میں آج تک ٹھنی ہوئی ہے۔ وہ بندر آج بھی زندہ ہے اور چاہتا ہے کہ رائی شہا کا خزانہ شیطان صفت لوگوں کے ہاتھ آجائے تاکہ وہ اس سے شیطانت کو فروغ دے سکیں لیکن سنری ناگن اس خزانے کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس نے اپنی ہی نسل کے ایک سنری ناگ کو بہت سی قوتیں دی تھیں مگر اس شیطانی بندر کی شیطانی قوتیں رفتہ رفتہ غالب آتی گئیں اور وہ پچھرا سنری ناگ مارا گیا۔ شیطانی قوتوں کا مالک وہ بندر اب چودھری سعادت کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اس نے بھی اپنے ہرکارے چھوڑ رکھے ہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک رات جب ہم گاؤں سے واپس آئے تھے تو ہاشم نے بتایا تھا کہ شام سے اس کے پاس ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا جو ہماری گاڑی کو آتے دیکھ کر غائب ہو گیا تھا۔ وہ بوڑھا دراصل اسی شیطانی بندر کا ہرکارہ تھا جو کسی موقع کی تلاش میں یہاں آیا تھا لیکن کسی وجہ سے ڈر کر بھاگ گیا۔ بہر حال اس سنری ناگ کی موت کے بعد میرے گرد حفاظت کا جو حصار تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے آج رات کوئی پر اسرار بوڑھا میری مدد کو نہیں آیا تھا۔ اب ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ میرا مطلب ہے اس شیطان بندر کے بارے میں اور دوسری باتیں۔“ روہی نے سوالیہ لگاؤں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جس روز گھنٹوں میں تصادم ہوا تھا اور سعادت کا ایک آدمی مارا گیا تھا، اس روز دپہر کے وقت میں اور سکندر بھائی ترہ خانے میں اترے تھے۔ یہ ساری باتیں مجھے ناگن

غصہ مزید بھڑک اٹھا اور اس نے باپ کو گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

باپ کے قتل کے بعد وصیت نامے کے انکشاف نے تو چودھری سعادت کا دماغ ہی پلٹ دیا تھا۔ نایاب اب قانونی طور پر بھی ساری جائیداد کی وارث بن چکی تھی اور سعادت نے ملے کر لیا تھا کہ نایاب کو وہ کسی صورت میں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس شام اس نے گھڑا کو پرانی جیپ کی گھرائی کے لیے بیٹھا تھا تاکہ صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد حویلی پر حملہ کر دے لیکن باغی میں چار آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے والا گھڑا ایسا احمق اور بزدل ثابت ہوا کہ نایاب بھی لڑکی سے مار کھا گیا اور پولیس کے قہقہے میں بچھڑ گیا۔

چودھری سعادت نے سرحد پار کے نامور ڈاکو ہیر سنگھ سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلے تو ہیر سنگھ نے حامی بھر لی تھی لیکن بعد میں جب ہیر سنگھ نے صورتحال کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہو گیا کہ سعادت کی مدد کر کے اسے کچھ نہیں ملے گا، اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔

سعادت کے ساتھ صرف تین چار آدمی رہ گئے تھے۔ اسے کھنڈروں میں خزانے کی بجائے مل گئی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر کھنڈروں میں پہنچ گیا اور چوری چھپے خزانے کی تلاش شروع کر دی لیکن گاؤں والوں کو پتہ چل گیا اور تصادم میں اس کا ایک آدمی مارا گیا۔ سعادت کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔

سعادت کو یقین تھا کہ نایاب کو خزانے کا راستہ معلوم ہے اور جب اس نے نایاب کے گھر میں ایک بست چینی ہیکس کی کمانی سنی تو اسے یہ بھی یقین کر لیتا پڑا کہ یہ ہیکس اس خزانے سے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ پہلے نایاب کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس نے نایاب کو اغوا کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اس سے خزانے کا راستہ معلوم کیا جاسکے۔

چودھری سعادت گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے قریب و غور میں ہی دو تین ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ کبھی وہ ایک ٹھکانے پر ہوتا اور کبھی دوسرے پر۔ اس کے ساتھ صرف تین آدمی تھے۔ ایک چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا اور باقی دو نایاب کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے تھے۔

اس روز اسے اطلاع ملی کہ نایاب آگے روز چودھری فرمان کے گاؤں جانے والی ہے۔

تھا اور اس لڑکی کی روح حویلی میں بیٹھ رہی تھی۔ سعادت نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا۔ پہلے ایک بھائی کو گھبراہٹ کر ہلاک کر دیا، پھر دوسرے کو سسہ اس طرح یہ مشورہ ہو گیا کہ اس لڑکی کی روح اپنا انتقام لے رہی ہے۔ چودھری امانت علی حویلی چھوڑ کر گاؤں منتقل ہو گیا۔

سرفراز اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں شرمش تھا۔ اس نے نایاب سے شادی کر لی۔ سعادت پہلے ہی سرفراز کے خلاف باپ کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اس کی شادی کے بعد اسے مزید موقع مل گیا اور اس نے باپ کو اس حد تک بھڑکا دیا کہ اس نے سرفراز کو ناظرین قرار دے کر اپنی جائیداد سے عاقق کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ایک روز موقع پا کر سعادت نے سرفراز کو قتل کر دیا کیونکہ اسے شبہ ہو گیا تھا کہ باپ سرفراز کو معاف کر کے گھر سے لگا لے گا۔ سرفراز کے قتل کے بعد نایاب نے جائیداد میں سے حصے کا مطالبہ کیا تو سعادت نے اس باپ کے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت پیدا کر دی کہ وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ سعادت ایسی کارروائیاں کرتا رہا کہ ان میں نفرت بڑھتی رہی لیکن دوسری طرف وہ خود بھی لوگوں کی نظروں میں آگیا۔ اس کے برعکس نایاب لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتی گئی۔

سعادت کا خیال تھا کہ امانت علی نایاب کو اپنی جائیداد میں سے ایک پھولی کوڑی بھی نہیں دے گا لیکن صورتحال پھر اچانک ہی تبدیل ہو گئی۔ چودھری امانت اور چودھرائی نے ملک صلاح الدین کے گھر جا کر جائیداد کے سارے کاغذات نایاب کی گود میں ڈال دیئے۔ سعادت پاگل ہو گیا۔ اس نے باپ کو بھی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کو جائیداد کا وارث قرار دیا جائے گا اور دولت ہاتھ آنے کے بعد وہ اپنے خلاف سارے کبیر ختم کروا دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ دولت سے سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بہت سی ایسی غلطیاں کر چکا تھا جن کا ازالہ دولت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے باپ کو قتل کرنے کا ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ اس پر الزام نہ آئے اور نایاب کو اس کے قتل میں پھنسا دیا جائے۔

اس روز وہ دراصل نایاب کو قتل کرنے کے لیے پرانی حویلی پہنچا تھا۔ نایاب تو نہیں ملی البتہ اپنے باپ کو وہاں دیکھ کر اس کے سینے میں جگ بھڑک اٹھی۔ تلخ کلامی سے اس کا

اچھا خاصہ اندر اچھیل چکا تھا۔ گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ وہ لوگ کھنڈروں والے نیلے کے قریب پہنچے تو سکندر کو گاڑی روک لینی پڑی۔ وہ چارادی تھے۔ انہوں نے رات نہ روک رکھا تھا۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں اونٹنیک رائلٹس تھیں۔ ہیڈلیمپس کی روشنی ان کے پیروں بھی صاف نظر آرہے تھے۔ اس میں ایک چوہدری سعادت تھا۔ دوسرا لولسی اور سکندر کے لئے اچھی تھے۔ سعادت نے فائرنگ کر کے گاڑی کے اگلے دونوں ٹائروں کے پرچے اڑا دیے اور ان سب کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ وہ چاروں نیچے اتر آئے۔ رابعہ اور روبی تو بیچ پڑی تھیں۔ ٹایاب کا پیرو بھی خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ سکندر بھی خوفزدہ تھا۔ سعادت جیسے جنونی نے کوئی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ سعادت اور اس کے ساتھیوں نے انہیں رائفلوں کی زد میں لے لیا تھا۔

”نیلے پر چلو۔“ کھنڈروں کی طرف۔“ سعادت نے غراتے ہوئے حکم دیا۔ وہ نیلے پر آ گئے۔ سعادت نے انہیں کھنڈروں میں ایک جگہ روک لیا۔

”زینٹین اور دوسری جائیداد تو میرے ہاتھ سے نکل گئی۔“ وہ ٹایاب اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ان کھنڈروں کے نیچے چھپا ہوا خزانہ میں حاصل کروں گا۔ مجھے معلوم ہے تم خزانے کا راستہ جانتی ہو۔ تمہارے گلے میں پڑا ہوا منگلس کا کبوت ہے۔ اس تم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ خزانے کا راستہ تھا دو درخت تم سب کو چھلنی کر دیا جائے گا۔“

”تم اپنے لئے دشواریاں پیدا کر رہے جا رہے ہو سعادت۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم اپنے آپ کو تانوں کے۔“

”تم تو خاموش ہی ہو ملکہ۔“ سعادت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس لڑکی سے کہو خزانے کا راستہ بتائے۔ میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد میں نہیں بولوں گا۔ میری رائفل بولے گی۔“ اس نے کتنی شروع کر دی اور جب وہ کہا تو ٹایاب بول پڑی۔

”ٹھیک ہے۔ میں مزید خزانہ نہیں چاہتی۔ میں تمہیں خزانے کا راستہ بتا دیتی ہوں۔ لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہو گا کہ جو کچھ میں اٹھا سکو، اسے لے کر یہاں سے بہت دور چلے جاؤ گے۔“

”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن اب زیادہ دیر مت کرو۔ آگے بڑھو اور راستہ بتاؤ۔“ سعادت غرایا۔

”اس طرف چلو۔“ ٹایاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”میں تمہیں اس خزانے تک لے جا رہی ہوں لیکن تم وہ خزانہ حاصل نہیں کر سکو گے۔“

”دیر کا کام ہے۔“ سعادت بولا۔ ”لیکن تم سب لوگ سن لو۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

وہ آگے آگے چلتے رہے۔ سعادت اور اس کے ساتھی رائلٹس تانے اس کے پیچھے پیچھے۔ رابعہ اور روبی کی حالت بہت خیر ہو رہی تھی۔ روبی کی تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس سے چلائی

چوہدری فرمان کی بیٹی کا رشتہ شاہ پور کے فضل دین کے بیٹے سے ہوا تھا۔ یہ وہی چوہدری فرمان تھا جس نے ٹایاب اور رابعہ کو ایمریشین کے ویران رست ہاؤس سے فرار کے بعد اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور پھر انہیں گاؤں بھی چھوڑ کر آیا تھا۔

یہ اطلاع ملتے ہی سعادت نے ٹایاب پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کی تیاری شروع کر دی۔

فضل دین کے گھر والے کسی رسم کے سلسلے میں چوہدری فرمان کے گھر آنے والے تھے۔ چوہدری فرمان نے اپنے کچھ عزیزوں کے علاوہ ملک صاحب کے گھر والوں اور ٹایاب کو بھی معو کر لیا تھا۔ سب لوگ دوپہر ہی کو فضل دین کے گھر والوں سے پہلے چوہدری فرمان کے گاؤں پہنچ گئے۔ شام تک وہاں بڑی رونق رہی۔ سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے فضل دین اور اس کے گھر والے دھت ہو گئے اور پھر سورج غروب ہونے سے چندہ میں منٹ پہلے بے لوگ بھی اپنے گاؤں کے لئے چل پڑے۔

ایک گاڑی میں سکندر، سیکرٹری، منس اور عذر اٹھیں۔ دوسری گاڑی میں ٹایاب کے ساتھ نیچہ، رابعہ اور روبی تھیں۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹایاب کی گاڑی جھٹکے کھا کر ڈک گئی۔ سکندر کو بھی اپنی گاڑی روکنی پڑی۔ وہ نیچے اتر کر ٹایاب کی گاڑی چیک کرنے لگا۔ لیکن فوری طور پر پتہ نہیں چلا سکا کہ اس میں کیا خرابی ہوئی تھی۔

”تفصیلاً تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“ سکندر نے کہا پھر نیچہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”نیچہ تم ایسا کرو میری گاڑی لے جاؤ۔ میں یہ گاڑی ٹھیک کر کے ان لوگوں کے ساتھ آتا ہوں۔“

نیچہ سکندر کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور انجن اشارت کر کے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

سکندر ٹایاب کی گاڑی کا بازو کھولے انجن چیک کر رہا تھا۔

شام کا اندیرا اچھیل چکا تھا۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ”بیڑی چیک کی تم نے؟“

سکندر نے قریب کھڑی ہوئی ٹایاب سے پوچھا۔

”نہیں۔“ ٹایاب نے ٹیٹھی میں سر ہلا دیا۔

”بھٹو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ سکندر بولا۔

اور پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کچھ راستے پر گاڑی کو جھٹکے گئے سے بیڑی کا ایک کلپ نکل گیا تھا جس کی وجہ سے انجن کو رکنٹ نہیں مل رہا تھا۔ سکندر نے کلپ نائٹ کر دیا اور بازو بند کر کے انجینرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا۔ ٹایاب بیٹریز زینٹ پر بیٹھ گئی اور سکندر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔

ایک جگہ خرخر کی آواز سن کر وہ لوگ رگ گئے اور آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ وہ بہت بڑے قد و قامت کا بند تھا جس سے درجنوں سانپ لپٹے ہوئے تھے اور بندر اچھل اچھل کر منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔

گڑگڑاہٹ کی آواز ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی۔ چمت کا ایک اور حصہ گر گیا تھا۔ سعادت وغیرہ بھی اب چیخے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ لیکن انہیں چاروں طرف سے زہریلے سانپوں نے گھیر لیا تھا۔ اپنے قریب ہی چمت کے ایک حصے کو گرتے دیکھ کر سکندر اور تابا وغیرہ نے بھر دھڑکاؤ لگای۔ وہ بندر بری طرح چیختا ہوا اچھل رہا تھا۔ اس پر لپٹنے والے سانپوں کی تعداد اب بڑھ رہی تھی۔ سکندر اور تابا وغیرہ ایک بار پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ تہہ خانے کے دانے پر ایک لمحہ کو رک کر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چمت کا ایک اور حصہ گر گیا تھا اور پیچھے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔

سکندر نے رولی، رابندر اور تابا کو اوپر چڑھنے میں مدد دی، پھر خود باہر آ گیا۔ گڑگڑاہٹ کی آوازیں تیز ہو گئیں تھیں اور پورا ٹیلا اس طرح ہل رہا تھا کہ قدم بھنا مشکل ہو گیا تھا۔ کھنڈرات کی جود یواریں کھڑی تھیں وہ بھی گر رہی تھیں۔

دفعۃً سکندر نے محسوس کیا کہ ٹیلا زمین میں گھسنے لگا ہے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز کچھ اور شدید ہو گئی تھی۔ ”بھاگو.....“ وہ چیخا۔ ”یہ ٹیلا زمین میں گھسنے لگا ہے۔“ وہ کھنڈروں سے نکل کر ڈھلان پر بھاگنے لگے۔ رابندر وغیرہ کی عمر تیز گری تھیں۔ سکندر ہی انہیں بار بار سہارا دے رہا تھا۔

وہ لوگ ٹیلے سے اتر کر کیتوں اور ٹیلے کے درمیان والے راستے پر پہنچ گئے۔ ان کی کار کاٹنی پیچھے کھڑی تھی۔ لیکن وہ کار کی طرف جانے کی بجائے گاؤں کی طرف دوڑتے رہے۔

اور پھر دفعۃً سکندر نے محسوس کیا کہ ان کے پیروں کے نیچے زمین پر سکون تھی۔ وہ رک گئے۔ زمین واقعی پر سکون تھی۔ لیکن گڑگڑاہٹ کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں اور ٹیلا بدستور زمین میں دھنسا جا رہا تھا۔ وہ پھر گاؤں کی طرف دوڑنے لگے۔ گڑگڑاہٹ کی آوازیں زور تک گونج رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے مہیب بادل گرج رہے ہوں۔ گاؤں والوں نے بھی یہی آوازیں سنی تھیں اور درجنوں لوگ صورت حال معلوم کرنے کے لئے گاؤں سے باہر آ گئے تھے۔

وہ سب لوگ نہر کے پاس جمع تھے۔ سکندر وغیرہ ان کے قریب رک گئے اور جیج جیج کر لوگوں کو بتانے لگے کہ کھنڈروں اور ٹیلا زمین میں گھسنے لگا ہے۔ گاؤں کے لوگ وہاں کھڑے گڑگڑاہٹ کی آوازیں سنتے رہے۔ صبح کی روشنی طلوع ہوئی تو ٹیلا عام زمین کی سطح سے چنٹھ ہی اوپر رہ گیا تھا۔ صبح سویرے ہی شاہ پور میں پولیس کو بھی اطلاع دے دی گئی۔ درجنوں پولیس والے پہنچ گئے تھے لیکن ظاہر ہے وہ ٹیلے کو زمین میں دھسنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کو آگے جانے سے روکا ہوا تھا۔

نہیں جا رہا تھا۔ سعادت کا ایک ساتھی اسے بار بار دھکے دے رہا تھا۔

وہ اس جگہ رک گئے جہاں تہہ خانے کا راستہ تھا۔ تابا کے اشارے پر سعادت کے دو آدمیوں نے شکستہ اینٹوں کا ڈھیر بنا کر سہارا بنادیا۔ سعادت نے راضی سے پہلے انہیں اندر اتارنے کا اشارہ کیا پھر وہ اور اس کے ساتھ ان کے پیچھے خود بھی تہہ خانے میں اتر گئے۔

انہوں نے شاید پہلے ہی سے سارا انتظام کر رکھا تھا۔ سعادت نے جب سے تہہ خانے میں اتر کر روشنی کی تابا اور سکندر وغیرہ تہہ خانے کی روشنی میں آگے آئے چلنے رہے اور بالآخر ایک جگہ پر رک گئے۔ چوہدری سعادت تہہ خانے کی روشنی اور اصرار ڈال رہا تھا اور پھر تہہ خانہ کھانگی اس طرح روشن ہو گیا جیسے وہاں بہت سی رنگ برنگ روشنیانی بل بھی ہوں۔ تہہ خانے کی روشنی میں چہترے پر ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے ہیرے جھنگا رہے تھے۔

سعادت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور راضی کی تابا کی طرف کرتے ہوئے چیخا۔

”تمہاری وجہ سے مجھے ساتھیوں اور جائیداد سے محروم ہونا پڑا۔ مجھے ہاتھ خون میں رنگنے پڑے۔ میں قانون کا مجرم بن گیا۔ لیکن اب مجھے تہہ خانوں کا یہ خزانہ مل گیا ہے۔ اس سے میں پورا ملک خرید سکتا ہوں۔ میرا کوئی چمٹ نہیں بچاؤ سکتا۔ میں سب کو خرید لوں گا۔ لیکن تمہیں..... کلمت سب کو مرنا ہوگا۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تم لوگ۔“

سعادت کے ساتھیوں نے بھی ان پر ہاتھیں تان لیں۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سے سانپ بیک وقت پھسکا رہے ہوں۔ سعادت اور اس کے ساتھیوں نے مڑ کر دیکھا۔ سینکڑوں سانپ پھسکارتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے بیک وقت فائر کھول دیا۔ سانپ گولیوں سے پھنچتی ہوئے گئے لیکن تھو پھسکاؤں میں کسی کی آواز نہ سنائی کی تعداد میں لگتا تھا جیسے دیواریں سانپ اگل رہی ہوں۔ چمت سے بھی سانپ ٹپک رہے تھے۔

اور پھر دفعۃً تہہ خانے میں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور ان کے پیروں کے نیچے زمین کا پٹنہ لگی۔ دیواریں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے انہیں گرجا نہیں گی۔

”تابا بھاگ جاؤ۔ جلدی کرو..... یہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔“ ایک نسوانی سرگوش تابا کی ساعت سے نکلتی۔ یہ ناگن کلکی کی آواز تھی۔ تابا نے سکندر کو اشارہ کیا اور رابندر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑا دیا۔ سکندر نے رولی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

سعادت اور اس کے ساتھی چاروں طرف سے حملہ آور ہونے والے سانپوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ تابا وغیرہ اس طرح دوڑتی رہیں جیسے انہیں تباہی میں سب کچھ نظر آ رہا ہو۔ گڑگڑاہٹ کی آوازیں ایک دم شدت آگئی تھیں۔ سکندر نے مڑ کر دیکھا۔ خزانے کا چہترہ زمین میں گھسنے لگا تھا اور اوپر سے چمت ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھی۔

تین دن میں وہ اونچا نیلہ کھنڈرات سمیت صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا تھا اور وہاں ایک وسیع و عریض جھیل معرض وجود میں آ چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بدی کی قوتیں زمین کی گہرائیوں میں دفن گئی تھیں۔ آس پاس کے علاقوں اور شہروں سے ہزاروں لوگ اس جھیل کو دیکھنے آرہے تھے جہاں کبھی ٹیلا ہوا کرتا تھا۔

ایک ہفتہ تک تو نایاب وغیرہ بھی اپنے حواس پر قابو نہیں پاسکی تھیں۔ نایاب کئی روز تک صورت حال پر غور کرتی رہی اور پھر اُس کا ذہن بتدریج پُر سکون ہوتا چلا گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ نایاب پھر پرانی حویلی میں منتقل ہو چکی تھی اور اپنی ساس چوہدرانی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ نایاب اس خزانے سے محروم ہو گئی تھی۔ اس نے اور سکندر نے جو فلاجی منصوبے بنائے تھے وہ دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ لیکن چوہدری فیلی کی زمینیں اب بھی اس کے اختیار میں تھیں۔

اور پھر گاؤں والوں کے لئے وہ دن بہت ہی خوشی کا تھا جب چوہدرانی پرانی حویلی میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ حویلی کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں گاؤں کے سینکڑوں لوگ جمع تھے اور چوہدرانی اپنے ہاتھوں سے اپنے مزارعین میں زمینوں کی ملکیت کے کاغذات تقسیم کر رہی تھی۔ علاقے کا ڈپٹی کمشنر اور دیگر حکام بھی موجود تھے۔

چوہدرانی نے اپنے لئے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ یہ سب کچھ نایاب کے ایما پر ہوا تھا۔ نایاب نے غریب کسانوں سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ لوگ ہاتھ اٹھا کر نایاب کو دُعا میں دے رہے تھے۔ یہ جشن کئی روز تک جاری رہا۔ نایاب کے والد بھی گاؤں آئے ہوئے تھے۔ لیکن نایاب نے واپس شہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہیرے اور نیکلس اب بھی نایاب کے پاس تھے اور نایاب انہیں بچ کر یہاں ایک اسکول اور کالج بنانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اسکول اور کالج کے لئے زمین ملک سکندر کے والد ملک صلاح الدین نے تحفہ کے طور پر دے دی۔

ہیرے فروخت ہونے میں چند روز لگ گئے۔ اور پھر پیسہ ملتے ہی اس منصوبے پر کام شروع ہو گیا۔ گاؤں کی عورتیں اور مرد رضا کارانہ طور پر بڑے جوش و خروش سے دن رات کام کر رہے تھے۔ نایاب بہت خوش تھی۔ کم از کم اس علاقے کے لوگوں کو زمینداؤں کے ظلم سے نجات مل گئی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اسکول اور کالج بننے کے بعد جب اس علاقے میں علم کی روشنی پھیلے گی تو کوئی زمیندار کسی غریب کسان پر ظلم نہیں کر سکے گا۔

(ختم شد)